کلامِ اقبال کے پشتو تراجم

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو

مقالہ نگار :۔

زیت الرحمٰن

پشاور پبلک سکول / کالج پشاور

نگران :۔

ڈاکٹر صابر حسین کلوروی

صدر شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی

شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی

سنہ 2002ء

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

(صفحہ نمبر)

---مخفّفات---

اس مقالے میں ماخذ کا حوالہ دیتے وقت درج ذیل مخففات استعمال کئے گئے ہیں

۱۔	آثرؔ	:	قاضی عبدالحلیم اثر افغانی
۲۔	اسیرؔ	:	عبداللہ جان اسیر
۳۔	حمزہؔ	:	امیر حمزہ خان شنواری
۴۔	راحتؔ	:	سیّد راحت اللہ زاخیلی
۵۔	سمندرؔ	:	سمندر خان سمندرؔ
۶۔	سیّد صاحب	:	سیّد محمد تقویم الحق کاکاخیل
۷۔	کاکاخیل	:	سیّد محمد تقویم الحق کاکاخیل
۸۔	مولانا	:	مولانا عبدالقادر
۹۔	مولوی صاحب	:	مولوی صاحب گل
۱۰۔	مینوشؔ	:	شیر محمد مینوش

---دیباچہ---

علامہ محمد اقبال بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔آپ اپنے سینے میں ایک جمال پرست اور عشق پرور دل رکھتے تھے اور آپ نے صداقت پسند اور نظم آفریں روح پائی تھی۔ انفرادی واجتماعی زندگی میں نظم وضبط کے شیدائی اور بلند پایہ شاعر اور حکیم نکتہ داں تھے۔آپ کا کلام درد و سوز، رندی و مستی،، نصائح و مواعظ اور دین و تمدن کی تعلیم کا ترجمان ہے۔ عقل و دل کی کشمکش ہو یا حسن کی کرشمہ سازیاں، حقیقت و مجاز کی بے نقابی ہو یا انسانی جذبات کی پُر کیف عکاسی یا تقدیر کے رازہائے سربستہ کا انکشاف، سبھی کا بیان والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔ شارح و مفسر قرآن و حدیث، رازِ درونِ حیات و کائنات اور اتحاد عالم اسلامی کے علمبردار ہونے کے علاوہ مفکرِ انسانیت اور شاعر اسلام تھے۔

علامہ عالم فطرت اور عالم انسانی میں خالص توانائی کے قدردان ہیں۔ ان کی محفل میں لینن اور مسولینی، نطشے اور ٹالسٹائے، برگساں اور کارل مارکس، مصطفیٰ کمال اور جمال الدین افغانی پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ اس ظاہری تضاد کی تہ میں لطیف ہم آہنگی موجود ہے۔وہ اپنے جذبے کی ہم آہنگی چاہتے ہیں نہ کہ منطق کی۔وہ جذبے کے ذریعے حقیقت پر قابو پاتے ہیں،اس لیے کہ اس کے نزدیک خود حقیقت کی روح جذبے میں مضمر ہے۔ان کے افکار و خیالات میں جو ثروت پائی جاتی ہے اس کی مثال شعر و ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ان کی بلند اقبالی کا دائرہ صرف پاکستان یا مسلمانوں تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمی سطح پر بھی انھوں نے دانشوروں کو متاثر کیا۔ چنانچہ اقبال وہ واحد شخصیت ہیں جن پر مختلف زبانوں کی کتب رسائل اور اخبارت میں سب سے زیادہ لکھا گیا۔

اقبال کی زندگی ہی میں مشاہیر اور اہل قلم و علم نے ان پر لکھنا شروع کیا تھا۔ان کی زندگی میں ان کا یوم منایا گیا اور لوگوں نے بے مثال خراجِ تحسین پیش کیا۔ قائداعظم نے بھی ان کی خدمات کے اعتراف میں مختلف مواقع پر شاندار الفاظ میں آپ کا تذکرہ فرمایا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس قسم کی کوششیں اور بھی تیز ہوگئیں۔ان کی تصانیف کا سترہ (۱۷) بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ پاکستان کی مقامی زبانوں نے بھی اس میں اہم کردار ادا کیا۔ ان تراجم میں پشتو زبان و ادب نے اقبالیات کی لڑی میں وہ بیش قیمت دُر تاباں پروئے جن کی تابانی کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

افغان یا پشتون صوبہ سرحد اور افغانستان کے علاوہ بر عظیم کے طول و عرض میں رہنے والی قوم ہے۔ان کی تہذیب و تمدن اور ثقافت اسلامی احیا کی پاسدار ہے۔اسلام سے گہری وابستگی رکھنے کے ساتھ اس کی تمام تر تاریخ اسلامی ہے اور اس نے مسلم سلطنتوں کی تخلیق و تشکیل میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ علامہ اقبال اس قوم کے جذبۂ حریت، دینی عقائد اور اسلامی اتحاد کے عزائم سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے افغان ملت اور اس کے مشاہیر سے مسلسل محبت و دلچسپی کا اظہار کیا۔وہ جانتے تھے کہ ان کی ذات خودی،

عمل اور جذبہ ایثار کا نمونہ ہے اور انکی تاریخ علاؤ الدین خلجی، شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، امیر عبدالرحمن، سید جمال الدین افغانی، خوشحال خان خٹک، نادر شاہ اور امیر امان اللہ جیسی ہستیوں کی امین ہے۔ اس لیے ملتِ افغان کو پیکرِ ایشیا کا دل کہہ کر نا قابلِ تردید حقیقت کا اظہار کیا۔

کلام اقبال میں افغانوں کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ ایک فرضی نام "محراب گل افغان" کے افکار سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو پشتونوں سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس نظم میں پشتونوں کو ان کے مشاہیر کے توسط سے نہ صرف پیغام دیا ہے بلکہ حیاتِ ملی کے اسرار و رموز بھی بتائے گئے ہیں اور ان سے بہت سی امیدیں بھی وابستہ کی ہیں۔ "مثنوی مسافر" افغان ملت سے عقیدت کا کھلا اظہار ہے۔ علامہ نے بال جبریل کی "نادر شاہ افغان" خوشحال خان خٹک کی وصیت "ارمغانِ حجاز کی "مسعودِ حرم" پیام مشرق کی "پیش کش" ، جاوید نامہ کا حصہ "فلک عطارد" اور "حرکت بہ کاخ سلاطین مشرق" جیسی منظومات لکھ کر پشتونوں سے دلی لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔

اقبال کے تعلقات پشتونوں سے رہے اور پشتونوں نے ان سے ملاقاتیں بھی کیں، اس کے ساتھ خط کتابت بھی رہی ہے۔ ان میں امیر امان اللہ خان، نادر شاہ، کوہاٹ کے رسالدار سجید گل، عبدالرحمن پشاوری، خان عبدالغفار خان، مولانا عبدالقادر اور فضلِ حق شیدا کے نام سر فہرست ہیں۔ علامہ اقبال نے مرد مومن کا جو تصور پیش کیا، پشتونوں کے اصول" پښتو" (پشتو) میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔ پشتون انہی صفات سے کم وبیش متصف ہیں۔ پشتون میں پت (دوستی)، ښېگړه (دوسروں کے ساتھ بھلائی)، توره (جرأت و بہادری) و فااور ننگ (غیرت وانا) جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔

اقبال کا پیغام اسلام کا پیغام ہے جسے عام کرنے کے لیے پشتونوں نے عملی کردار ادا کیا۔ پشتو پاکستان کی علاقائی زبانوں میں وہ واحد زبان ہے جس نے ادب کی دنیا میں سب سے پہلے علامہ کو متعارف کرایا اور گلہائے عقیدت کھلائے۔ مختلف کتب اور مضامین کے علاوہ تراجم کا کام اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہوا تھا۔ تصانیف اقبال کے تراجم کے علاوہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کا پشتو ترجمہ بھی کیا گیا ہے، لیکن سب سے اہم کام کلام اقبال کے منظوم تراجم ہیں جو علامہ اقبال کے ساتھ پشتونوں کی محبت کا بین ثبوت ہیں۔

مترجمین کا تعلق زیادہ تران شعراُ سے ہے جو اپنے زمانے کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ معروف ادبا و ناقدین بھی تھے۔ اقبال کو پشتو شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ اپنے ایک خط محررہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۹ء بنام نیاز الدین خان میں رقمطراز ہیں۔

"افسوس ہے کہ مجھے پشتو نہیں آتی ورنہ میں سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہناتا"(۱)

اقبال اگرچہ سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہنانے سے قاصر رہے تاہم پشتون شعرا نے اقبال کے افکار و تصورات پر عمل کر کے نہ صرف قبول کیا بلکہ ان کی اردو اور فارسی شاعری کو پشتو کا منظوم جامہ پہنایا۔ پشتو اکیڈمی پشاور اور اقبال اکیڈمی کی مشترکہ کاوشوں سے اسرار و رموز کے علاوہ باقی تمام کلام کے تراجم منظوم صورت میں وجود میں آئے۔ اسرار خودی اور رموزِ بے خودی کے ترجمے سمندر خان سمندر ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۴ء میں کر چکے تھے۔

---

(۱) مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۸

اس کارہائے نمایاں کو انجام دینے کا سہرا مولانا عبدالقادر کے سر ہے جو پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کے بانی وڈائریکٹر تھے۔ اس وقت اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رفیع الدین تھے۔ دونوں اقبال شناس تھے۔ دونوں چاہتے تھے کہ پشتون اقبال کی شاعری سے مستفید ہو جائیں۔ کیونکہ علامہ نے اکثر اصطلاحات ،الفاظ اور تصورات جو استعمال کئے ہیں پشتون کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً شاہین ،باز، شکرے، عقاب ،بلند نظر ،یقین محکم ،صاف رزق ،پاکباز طبیعت ،بیباکی، خود اعتمادی، کسی سے طمع نہ رکھنا اور پھر کوہ وکمر وغیرہ تصورات افغانی حیات سے متعلق ہیں۔ یہی الفاظ و تصورات پشتو کے معروف شاعر خوشحال خان اور دوسرے قدیم شعرا کے کلام میں بھی نمایاں ہیں۔ جب پشتون ان کو علامہ کے کلام میں دیکھتے ہیں تو وہ اُن کے شیدائی بن جاتے ہیں۔

میجر راورٹی نے خوشحال خان خٹک کے ۹۸ منظومات کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تھا جسے پڑھ کر علامہ اقبال پشتو شاعری سے بہت متاثر ہوئے اور افسوس کیا کہ اگر انہیں پشتو آتی تو سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہناتے۔ علامہ پشتونوں کو ان کے مثالی کردار کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے لیکن ان کے باہمی انتشار سے نالاں تھے اسلیے انہیں نصیحت کی۔

ع قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم

علامہ اقبال نے پشتونوں کے کردار و عمل کا قریب سے مشاہدہ کیا کیونکہ اکثر پشتونوں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ پھر خوشحال خان خٹک اور علامہ اقبال میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ علامہ دینِ فطرت کی نگہبانی کا اہل پشتون ہی کو دیکھتے تھے۔ جب پشاور میں پشتو اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے ڈائریکٹر چاہتے تھے کہ علامہ اقبال نے پشتونوں کے ساتھ جس عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے اس کا صلہ اسی صورت میں دیا جاسکتا ہے کہ ان کی آفاقی شاعری کو منظوم پشتو میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ مولانا کی تگ ودو کے نتیجے میں اقبال اکیڈیمی نے مالی امداد فراہم کرتے ہوئے پشتو اکیڈیمی کے توسط سے بال جبریل ۶۷ء، بانگِ درا ۶۳ء، پیام مشرق ۶۳ء، ارمغانِ حجاز ۶۴ء، جاوید نامہ ۶۷ء، ضرب کلیم ۶۷ء زبور عجم ۶۱ء اور مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد ۶۹ء کے تراجم کرائے۔ اس لحاظ سے اقبال اکادمی کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔

خودی اقبال کے پیغام کا خلاصہ اور مرکز ہے۔ یہی خودی بالخصوص پشتون کے حیاتِ ملی کی عکاسی کرتی ہے۔ علامہ کے اکثر تصورات پشتونوں کی زندگی سے عبارت ہیں جو انسانیت کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بعض پشتون شعرا نے علامہ کی زندگی میں ان کی بعض منظومات کا ترجمہ کیا اور ان سے بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔ اقبال اور پشتون انسانیت کی آفاقی اقدار میں آپس میں مشترک ہیں اور اس نسبت سے انہیں علامہ کے گراں بہا افکار اُن کی زبان میں سمجھانا ضروری تھا تاکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے آگاہ ہو کر بنی نوع انسان کی خدمت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ علامہ مفسر و شارح اسلام اور دین مبین کے مبلغ تھے۔ پشتون جو زمانۂ قدیم سے اسلام کے شیدائی چلے آرہے ہیں انہیں اسلام کی حقانیت ان کی سادہ اور عام فہم زبان میں سمجھانا اور دانائے راز اور ترجمانِ حقیقت کے فلسفۂ اسلام سے بخوبی آگاہ کرنا ضروری تھا اور یہی کام کلام اقبال کا ترجمہ کئے بغیر ناممکن تھا۔ شاعر مشرق نے پشتونوں اور ان کے مشاہیر سے جس عقیدت و لگاؤ کا اظہار کیا تھا اس اُنس سے ان کو انہی کی زبان میں واقف کرانا ضروری تھا تاکہ وہ اپنی زبان میں علامہ کے خیالات بھانپ جائیں۔ حکیم الامت کے فلسفے کی بنیاد و اساس اسلام پر قائم ہے اور مولانا عبدالقادر کے قول "کہ پشتون کو آپ غیر مسلم نہیں پائیں گے" کے مصداق پشتون اور اسلام لازم و ملزوم ہیں پھر شرح اسلام اور فلسفۂ اسلام کو منظوم پشتو میں پیش کرنا ان

کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ چھوٹے بڑوں سے اثر لیتے ہیں مترجمین حقیقت کے ترجمان تھے اور کلام اقبال کی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ انھوں نے الفاظ و معانی کے بحرِ بے کنار کے تلاطم خیز موجوں سے نبرد آزما ہو کر ترجمان اقبال کا شرف حاصل کیا۔ مسلمان کی زندگی علم و عمل سے عبارت ہے۔ علم ہی وہ اساس ہے جس پر انسان کی کامیابی و خوشحالی اور مغفرت کا دارومدار ہے علامہ نے انسانیت اور حیاتِ ملی کے اسرار و رموز کے لیے جو اصطلاحات وضع کیں اور ان کو جو نئے معانی عطا کیے ان سے ناواقفیت پشتونوں کے لیے اسلام سے بے خبری کے مترادف تھا اس لیے ضرور تھا کہ علامہ کی تعلیمات ان کی زبان میں پیش کی جائیں تا کہ وہ اس سے بہتر طور پر مستفید ہو سکیں۔

علامہ اقبال واحد شاعر ہیں جن کو مسلمانوں کا مستقبل روشن نظر آرہا ہے۔ انھوں نے اسلام کے عروج کے آفتاب کو مشرق سے طلوع ہوتے دیکھا۔ ملت اسلامیہ کے اس مایہ ناز شاعر نے مشرق پر احسان کر کے مغرب کے نام پیغام بھی بھیجا جو مشرق کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، لیکن پشتون اردو، فارسی زبانوں سے ناواقفیت ہونے کی بناء پر اس پیغام سے ناآشنا تھے۔ اقبال کی پسندیدہ اقوام میں افغان قوم سب سے سربلند رہی ہے لہٰذا اُن تک یہ کلام پہنچانا زیادہ ضروری تھا۔ چونکہ پشتونوں کا اخلاقی نظام پشتنئی ہے اور عقیدہ و ایمان اسلامی، اس لیے وہ علامہ کی تعلیمات کو بروئے کار لا کر اقوام کے روزگارِ حیات کے مسائل انسانی معاشرے کی سالمیت اور بقا کے خطوط پر حل کرنے کی کوشش کرے گا جس کے لیے علامہ کے کلام کا ترجمہ ناگزیر تھا۔

زیرِ نظر تحقیقی کام میں تراجم کا تاریخی ترتیب سے جائزہ لیا گیا ہے۔ حوالہ جات اور حواشی ہر صفحے پر نیچے درج کیے گئے ہیں۔ ایک ایک شعر کا اصل سے موازنہ کیا گیا ہے۔ جہاں کہیں کوئی پیچیدگی سامنے آئی، وہاں یوسف سلیم چشتی اور مولانا غلام رسول مہر یا کلیات فارسی کی سلیس اردو نثر مد نظر رکھی گئی ہے۔ راقم الحروف نے بعض اشعار کی تصحیح بھی کر دی جہاں وزن، بحر یا مصرعوں کا توازن قائم نہیں رہا۔ اگر کہیں مفہوم میں فرق ہے یا ترجمہ غلط ہے تو اُن اشعار کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور اگر ممکن ہو سکا تو ان کے درست کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ آزاد، بامحاورہ اور مثالی تراجم کے اشعار بھی نقل کر دیے گئے ہیں۔ املا کی اغلاط کو بھی صحیح کرایا گیا ہے۔ عام ترجمے کو نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ مقالے میں سارے اشعار کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مترجم اکثر مقامات پر اصل قوافی کو ترجمے میں استعمال کر کے مفہوم پر گرفت حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن غیر زبان کے الفاظ پشتو قارئین کے لیے مشکلات اور بیزاری کا سبب ہیں۔ چنانچہ انہی خامیوں کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ مترجمین نے بعض مقامات پر کسی لفظ کے سمجھنے اور معانی اخذ کرنے میں دھوکہ کھایا ہے۔ بعض اشعار کے تراجم مفقود ہیں۔ بعض مصرعے حذف کر دیے گئے ہیں۔ جہاں کوئی مصرع یا ترکیب پیچیدہ نظر آئی مترجم نے ذاتی رنگ کو غالب رکھا اور اسکی تحقیق میں وہ جان کنی نہیں دکھائی جو منزلِ مقصود ہے۔ چنانچہ ایسے ہی مقامات اور اشعار کی نشان دہی کر دی گئی۔ بعض مقامات پر اصل اشعار کے ساتھ سلیس اردو ترجمہ یا تشریح بھی دی گئی ہے تاکہ ترجمے اور اصل کا فرق اچھی طرح واضح ہو سکے۔ علامہ کے وہ اشعار جو زبان زد عام ہیں۔ ان اشعار کو بھی خاص طور پر شامل کیا گیا تاکہ عوام اگر اس میں فرق ہے تو سمجھ سکیں' اگر ترجمہ مثالی ہے تو اس کے مفہوم کو سمجھ سکیں کیونکہ عوام اکثر اس قسم کے اشعار کے مفہوم سے ناواقف ہوتے ہیں۔

ہر باب میں مترجم کا تعارف، تصنیفِ اقبال کا تعارف اور ترجمے کا تعارف دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ترجمے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک ایک شعر کی چھان پھٹک کی گئی ہے۔ پشتو ادبا و ناقدین کی آرا جو پشتو کے مختلف رسائل یا خاص اقبال نمبر میں شائع ہوئیں جو ترجمے سے متعلق تھیں، کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالقادر نے بھی ہر ترجمے کا تعارف پیش کیا ہے راقم نے اس کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ ذیل میں ابواب کی تفصیل دی گئی ہے۔

پہلا باب اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کا ہے۔ سمندر خان سمندؔر نے اس کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ وہ اقبال کے قریبی ہم عصر تھے۔ وہ پہلے پشتون شاعر تھے جنھوں نے اقبال کی وفات پر اپنی زبان میں مرثیہ لکھا اور علامہ سے اپنی بے پناہ عقیدت کا حق ادا کیا۔ یہی مرثیہ "احسان" لاہور، ۲۷ جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ یہی ترجمہ تاریخی و معیاری لحاظ سے سرفہرست ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے علامہ کے کسی مکمل تصنیف کا ترجمہ نہیں ملتا۔ تصانیفِ اقبال میں یہ دو کتابیں سب سے پہلے شائع ہوئیں اور سمندؔر نے ان کے شائع ہونے پر ترجمہ کیا۔ انھوں (سمندر) نے خود اسرارِ خودی کے ترجمے کا دیباچہ بھی تحریر کیا جس میں خودی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سلیس اور بامحاورہ ترجمہ میں غنائیت کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ ان مثنویوں کی بنیاد قرآن کریم اور مثنوی مولانا رومؒ ہے۔ رومیؒ نے فارسی زبان میں قرآن کی حکمت بیان کی ہے۔

دوسرا باب بالِ جبریل کے تراجم پر مشتمل ہے عبداللہ جان اسیؔر نے اس کا ترجمہ کر کے ۱۹۵۹ء میں شائع کرایا۔ اس ترجمے میں اگرچہ اصلی الفاظ کا استعمال بہت ہی کم ہے لیکن بحروں کو چست اور مصرعوں کو حد سے زیادہ مختصر رکھنے کی وجہ سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا، جو اصل کا طرۂ امتیاز ہے۔ قاضی عبدالحلیم اثؔر نے اسیؔر کے مذکورہ ترجمے کو سامنے رکھ کر پشتو اکیڈیمی کی زیرِ نگرانی ایک دوسرا ترجمہ کیا۔ لیکن اس ترجمے میں مفہوم پر گرفت کے ساتھ ساتھ اصل الفاظ اور قوافی کی بھرمار ہے ورنہ ترجمہ معیاری ہے۔

تیسرا باب "بانگِ درا" کا ہے۔ سید راحت اللہ زاخیلی نے اس تصنیف کا ترجمہ کر کے ۱۹۶۳ء میں شائع کرایا۔ وہ اقبال کے ہم عصر تھے اور اپنے وقت کے تعلیم یافتہ طبقے میں افغانی اقبال مشہور تھے۔ انھوں نے ترجمے کا کام اس وقت شروع کیا تھا جب اقبال پہلی بار شعر و شاعری کے میدان میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ شکوہ و جواب شکوہ کے شائع ہونے پر ان منظومات کا ترجمہ کیا اور بعد میں دوسری نظموں کا۔ ایک معیاری اور اعلیٰ ترجمے نے انہیں مترجمین میں بلند درجے پر فائز کیا ہے۔ عبدالمنان اور مولوی صاحب گل نے بھی شکوہ اور جواب شکوہ کے منظوم ترجمے کیئے ہیں جو ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے۔ یہی ترجمے پشتو اقبالیات میں تاریخی اعتبار سے اولیت رکھتے ہیں۔

چوتھا باب پیامِ مشرق اور ضربِ کلیم سے متعلق ہے۔ شیر محمد مینوش نے ان کا ترجمہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۵۸ء میں شائع کرایا۔ اس دلکش ترجمہ سے وہ اقبال کے اتنے قریب آگئے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ان کا ذکر اقبال کے ساتھ ہمیشہ کیا جائے گا۔ اگرچہ ترجمے کا عمومی رنگ شعر کی بے ساختگی اور روانی کے لطیف اثر سے خالی ہے لیکن بعض مقامات پر شاعر کا تجربہ حاوی ہو جاتا ہے اور اصل کی شیریں زبان اور رنگین پیرایۂ بیان سے ترجمہ طبع زاد دکھائی دینے لگتا ہے۔ ضربِ کلیم کا ترجمہ موسیقیت اور غنائیت کا نمونہ ہے۔ یوم اقبال کے موقع پر اس کی اکثر نظمیں ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔

پانچواں باب ارمغانِ حجاز اور جاوید نامہ کے تراجم سے متعلق ہے۔ ترجمہ امیر حمزہ شنواری نے کیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور بامحاورہ

ہے اور اصل کے اتنا قریب ہے کہ ترجمہ ہی دکھائی نہیں دیتا۔ قارئین اس میں اصل جیسی لذت پاتے ہیں۔ جب گہری نظر، بلند فکر اور طاقتور قلم تینوں ایک ہو جائیں تو ترجمے کو ایک کامیاب تجربے کی صورت دے دیتے ہیں۔ حمزہ کی شعریت، علمیت اور قدرت زبان وبیان مسلمہ ہے۔ روزمرہ اور تشبیہ واستعارہ کے برمحل استعمال سے ترجمے میں حسن کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ "جاوید نامہ" حقائق و معارف اور اسلامی تصوف کا پیچیدہ کلام ہے جسے سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے لیکن مترجم نے اپنی تخلیقی فطرت اور خداداد فطانت کو بروئے کار لا کر اس ترجمے سے بلند مقام حاصل کیا۔ ایسا ترجمہ ایک کامیاب ترجمہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

چھٹا باب ضرب کلیم، زبور عجم اور مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد کے تراجم پر مشتمل ہے۔ باب ذرا طویل ہے کیونکہ راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ ایک مترجم کو ایک ہی باب میں رکھا جائے یا ایک ہی تصنیف کو ایک باب میں ذکر کیا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سید تقویم الحق کاکاخیل نے تراجم کے سلسلے میں سب سے زیادہ کام انجام دیا ہے۔ وہ عالم فاضل شخصیت تھے۔ زبور عجم کی اصطلاحات اقبال کی تخلیقی فکر کا ثمرہ ہیں۔ مترجم نے دیباچہ لکھ کر انہی اصطلاحات اور پیچیدگیوں کی نشاندہی کر دی ہے اور ایسے الفاظ کو انھوں نے اپنی جگہ جوں کے توں چھوڑ دیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور آسان ہے لیکن ترجمے میں دوسری زبانوں کے الفاظ مخمل میں بوریا کی پیوند کاری معلوم ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر ترجمہ ایسا دلکش ہے جس پر تخلیقی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

ساتواں باب تمام تراجم کا مجمل جائزہ پیش کرتا ہے۔ مترجمین اور ان کا لائحۂ عمل اور ان کے تراجم کا معیار متعین کیا گیا ہے، گویا یہ تمام ابواب کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ کتابیات دو حصوں میں منقسم ہے، بنیادی مآخذ، اور ثانوی مآخذ۔ بنیادی مآخذ میں پشتو تراجم، تصانیف اقبال (کلیات اقبال، اردو اور فارسی)، پشتو کتب و رسائل اور اردو کتب شامل ہیں، جبکہ ثانوی مآخذ میں اقبال پر اردو میں لکھی ہوئی کتب، تصانیف اقبال کی شرحیں، دیگر کتب اور رسائل و میگزین شامل ہیں۔

مقالہ کی تیاری کے وقت جو تکالیف اور دشواریاں ایک محقق کو پیش آتی ہیں مجھے بھی پیش آئیں جن کا ذکر بے سود ہے۔ میں ان سب حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری معاونت کی، جن سے میری خط کتابت رہی اور جن کی مجھے رفاقت نصیب ہوئی۔ ان میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب جن سے خط کتابت رہی اور میری رہنمائی فرمائی۔ پرنسپل محمد جمیل خان صاحب، پروفیسر مشتاق احمد صاحب اور پروفیسر محمد ادریس صاحب نے میری معاونت کی جن کا بے حد ممنون ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان صاحب اور پروفیسر ضیاء الرحمن صاحب سے زیادہ ملاقاتیں ہوتی رہیں، کورسز کی تدریس کے ساتھ انھوں نے بے حد تعاون کیا اور میری بھرپور رہنمائی کی۔ ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوا، انھوں نے بھی حتی الوسع میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ لائبریرین سرفراز صاحب نے لائبریری پشتو اکیڈیمی میں مواد کی فراہمی میں فراخدلی کا ثبوت دیا جن کے ہم بے حد ممنون ہیں۔ لائبریرین زرشاد صاحب نے پشاور پبلک سکول لائبریری میں کتب کی فراہمی میں بے حد تعاون کیا جن کے ہم بہت شکر گزار ہیں۔ اساتذہ میں ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک صاحب کے ہم بے حد ممنون ہیں جنھوں نے بروقت ہماری رہنمائی فرمائی اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے زیر نظر مقالے کو دیکھا بھالا اور بطریقِ احسن تصحیح فرمائی۔ میرے نگران اور محترم استاد ڈاکٹر صابر حسین کلوروی صاحب صدر شعبۂ اردو استاد ہونے کے باوجود ان کا رویہ میرے ساتھ دوستانہ اور مشفقانہ رہا۔ انھوں نے ہر مرحلے پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی، مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب توجہ نہ فرماتے تو شاید مقالے کی تکمیل

ناممکن ہوتی، ان کے پر خلوص جذبات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ انھوں نے بار بار میری تحریر کو پڑھا اور مفید مشورے دیے۔ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ مجھے زیر نظر مقالہ تکمیل سے ہمکنار کرنے کی توفیق بخشی۔

باب اوّل

سمندر خان سمندرؔ

اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی

(ا) رموزِ بے خودی (پشتو ترجمہ ۱۹۵۲ء)

- مترجم کا تعارف
- رموزِ بے خودی پر ایک نظر
- ترجمے کی نوعیت
- ترجمے کا تفصیلی جائزہ
- بامحاورہ اور مثالی ترجمہ
- تلمیحات و اشارات
- اغلاط

(ب) اسرارِ خودی (پشتو ترجمہ ۱۹۵۴ء)

- اسرارِ خودی پر ایک نظر
- دیباچہ از سمندر۔ ترجمے کی نوعیت
- ترجمے کا تفصیلی جائزہ
- مشکوک ترجمہ
- بامحاورہ ترجمہ
- ترجمے کا معیار

۱

کتاب	رموزِ بےخودی (۱۹۱۸ء)
مترجم	سمندر خان سمندرؔ
ناشر	پاکستان پبلیکیشنز کراچی
سنِ اشاعت	۱۹۵۲ء
صفحات	۲۰۲

مترجم کا تعارف

سمندر خان سمندرؔ ۱۹۰۱ء میں نوشہرہ کے بدرشی گاؤں میں منصور خان کے گھر پیدا ہوئے۔ والدین نے ابتداء میں ان کا نام جانس خان رکھا پھر اسے بدل کر سمندر خان کر دیا۔ چونکہ بچپن ہی سے ذوقِ شعر و سخن رکھتے تھے اس لیے چھ سال کی عمر میں پشتو شاعری کی ایک صنف "ٹپے" کہنے لگے تھے۔ ابتدائی تعلیم نوشہرہ میں حاصل کی۔ گھریلو حالات اور شعروشاعری نے انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے سے روکے رکھا۔ انھوں نے محنت مزدوری، کوچوانی، ملازمت اور جادوگری کے کام بھی کیے بعد دیگرے انجام دیے۔ جب انگریزوں کے خلاف تحریکیں شروع ہوئیں تو اپنی انقلابی نظموں کے ذریعے مسلمانوں میں جذبۂ حریت بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ ادب برائے زندگی، زندگی برائے بندگی اور بندگی برائے ابدی حیات کے قائل تھے۔ صوبہ سرحد کی ایک ادبی انجمن "ادبی ٹولے" کے زیرِ اہتمام پشاور عجائب گھر میں "تصویرِ جانان" نظم سنانے پر ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ریڈیو سٹیشن پشاور میں پشتو زبان و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ ۱۷ جنوری ۱۹۹۰ء کو رحلت کر گئے۔

سمندرؔ پشتو ادب میں عروضی مکتب کے بابائے آدم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ غزل کے روایتی علامات و تصورات کو برقرار رکھنے کے ساتھ اس کی شگفتگی اور تازگی میں بھی اضافہ کیا۔ ابتداء میں رجعت پسندی اور قدامت پسندی کے بعد "خوږه شپیلئ" (سریلی مُرلی) اور غزلیں جدت پسندی، مضمون آفرینی، منفرد اسلوب، جذبات نگاری، استعارات و تشبیہات کی ندرت جیسی خوبیوں سے مالامال ہیں۔

تصانیف:۔

دالم ځوکه، لیت اولار، د قران ژړا، خوږه شپیلئ، رنړا، بلے ډیوے، تار او شاباز، گلکر، د بلال بانگ، تماشے نندارے، خوږلن، کوزه کبش سمندر، علم، پت، دَ توحید ترنگ (دس جلدیں)، دَ یثرب شمیم، دروند پښتون اور اسرار خودی اور رموزِ بے خودی کے منظوم تراجم (درجنوں غیر مطبوعہ منظوم و منثور آثار)۔

نثر:۔

کاروان روان دے، خبرے، لوړ یدلے ژوند، پښتنے، ژور سمندر، اوبنکی سمندر، قافیه، تشبیه، استعاره، لس خزانے، زماژوند۔

سمندرؔ نے منظوم تراجم کے دیباچے بھی تحریر کئے ہیں۔ جس میں خودی اور بے خودی پر سیر حاصل تبصرے ہیں۔ سب سے

پہلے پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر ن۔م راشد کے ایماء پر رموزِ بے خودی کا ترجمہ کرنے کے بارے میں ۲۶ اپریل ۱۹۵۲ء کو فیصلہ ہوا۔اس لیے اسرار خودی کا ترجمہ بعد میں ۱۹۵۴ء میں کیا گیا۔(۱)

تصنیف کا تعارف :۔

رموزِ بے خودی علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا دوسرا حصہ ہے۔ اسرار خودی عرفان ذات و نفس سے عرفان حق تک رسائی ہے۔ جب فرد ملت میں گم ہو جاتا ہے تو اپنی ذاتی صلاحیتیں بروئے کار لا کر ایک اسلامی فلاحی معاشرے کے لیے باعثِ خیر و برکت اور باعث ترقی و کامرانی بنتا ہے۔ جب معاشرے کے ہر فرد سے معاشرے کا وجود ہر پہلو سے سوئے منزلِ کامرانی رہے تب خودی بے خودی میں منعکس ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے خودی و بے خودی کے مسئلے میں صوفیوں کے نظام فکر سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کے ذریعے اجتماعی عمل اور اجتماعی مصالحِ انسانیت کا راستہ دکھایا ہے۔ ازل پر نظر مرکوز کرنے کی بجائے ابد کی تسخیر کو منزل مقصود قرار دیا ہے۔ اور اس تسخیر کے لیے جو دستور العمل تجویز کیا ہے، اس میں فرد و جماعت دونوں کو لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے۔(۲)

خودی کے پاسدار انسان کا کسی منظم گروہ یا جماعت میں شامل ہونا ایسا ہے۔ جیسا کہ قطرہ دریا میں مل کر محکم بنتا ہے۔ انفرادی خودی اجتماعی خودی میں مدغم ہو کر مستحکم ہو جاتی ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود

قطرۂ وسعت طلب قلزم شود(۳)

رموزِ بے خودی کے پہلے ایڈیشن میں ایک مختصر سا دیباچہ تھا۔ اس میں فرماتے ہیں۔

> " جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفعِ مضرت، تعیین عمل و ذوقِ حقائق عالیہ، احساس نفس کی تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملک و قوم کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر قومی انا کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی عمل کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے"(۴)

رموزِ بے خودی میں مظاہر سیاست بیشتر اور اسرار خودی میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں، لیکن منزل مقصود ایک ہے۔ رموزِ بے خودی کا اصل ملتِ اسلامیہ کے اسرار حیات کی تشریح ہے۔(۵) افراد اور قوم، توحید، لاتخف ولا تحزن، رسالت، اخوت، مساوات، اسلامی حریت، ملت اسلامی کی آفاقیت، ملت کی بنیاد، نظامِ ملت قرآن، اجتہاد و تقلید، اتباعِ شریعت، ملت اسلامیہ اور

---

(۱) بیش خلیل، پہنتانۂ لیکوال، جہانگیر پورہ پشاور، در الصنیف، ۱۹۶۱ء

(۲) ڈاکٹر سید عبداللہ، مقامات اقبال، لاہور اکیڈمی لاہور، اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۶۹

(۳) جاوید اقبال، کلیات اقبال (فارسی) طبع سوم، لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز، مارچ ۷۸، ص ۸۶

(۴) حوالہ غلام رسول، مطالب اسرار و رموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص ۳۵

(۵) اختر راہی، مرتب، اقبال سید سلیمان کی نظر میں۔ بزم اقبال لاہور، طبع اول، مارچ ۷۸، ص ۵۲

بیت الحرام،اشاعت توحید، نظام عالم کی تسخیر، قومی تاریخ، امومت، حضرت فاطمۃ الزہرا، تفسیر سورۂ اخلاص وغیرہ جیسے عنوانات کی وضاحت اس مثنوی میں کی گئی ہے۔

رموزِ بے خودی، قرآنی معارف اور اسلامی حقائق کی تشریح ہے۔ یہ قومی انا کا راز ہے۔ علم الحیات اور عمرانیات کا درس ہے۔ فرد ربطِ جماعت بمنزلہ رحمت کے ہے۔ اور اس کے جوہر کا کمال ملت ہے۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است

جوہر اورا کمال از ملت است (۱)

جب ایک لفظ کسی شعر سے خارج کر دیا جائے تو اس میں کچھ بھی مضمون باقی نہیں رہتا۔ یہ اجماع وانفراد کی پوری وضاحت ہے۔

لفظ چوں از بیتِ خود بیروں نشست

گوہر مضمون بجیب خود شکست (۲)

بنی نوع انسان کی انفرادی یا اجتماعی تعلیم توحید سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی۔ توحید کی بنیاد پر امت کے سارے افراد ایک جماعت اور ملت ہیں۔ دفعِ مضرت کے جو قوانین علامہ نے قائم کئے ان میں پہلا قانون محکم اساس حزن ویاس اور خوف کی بیخ کنی ہے۔ اقبال نے بتایا کہ کوئی قوم اس وقت تک اپنی زندگی میں استحکام پیدا نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اپنی تاریخ کو محفوظ نہ کرے۔ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب دریافت کرنا انسانی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ تاریخ کو قرآن نے ایامِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال کا فلسفۂ اجتماع یہ بتاتا ہے کہ عمرانی زندگی کی اخلاقی قدروں کے بغیر فرد اپنی تکمیلِ ذات نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خودی اور غیر خود (معاشرہ) کے تعامل سے تمدن کی تخلیق ہوتی ہے۔ پابندیاں انسانی اخلاق وتمدن کی جان ہیں۔ انسان میں احساسِ ذات کے ساتھ عمرانی ذمہ داریوں کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ جن کو جانے اور برتے بغیر تارِ حیات بے نغمہ رہتے ہیں (۳)

صالح جماعتی زندگی کا تقاضا ہے کہ افراد یہ محسوس کریں کہ خود ان کی زندگی اس وقت تک ادھوری رہے گی جب تک کہ دوسروں کی مادی اور اخلاقی تکمیل کی راہ صاف نہ کی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کے مختلف ارکان میں گہرا جذباتی اور روحانی تعلق موجود ہو اور ان کی خواہشات اور خیالات میں اشتراک پایا جاتا ہو۔ منظم جماعت فرد کی طرح اپنی خودی، اپنی انا رکھتی ہے جو اس کے اخلاق وکردار کی کسوٹی ہوتی ہے اور جس پر وہ کھرے کھوٹے، مفید وغیر مفید اور حق وباطل کو پرکھتی ہے۔ اس اجتماعی خودی کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ باوجود افراد کے مٹتے رہنے کے ملت کا وجود باقی رہتا ہے۔ اور اس کی اجتماعی قدریں نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اجتماعی زندگی ماضی اور مستقبل کی آئینہ دار ہوتی ہے اور فرد کی سیرت میں اس کے خدوخال کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ جماعت دائمی ہونے کی بناء پر ماضی و مستقبل کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ جماعت کی اہمیت وافادیت قرآن کریم کی آیات

---

(۱) کلیات اقبال، فارسی، ص ۸۵

(۲) ایضاً ص ۸۶

(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان، روح اقبال، القمر انٹر پرائزر لاہور، جنوری ۱۹۹۴ء ص ۲۰۱

اور احادیثِ نبوی ﷺ سے صاف واضح ہے (۱)

جماعت وہ کلیت ہے جس میں افراد اجتماع کے مقاصد کا محافظ بن کر اپنی خودی کو اجتماع کی بے خودی سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ملت بحر ذخار ہے۔ جس میں سب کچھ ہے۔ جس کی ہر چیز اپنی خودی رکھتی ہے اور اس خودی کے باوجود وہ بے خودی کے بحر مواج کا حصہ ہے۔(۲)

ابتدا میں مثنوی کا تیسرا حصہ بھی لکھنا منظور تھا۔ مگر بعد میں رائے بدل گئی اور انھوں نے اپنے افکار عالیہ دوسری کتابوں میں پیش کر دیے۔ اگر تیسرا حصہ رکھا جاتا تو اس ملت اسلامیہ کے انحطاط کو ختم کر کے اس کی زندگی کو زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کے عملی اصول تفصیل سے پیش کر دیتے۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی میں وہ اصول صرف مجمل طریق پر بیان ہوئے ہیں۔(۳)

مثنوی کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اشعار روانی اور سلیس البیانی میں موثر ہیں۔ مذہبی حقائق اور فلسفیانہ تشریح کے ساتھ ساتھ صوفیانہ رنگ بھی ملتا ہے۔ اقبال کے خیالات میں حد درجہ روانی ہے۔ محاورے کی زبان کے علاوہ مثنوی لفظی و معنوی خوبیوں سے مالامال ہے۔ اس میں جو اسرار و نکات حل کئے گئے ہیں۔ اُن کی بناء پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فن قومیات کا ایک رسالہ ہے۔ بلکہ جدید علم کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔

ترجمے کا تعارف :۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک مشکل اور پیچیدہ مرحلہ ہے۔ کیوں کہ شاعر کے الفاظ، اصطلاحات، خیالات و تصورات اور تشبیہ و استعارے اور کنائے کی زبان کو دوسری زبان کا جامہ پہنانا کوئی آسان عمل نہیں پھر منظوم ترجمہ اور بھی سخت اور کٹھن کام ہے۔ ایک زبان کو دوسری زبان کے ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا کہ زبان شستہ اور بامحاورہ ہو اور اصل مفہوم پر کوئی حرف آئے بغیر حتی الوسع اور کماحقہ طور پر ادا ہو جائے پتھر میں جونک لگانے کے مترادف ضرور ہے۔ پھر علامہ اقبال جیسے عالم اور مفکر شاعر جنھوں نے اقوام عالم کی تاریخ اور مشرق و مغرب کے فلسفے اور نظریات کا گہرا مطالعہ کیا ہو اور فلسفۂ اسلام کو موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے امت مسلمہ کے سامنے پیش کر کے سعی بلیغ کی ہو، جب اُن کے کلام کو ایک ترجمان کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تو بہت ساری پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں۔ اِن مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے علامہ کی مخصوص تصنیف کے لیے ان کی خاص نثری تحریروں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی کے بارے میں انھون نے جو کچھ فرمایا وہ ان مسائل کے حل میں مدد و معاون ہے۔

دونوں مثنویوں کے مطالب اتنے پیچیدہ ہیں کہ ہر شخص انہیں سرسری نظر سے ذہن میں نہیں بٹھا سکتا۔ علامہ اقبال کو سمجھنے کے لیے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اقبال اتنا سادہ شاعر نہیں جس کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔ جہاں تک اسرار و رموز کے ترجمے کا تعلق ہے۔ مترجم شاعر کے لیے علامہ کے تصورات و خیالات اور زبان کو گرفت میں لینے کے علاوہ

---

(۱) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ حضرت علی کا قول ہے کہ تفرقے سے بچو کہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصہ ہے۔

(۲) ڈاکٹر عبداللہ، مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ، بزم اقبال لاہور، جون ۱۹۸۴ء، ص ۲۰۲۔

(۳) مولانا غلام رسول مہر، مطالب اسرار و رموز، ص ۳۶

تشبیہات واستعارات اور اصطلاحات کو ترجمہ کی زبان میں پیش کرنا اور متبادل زبان میں ردیف قافیہ اور سب سے بڑھ کر بحروں کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ رموزِ بے خودی ایک بحرِ بیکراں ہے۔ جس کی تہہ میں بیش قیمت جواہرات ہیں۔ ایک ایک لفظ تشریح کا متقاضی اور ایک ایک نکتہ کا بیان ضروری ہے۔ جس کے لیے چھان پھٹک اور تلاش و جستجو کا عمل بے حد ضروری ہے۔ ترجمہ گلدار چادر کا دوسرا رخ ہوتا ہے۔ جس سے اصل رخ کی خوبصورتی کا محض اندازہ ہی ہو سکتا ہے۔ سمندرؔ نے اصل رخ پیش کرنے کی کوشش بہر حال کی ہے لیکن پھر بھی یہ ترجمہ ہے۔ جس میں شاعر کی ان گنت مجبوریاں ہیں۔ مترجم فرماتے ہیں کہ شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا اور نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا آسان کام نہیں۔ پھر فارسی محاورات کی جگہ پشتو محاورات کا استعمال ان کے لیے مشکل اور پیچیدہ ضرور تھا۔ اقبال جیسے عظیم فلسفی اور بے مثال عالم کے کلام کو پشتو کا ایسا مزین لباس پہنانا تھا کہ الفاظ و مفاہیم میں فرق بھی نہ آئے اور الفاظ بھی پشتو کے تلاش کئے جائیں(۱)

﴿۔۔۔ترجمے کا تفصیلی جائزہ۔۔۔﴾

سرورق پر رومیؔ کا یہ شعر :۔

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زودتر واللہ اعلم با لصواب

کوشش کر اور اپنے آپ کو بے خودی میں پالے، یہ آسان طریقہ ہے باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ رومی کے مذکورہ شعر کا ترجمہ مفقود ہے۔

سرِ فہرست شعر:

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن نیست اگر با دگرے ہست

اگر میں عشق کی بات کرتا ہوں تو تجھے اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر میں اس نشے سے خالی ہوں تو کسی اور میں ضرور ہو گا۔ یہ شعر عرفی کا ہے لیکن شعر میں الفاظ کس قدر مختلف ہیں۔ عرفی کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے۔ :۔ منکر نشوی گر بہ غلط دم زنم از عشق اس شعر کا ترجمہ بھی مفقود ہے۔ اس لیے ترجمہ اس طرح ہو گا۔

کہ زۀ د عشق خبره کوم تۀ ددے نه انکار مۀ کوه
زۀ ددے نشے خالی یم هر څوک داسے به نۀ وی

اے مثالِ انبیا پاکانِ تو
ہمگرِ دلہا جگر چاکانِ تو

تیرے نیک لوگ گزشتہ انبیاء کی مانند ہیں۔ تیرے جگر چاک دلوں کو جوڑنے والے ہیں۔

اے هغه چه ستا سپیڅلی انبیاء غوندستائلی
خپلر ینے چه ئے دي سوی هغو رونه وروستلی(۲)

(۱) سمندر خان سمندرؔ، رموزِ بے خودی، طبع اول، کراچی، پاکستان پبلیکیشنز ۱۹۵۴ء، دیباچہ از سمندرؔ (۲) ایضاً ص ا

ترجمہ مبہم ہے۔اور خاص طور پر پہلے مصرے کا مطلب واضح نہیں ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

اے هغه چه ستا سپیڅلی خلق ئے دَ انبیاؤ غوندستائیلی
خپلو ځیګرونو ئے هغه مات شوی زړونه وروستلی

نظم "توحید"

ملت از یک رنگئی دلہا ستے
روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے

ملت کا وجود دلوں کی یک رنگی سے ہے۔ یہ سینا ایک ہی جلوۂ (توحید) سے روشن ہے۔ تمام افرادِ قوم کے دلوں کا مقصد و مدعا ایک ہو۔ قوم کی فطرت میں ایک ہی جذبہ ہونا چاہیے اور اس کے لیے اچھائی برائی کا پیمانہ بھی ایک ہی لازم ہے۔(۱)

په یو رنګ کبښ زړونه رنګ شي بیا رمه نه ده ملت دے
له یوے جلوے موندلے د غه غر دے طور رنړا عزت دے (۲)

دوسرا مصرع طویل اور پیچیدہ ہے۔ صحیح مصرعہ اس طرح ہوگا۔

له یوے جلوے موندلے دَ طور غر رنړا عزت دے

مدعائے ما، مآلِ ما یکے ست
طرز و انداز خیالِ ما یکے ست

ہمارا مدعا بھی ایک ہے۔اور ہمارا مقصد بھی ایک ہے۔ ہماری سوچ بھی ایک ہے۔ اور اس کے اظہار کا طریقہ بھی ایک جیسا ہے۔

بس یوه مو مدعا ده یوه لار او یوئے سر دے
یو مو خیال او یو مودود دے ډیر سرونه یو، یوور دے (۳)

دوسرا مصرع پیچیدہ، طویل اور مبہم ہے۔ اس طرح صحیح ہوگا۔ (یو مو خیال یو مو اظهار دغه زمونږ د سترګو سر دے)

نظم "محاورہ تیر و شمشیر" کا یہ شعر :۔ اے پریہا جوہر اندر قافِ تو
ذوالفقارِ حیدرؓ از اسلافِ تو

اے تلوار! تیرے اندر جو جوہر موجود ہیں وہ تیرے کوہِ قاف کی پریاں ہیں۔ حضرت علیؓ کی ذوالفقار بھی تیرے ہی آباؤ اجداد میں سے تھی۔

وے اے تروے دی جوهر ستابناپیرئ د غرونو ګرانو
ذوالفقار د علیؓ هم دے ستا له لوړو مشرانو (۴)

(کہا اے پھوپھی! تیرے جوہر بھاری پہاڑوں کی پریاں ہیں۔ علیؓ کی تلوار بھی تیرے اعلیٰ اسلاف سے تھی) ترجمے میں "قاف" کا ذکر تک نہیں کیا۔ مصرع اس طرح صحیح ہوگا: دی وزرے ستا د بناپیرو دقاف د غرونو ګرانو

---

(۱) مولانا غلام رسول مہر، مطالب اسرار و رموز، ص ۲۲۹

(۲) سمندر خان سمندر، مترجم، د رموزِ بے خودی، ص ۲۶ (۳) ایضاً ص ۲۹ (۴) ایضاً ص ۲۷

قوتِ بازوئے خالد دیدۂ
شام را بر سر شفق پاشیدۂ

(اے تلوار) تو نے خالد کے بازو کی قوت دیکھی ہے۔ اور ملکِ شام پر خون کی شفق بکھیری ہے۔ دوسرے مصرعے میں حضرت خالدؓ کی فتوحاتِ شام کی طرف اشارہ ہے۔

دَخالد غوند میړونو قوتونه تالیدلی
ماښامونو ته په سرتاشفقونه دی شیندلی(۱)

(حضرت خالدؓ جیسے بہادروں کی قوت تو نے دیکھی ہے۔ شام کے وقتوں پر شفق بکھیری ہے۔)

دوسرے مصرعے کا ترجمہ غلط ہے۔ ملکِ شام سے شام کا وقت مراد لیا گیا ہے۔ مصرع اس طرح صحیح ہوگا

په وطن د شام په سر تا شفقونه دی شیندلی

نظم "حکایت عالمگیر"

صبح گاہاں شد بہ سیر بیشۂ
با پرستارے وفا اندیشۂ

ایک روز عالمگیر بادشاہ صبح کے وقت ایک وفادار غلام کے ساتھ جنگل کی سیر کو نکلا۔

یوه ورځ روان شو سیل ته د ځنګل په شاړو پاړو
یو مرئے چه وفادار وه هغه هم ورسره لاړو(۲)

ترجمہ میں صبح کے وقت کا ذکر نہیں ہے۔ ترجمے کا پہلا مصرعہ اس طرح ہونا چاہیے :۔

یوسحر روان شو سیل ته د ځنګل په شاړو پاړو

"شاړو پاړو" کی اصطلاح صحرا ودشت کے لیے پشتو میں بڑی دلکش اور دلفریب ہے۔ نظم "مقصود رسالت محمدیہؐ تشکیل وتاسیس حریت اور مساوات واخوت بنی آدم است" کے ترجمے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے ہیں اور اس لیے صفحہ ۵۶ کو ۵۱ اور صفحہ ۵۱ کو صفحہ ۵۶ پڑھا جائے۔

دشمنان چوں ریگِ صحرا لا تعد
دوستان او بہ یزداں ہم عدد

دشمن ریگ صحرا کے ذروں کی مانند لاتعداد تھے اور ان کے دوست لفظ یزداں کے ہم عدد (بہتر) تھے۔

لس او شل او زرخه وائے لکه شګے ئے دشمنان
د دۀ ملونه خو زاړه ووپانو بنځے ماشومان(۳)

(دس بیس اور ہزار کی کیابات، دشمن ریت کی مانند تھے۔ اس کے ساتھی کچھ بوڑھے یا زن یا بچے تھے)

دوسرے مصرعے کا ترجمہ اصل سے مختلف اور آزاد ہے۔ اس لیے دوسرے مصرعے کی اصلاح ہونی چاہیے

---

(۱) سمندر در موزِ بے خودی، ص ۷۳ (۲) ایضاً ص ۴۱ (۳) ایضاً ص ۶۸

گیرد آسان روزگارِ خویش را
بشکند حصن و حصارِ خویش را

اگر لڑائی کے دن دشمن کا لشکر اس خیال سے بے فکر ہو جائے کہ صلح ہو رہی ہے۔ حفاظت کے لیے اس نے جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، انہیں ڈھیلی کر دے اور دفاعی تدابیر سے کنارہ کش ہو جائے تو جانتے ہو کہ اسلام کا کیا حکم ہے؟ یہ کہ جب تک اس کے تمام حفاظتی انتظامات پہلی شکل پر نہ آجائیں اس کی مملکت پر لشکر کشی حرام ہے ______ خان نیاز الدین خان مرحوم کے نام ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی کا یہ حصہ ۶ فروری ۱۹۱۶ء کو لکھا گیا۔ فرماتے ہیں :افسوس کہ مثنوی کا دوسرا حصہ بھی تیار نہیں ہو سکا۔ کل کچھ فرصت مل گئی (۶ فروری) فقہ کا وہ مسئلہ نظم کیا، جس کی رو سے مسلمانوں کے لیے اس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے، جو صلح کی امید میں اپنے حصار وغیرہ گرا دے(۱)

توری او منډی په تیکو کرانی کړی په ځان اسانی
له یوه سره تول وران کړی پناه ځائی او قلعه ګانی (۲)

(تلواریں نیام میں رکھ دیں اور اپنی مشکل آسان کر دے۔ جائے پناہ اور حصار سارے گرا دے)
ترجمہ کے دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہیں۔

نیست میشِ ناتوانے لاغرے
در خورِ سر پنجۂ شیرِ نرے

کمزور اور لاغر بھیڑ شیر نر کے پنجہ کے لائق نہیں۔

جوړ د جوړ سره ښائی څه ناتوانه خواره میښنه
د هغه ساری خونه ده که په شین زمری شی پیښنه(۱)

(ہم جنس، ہم جنس کے لائق ہے۔ سبز شیر کے مقابلے میں کمزور بھینس کی کیا حقیقت ہے)
شاعر مترجم نے قافیہ پیمائی کی دھن میں "میش" (بھیڑ) کو بھینس کے معنی میں استعمال کیا۔

از غضب چوبے شکستم بر سرش
حاصلِ دریوزہ افتاد از برش

میں نے غصے سے اس کے سر پر ڈانڈا دے مارا۔ جس سے اس کی جھولی میں جو بھیک جمع تھی نیچے گر گئی

سوخت شوم ماہرِ کوتک کښېښوشو په ویر غږ ونه ئې لوئې شول
ګوډې ئې او شلیدو د تخر نه څه چه وو هغه ترتوئې شول(۳)

ترجمہ پیچیدہ، بے ہنگم، مصرعے طویل اور مشکل ہیں جس پر نثر کا گمان ہوتا ہے۔

---

(۱) بحوالہ مطالب اسرار و رموز، ص ۳۱۱
(۲) ترجمہ رموزِ بے خودی، ص ۱۰۳
(۳) ایضاً ص ۱۱۱ (i) ع {څه مجال د ګلوے چه سیالی کاله ضیغیم (خوشحال خان خٹک)}

؎ رفت نم از ریشہ ہائے تاکِ او

بید مجنوں ہم نروید خاکِ او

اس کے انگور کی رگوں سے نمی جاتی رہی۔اس کی خاک سے انگور تو در کنار بیدِ مجنون بھی پیدا نہیں ہوتا۔

نم تر لاړو کورټے وچ شوکه غونچے به ئے شوکولے

خاوره ئے داسے شوه بے خونده ولے ئے هم نه توکولے (۱)

ترجمے میں بید مجنون کا کوئی ذکر نہیں،اس لیے اصلاح کی گنجائش ہے۔

بامحاورہ تراجم :۔

از فریبِ عصر نو ہشیار باش

رہ فتد اے رہرو ہشیار باش

دور جدید کے (نظریۂ نیشنلزم) کے فریب سے ہوشیار رہ۔ یہاں قدم قدم پر ڈاکے پڑتے ہیں آگاہ رہ۔

ځان له نوی دوره ژغوره کتوری نه لری زانړی

لاړ وبیه هبنیار اوسه نوی زمکه ده شخویدانړی (۲)

(ہنس اپنے لیے اتنی نئی بہتر رکابیاں نہیں رکھتیں۔اے راہرو ہوشیار رہ کیونکہ نئی زمین پھسلن والی ہے)

؎ تانماید تابِ نامشہور خویش

شعلۂ او پردہ بند از دودِ خویش

زندگی اپنے باطن کی تب و تاب کی نمائش کے لیے اپنے شعلے کو اپنے دھوئیں کے پردے میں بند رکھتی ہے۔

تر پټ ځان بنکاره کولو دالاناخلی اور لړونے

سره لنبه دژوند وی پټه خبل لوږے کړی تو ربپرونے (۳)

" اور لړونے "(تندور کو شعلہ زن کرنے کے لیے جو کالا ڈانڈا استعمال ہوتا ہے) خوبصورت اصطلاح اور " تور بپرونے "(کالی اوڑھنی) خوبصورت قافیہ اور دھوئیں کے پردے کا نعم البدل ہے۔

؎ اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ

عالمِ اسباب را دوں گفتۂ

اے وہ شخص جو افیون کی تاثیر سے سویا پڑا ہے اور عالم اسباب (دنیا) کو حقیر کہتا ہے۔

دَ اسبابو په عالم کبن اے بے سوله افیم خوره

(ا)تل دنیا ته بده وائی لوته اخوا کره له لوره (۴)

---

(۱) سَندرہ در موزِ بے خودی، ص ۱۲۵ (۲) ایضاً ص ۷۷

(۳) ایضاً ص ۱۲۰ (۴) ایضاً ص ۱۳۸ "(ا)لوته اخوا کره له لوره" ضرب المثل ہے جس کا مطلب بیدار ہو کر سعی و عمل کرنے کے ہیں۔

؎ دُلدلِ اندیشہ ات طوطی پرست

آنکہ گامش آسماں پیمادراست

تیرے فکر کے گھوڑے کو طوطی کے پر لگے ہوئے ہیں اس کا قدم آسمان کی وسعتوں تک پہنچتا ہے۔

ستا د فکر اس سیلئی دے په توندئ کبش دے بے شانه

دے په جوتو ترپو گرځی له اسمانه تر اسمانه(۱)

(تیرے فکر کا گھوڑا بے حد بادِ تند کی طرح ہے۔ جو اپنی مستی آسمانی وسعتوں میں سیر کرتا ہے۔) "جو توترپو" کی اصطلاح نرالی ہے جو گھوڑے سے مخصوص ہے۔

؎ رشتۂ ایّام را آور بدست

ورنہ گردی روزکورو شب پرست

اگر تو گزرے ہوئے زمانے کا رشتہ سنبھالے نہیں رہے گا تو اس بیمار کی طرح ہو جائے گا جسے دن کو نظر نہیں آتا اور چمگادڑ بن جائیگا، جو روشنی سے بھاگتی ہے(۲)

ایّام کے رشتے کو اپنے ہاتھ میں مضبوط پکڑو ورنہ تو دن کا اندھا اور رات کا پجاری بن جائے گا۔(۳)

تل د ورځو مزے غره په دے کارکښ اوسه توند (i)

گنی گرځه په تیروکښ بناپیرک دورځے روند(۴)

؎ ناتراشتے، پرورش نادادۂ

کم نگاہے، کم زبانے سادۂ

جو (لڑکی) غیر مہذب ہے جس کی اچھی تربیت نہیں ہوئی۔ جو کوتاہ نظر، کم زبان اور سادہ مزاج ہے۔(ii)

بے ادبه، بے نمکه د میچن او دَغویجلے

نهٔ خولهٔ وُره، ساده گوتبی دَ جارو او دَ خزلے(۵)

سمندر نے اقبال کے مفہوم کو پشتو کا منظوم جامہ پہنانے میں جو کاوشیں اٹھائی ہیں۔ وہ ان کے بامحاورہ ترجمہ، مثالی اور بے نظیر تراجم اور اضافیات کے ساتھ وضاحتی ترجموں سے بخوبی واضح ہیں۔

مثالی تراجم :۔ نظم "در معنی ربطِ فرد و ملت"

(i) مزے غرل :۔ دھاگہ یا رسی جو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی کو آپس میں رگڑتے ہوئے بنایا جائے۔ پشتو کی خوبصورت اصطلاح ہے۔

(۱) سمندر، رموزِ بے خودی، ص ۱۳۰ (۲) مولانا غلام رسول مہر، مطالب اسرار و رموز، ص ۳۴۶ (۳) میاں عبدالرشید، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع اول ۱۹۹۱ء ص ۳۲۵

(۴) سمندر، رموز، ص ۱۵۲ (۵) ایضاً ص ۱۵۳

(ii) میچن، غوجل، جارو، خزلے، جیسے الفاظ و اصطلاحات ایک سادہ لڑکی کے لیے استعمال کرنا قابلِ ستائش ہے۔

؎ خوگرِ پیکار پیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

میں نے اسے مسلسل جدوجہد میں دیکھا ہے۔ میں اسے خودی بھی کہتا ہوں اور زندگی بھی۔

روږد ډېر له پسے جنگ دے تل په گواح کښې اخلی خوند(i)
یو دے دوه لری نومونه یو خودی او بل ئے ژوند(۱)

(مسلسل جنگ کا عادی ہے اور ہمیشہ جھپٹنے میں مزہ لیتا ہے۔ دو نام خودی اور زندگی لیکن اصل میں ایک ہیں)۔ یاس، حزن اور خوف ام الخبائث اور قاطعِ حیات ہیں اور توحید ان امراض کا علاج کرتی ہے۔

؎ ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

هغه څوک چه په رمزولو د نبیﷺ دے پوهیدلے
نو هغه د زړهٔ په سترگو پټ په خوف کښې شرک لیدلے(۲)

؎ پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

قرآن پاک کی نظر میں آقا و غلام برابر ہیں۔ کوئی بوریا نشیں ہو یا تخت کا وارث، ان میں کوئی فرق نہیں۔

که مرئے وی که باچاوی د قرآن په مخکښې یو دی
که وی کند او که قبا وی د قرآن په مخکښې یو دی(۳)

دوسرے مصرعے میں بوریا نشیں کا ترجمہ گدڑی (خرقہ) اور وارثِ تخت کا قبا کیا گیا ہے۔

ہر کہ پیماں باہُوالموجود بست
گردنش از بندِ ہر معبود رست

جس کسی نے ھوالموجود سے پیمان باندھا، اسکی گردن ہر معبود کی قید سے آزاد ہو گئی۔

چاچه سر په رښتیا کیښنو په دُرشله دپاک رب
د هغه له غاړے ووت د بل هر یو رب جلب(۴)

(جس نے پاک رب کی دہلیز پر سر رکھا، اس کے گلے سے غیر اللہ کی رسی نکل گئی)

؎ فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ مبند

(i) گواخ:۔ دست بدست لڑائی میں جب ایک منع کرنے والوں سے بدو آزما ہو کر جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ خوبصورت اصطلاح ہے۔

(۱) سمندر، بے خودی، ص ۱۴ (۲) ایضاً ص ۳۶ (۳) ایضاً ص ۶۲ (۴) ایضاً ص ۶۳

تیری (عورت) فطرت میں بلند درجاتِ موجود ہیں، تو اپنی ہوش مندی کی آنکھ سیدہ فاطمۃ الزہرؓا کے اسوہ پر رکھ۔ تاکہ تیری شاخ بھی حسینؓ جیسا پھل پیدا کرے اور اسلام کے دورِ اوّل کا موسم (بہار) ہمارے گلزار میں واپس آئے۔

تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

د خدائي جذبو میرمنو راشئ بیا او نغاړئ مټے (i)
سمه لار ده دزهرؓا ژوند، ګورے سترګے نه کړئ پټے
کړئ راستون تیر شوے وار بیا په چمن کښې کړئ بهار بیا
چه م اوکړی هره سانګه د حسینؓ غوند بنه بار بیا(۱)

؎ ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

آپ کی شانِ رحمت ایک زمانے کو نوازتی ہے میری یہ آرزو ہے کہ میرا آخری وقت حجاز میں آئے۔

چه رڼرا تر ټول جهان دے دغه ستا د رحمت شان دے
چه زهٔ مړ شوے په حجاز کښې دغه یو څما ارمان دے(۲)

اکثر اشعار کے ترجمے میں ایک مصرعے میں سارے شعر کا ترجمہ ہوتا ہے۔ اور دوسرا مصرعہ اضافی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک یا دونوں مصرعوں میں اضافی الفاظ وتراکیب ہوتے ہیں جو ترجمے میں حسن کا باعث ہوتے ہیں۔ ترجمہ استعارات، تشبیہات، محاورات اور ضرب الامثال کا بہترین نمونہ ہے۔ پشتو قارئین کے لیے اس میں جدت وندرت اور زبان وبیان کا نادر ذخیرہ موجود ہے۔ ذیل میں وہ تراجم پیش کئے جاتے ہیں جو اضافیات کے زمرے میں آتے ہیں جو مفہوم پر بار گراں نہیں گزرتے۔

؎ ہم نوا از جلوۂ اغیار گفت
داستانِ گیسو و رخسار گفت

میرے ہم نواؤں نے غیروں کے حسن اور ان کے گیسو و رخسار کی داستانیں سنائیں۔

هم نواؤ ته زهیر یم چه پردی مخونه ستائي
خال ؤ سترګے کله زنه کله سنړے وربل وائي(۳)

شاعر نے داستانِ گیسو و رخسار کی بجائے غازہ، آنکھیں، ٹھوڑی، خاص زلفیں یعنی "سنړے" اور "اوربل" کہہ کر تشریحانہ انداز اپنایا ہے۔

؎ من ز جو بار یکتری شاز مش
تا بہ صحنِ گلشنست انداز مش

(i) "میرمنو" اور "نغاړئ" کی اصطلاح بہت ہی شاندار ہیں جس نے شعر کی دلکشی دوبالا کی ہے۔
(۱) سمندر، د موزبے خودی ص ۱۶۸ (۲) ایضاً ص ۲۰۱ (۳) ایضاً ص ۲

میں انھیں ندی سے بھی زیادہ باریک بنا کے تیرے صحنِ گلشن میں پیش کر رہا ہوں۔

سیند راغونډ کړمه په زړهٔ کښې بیاله سترګو ئے واله کړم

اوترم درته ورخونه چه دا ستا چمن اوبه کړم (۱)

(میں اپنے دل میں دریا سما کر آنکھوں سے ندی کی صورت بہاتا ہوں۔ پھر بند باندھ کر تیرے چمن کی آبیاری کرتا ہوں) شاعر نے ترجمے میں شعریت کے فن کا کمال دکھایا ہے۔

ے تا نگاہے افگنی بر روئے خویش

می شوی زنجیرئ گیسوے خویش

تاکہ تو اپنے چہرے پر نگاہ ڈال سکے اور اپنی زلف کی اسیر ہو جائے۔

چه ځان وُه وینے شیدا شے چه ورک شوے راپیدا شے

چه خپل حسن درته دام شی چه مرغئی په دام کښې راشے (۲)

اپنے آپ کو دیکھ کر اپنے پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ جیسا بھٹکا ہوا راہِ راست پر آجاتا ہے۔ جب تیرا حسن تیرے لیے دام بنتا ہے تو تو پرندے کی طرح گرفتار ہو جاتا ہے۔

ع جانم از صبر و سکوں محروم بود ______ میری جان صبر و سکون سے محروم تھی۔

نه م صبر نه سکون و، پرقیدم د بټ نینه وم (۳)

(میرا صبر و سکون نہ رہا اور بھٹی کے دانہ کی طرح بیقرار رہا)۔ مصرعے کا دوسرا حصہ دلکش اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ "پرقیدم" ایک خوبصورت اصطلاح ہے۔)

ے تا توانی با جماعت یار باش

رونقِ ہنگامۂ احرار باش

جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ لگا رہ اور اس طرح ہنگامہ احرار کی رونق بن جا۔

یو دے خدائے بنه، چه توانیږے جماعت سرهٔ مل اوسه

که احرار دي غبنتے پړے په داپړی کښې ول اوسه (۴)

اکیلا خدا ہی بہتر ہے، جماعت کا ساتھ دے کیونکہ یہ تیری تقویت ہے۔ اگر احرار ایک رسی ہے تو اس میں ایک لہر (ول) ہے۔ "وَل" ایک خوبصورت اصطلاح ہے۔ جو رسی سے منسوب ہے۔

ے عہدِ حاضر فتنہ ہا زیر سر است

طبع ناپروائے او آفت گر است

اے سمندر، رموزِ بے خودی، ص ۴ (۲) ایضاً ص ۵ (۳) ایضاً ص ۶ (۴) ایضاً ص ۹

موجودہ دور اپنے اندر بہت سے فتنے رکھتا ہے، اِس کی بیباک طبیعت سراپا آفت ہے۔

موجوده زمانه بده د فساد پتنو پرئ ده

بې پرواه طبعه ئې ګوره افت ګره خونړئي ده(۱)

شاعر نے پہلے مصرعے میں فساد کا مترادف "پتنو" دونوں الفاظ (فساد، پتنو) استعمال کئے ہیں۔ جو تاکید کے لیے ہیں۔ "پڑئ" (پڑیا) کا استعمال خوش آئند ہے۔ ترجمہ اس طرح سے ہے کہ موجودہ زمانہ بُرا اور فساد کی پڑیا ہے، اس کی بے پرواطبیعت کو دیکھ، آفت گر اور غارت گر ہے۔

ے آزما ید قوتِ بازوے تو

می نہد الوند پیشِ روے تو(ا)

(شرع) تیرے قوتِ بازو کو آزماتی ہے، تیرے سامنے (مشکلات) کا پہاڑ رکھتی ہے۔

ستا د متو زور پر ګوری غر د او درّوی په ورانديے

اے چه خان ته مېن وائے يو ازميخت کوی درباندے(۲)

(اگر تو شریعت کا شیدائی ہے۔ تو شرع تیری قوتِ بازو کو آزمانے کے لیے تیرے سامنے پہاڑ کھڑا کر دیتی ہے) "اے چه خان ته مېن وائے" (اے جو اپنے آپ کو شیدائی کہتا ہے) اضافی ہے۔ جس نے شعر کو دلفریب اور دلکش بنا دیا ہے۔

ے آں نہالِ سربلند واستوار

مسلمِ صحرائی اشتر سوار

وہ شتر سوار صحرائی مسلمان جو درخت کی مانند سربلند واستوار تھا۔

هغه هسکے سُوکے بوټے خبن ولاړ دَ مونډ په زور

صحرائي کچ کوونکے مسلمان دَ اوښے سور(۳)

(وہ صحرا نورد شتر سوار مسلمان جو تناور درخت، جس کی شاخیں بلندیوں کو چومنے والی اور مضبوط بیخ وبن کے سہارے کھڑا ہونے والے، کی مانند تھا) پہلا مصرعہ بلند وبالا درخت کی جو شرح کرتا ہے۔ وہ پشتو روزمرہ کی حسین مثال ہے۔

ے عرض کن پیشِ خداے عزّوجل

عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

خدائے عزّوجل کے سامنے عرض کیجئے کہ میرا عشق عمل سے ہمکنار ہو۔

غنی خدائے ته لاس کړه پورته چه خما وړئ شړئ کړی

چه م عشق او عمل دواړه يو تر بل غاړه غړئي کړی(۴)

(اللہ غنی سے دعا کیجئے کہ میری اون سے (شرے) گرم چادر بنائے۔ اور میرا عشق عمل سے ہمکنار ہو۔) دونوں مصرعے پشتو روزمرہ کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ پہلے مصرعے کا دوسرا حصہ اضافی ہے۔ یعنی "خما وړئ شړئ کړئ۔" ایک قسم کی گرم

---

(۱) سمندر، بے خودی، ص ۹۸ (۲) ایضاً، ص ۱۰۶ (۳) ۱۰۷ (۴) ایضاً، ص ۱۰۷ (ا) الوند :۔ ایران کے ایک بلند وبالا پہاڑ کا نام ہے۔

چادر جو بکریوں کے بالوں (وڑغنے) سے شانی لوگ بنتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں "غاړه غړئي" (معانقہ) ایک خوبصورت اصطلاح ہے۔

علامہ اقبال نے تاریخ اسلام، شریعت اسلامیہ اور قرآن حکیم سے بے خودی کا فلسفہ اخذ کیا ہے، جس کے لیے قرآن وحدیث اور تاریخ کے واقعات سے تلمیحات کی صورت میں استنباط کیا ہے، ذیل میں سمندر کے ان خاص اشعار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جن میں تلمیحات کی طرف اشارے موجود ہیں۔

تلمیحات واشارات :۔

اہل حق را رمز توحید از بر است
در اتی الرحمٰن عبدا مضمر است

اہل حق توحید کی رمز کو خوب جانتے ہیں، یہی راز سورۂ مریم کی آیت ۹۳ میں مضمر ہے(۱)

زده کړه د خدائے دوستانو د توحید ذ رمز خبره
ده اتي الرحمن عبدا په سیپئ کښې مرغلره(۲)

(اللہ والوں نے توحید کی رمز کی بات جان لی۔ یہ آیت مذکور صدف میں موتی کی مثل ہے) مترجم نے آیت کا ترجمہ حاشیہ میں درج کیا ہے۔ صدف میں موتی ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔ جو مضمر است کا دلکش بامحاورہ ترجمہ ہے۔

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل(۳)

ہم مسلمان ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں، اگر تجھے اس بارے میں کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ تو دیکھ، قرآن مجید نے خلیلؑ اللہ کو ہمارا باپ کہا ہے۔

مونږ ځائي مسلمانان یو پلار خمونږ د خدائے خلیلؑ دے
"مِلَّتَ اَبِیکُمُ" دے له قرانه که ئے غواړې دا دلیل دے(٤)

شاعر مترجم نے آیت اور اس کا ترجمہ بھی حاشیہ میں درج کیا ہے

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست
زندگانی محکم از لاتقنطو است(۵)

کیا تمہیں معلوم ہے کہ موت کا سروسامان کیا ہے؟ یہ کہ امید کا رشتہ کٹ جائے۔ زندگی کا استحکام اسی سے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

---

(۲) سمندر، رموز بے خودی، ص ۲۳ (۴) ایضاً ص ۲۷

(۱) اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا — آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی ہے وہ اسی لیے ہے کہ اس کے آگے بندگی کا سر جھکائے حاضر ہو۔

(۳) ابیکم اشارہ ہے۔ سورۂ حج کی اسی آیت کی طرف۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ — وہ تمہارا طریقہ ہو جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا۔

(۵) سورۂ زمر کی طرف اشارہ:۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ — (اے پیغمبر کہہ دے کہ اے میرے گنہگار بندو!) اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

چه ارمان په زړه کښی نه وی مرګ دے دغه نشت بیشکه

د لا تقنطو قوت دے چه د ژوند رده کړی کلکه

(ناامیدی بے شک موت ہے۔ لا تقنطو سے زندگی کی بنیاد پختہ ہے) دوسرے مصرعے کا روزمرہ قابلِ تعریف ہے۔ شاعر مترجم نے حاشیہ میں اس آیت اور اس کا ترجمہ نقل کیا ہے۔

؎ اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر

از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر(i)

اے وہ شخص جو غم کے قید خانے میں اسیر ہے۔ جناب رسول پاکؐ کے ارشاد لا تَحزَنْ سے سبق حاصل کر۔

اے د غم په بند کښی بنده اے دغم تر لاسه خواره

لاتَحزَنْ دِولے هیر کړو تعلیم اوکړه له سرداره(۱)

(اے غم کے پھندے میں گرفتار! اے غم کے ہاتھوں خوار! سردارؐ سے لاتحزن کی تعلیم حاصل کر، یہ کیوں بھلا دیا) مترجم شاعر نے غار ثور کا سارا واقعہ حاشیہ میں بیان کیا ہے۔

؎ قوتِ ایماں حیا افزایدت

وردِ لاَ خوفٌ علیهم بایدت ii

ایمان کی قوت تیری زندگی بڑھاتی ہے۔ (اس لیے) تجھے **لا خو ف علیهم** کا ورد رکھنا چاہیے

لا ژوند مزے به د اوږ دکا د ایمان قوت کښی داشته

لا خوف علیهم وایه چه دِ خو په تن کښی ساه شته(۲)

(ایمان کی قوت یہ ہے کہ وہ تیری زندگی اور مزے بڑھادے۔ جب تک تیری جان میں جان ہے۔ **لا خوف علیهم** کا ورد کر) شاعر مترجم نے آیت اور اس کا ترجمہ بھی حاشیہ میں نقل کیا ہے۔

؎ چوں کلیمے سوئے فرعون رود

قلبِ او از لاتخف محکم شود(iii)

جب موسیٰؑ فرعون کی جانب گئے ان کا قلب لا تخف سے مضبوط ہوا۔

چه امصائے کړه اوچته په فرعون پسے ورسم شو

بس ، یو داد دَ لاتخف وه دَ کلیم زړهٔ پرے محکم شو(۳)

(i) سورۂ توبہ کی آیت :- اِذْ اَخرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا جب کافروں نے اسے (نبیؐ) اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ صرف دو آدمی تھے اور دو میں دوسرا (اللہ کا رسولؐ) تھا دونوں غار میں چھپے ہوئے تھے۔ اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا: غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(۱) سمندر در موتے خودی، ص ۳۲ (۲) ایضاً ص ۳۳ (۳) ایضاً

(ii) یہ ٹکڑا قرآن میں کئی جگہ آیا ہے مثلاً سورۂ بقرہ میں :- بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ اَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکایا اور نیک عمل کرتا رہا وہ اپنے رب سے اپنا اجر ضرور پائیگا نہ تو اس کے لیے کسی قسم کا کھٹکا ہے اور نہ غمگینی

(iii) سورۂ طٰہٰ کی اس آیت :- قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى. (جب موسیٰ نے اپنے اندر ہراس محسوس کیا) تو ہم نے کہا، اندیشہ نہ کر، تو ہی غالب رہیگا۔

(عصا اٹھا کر فرعون کے پیچھے چل پڑے۔ بس لاتخف کے سہارے کلیم کے دِل کو تقویت ملی۔)

؎ تارکِ آفل براہیم خلیل
انبیا را نقشِ پائے او دلیل

غروب ہو جانے والوں (سورج چاند ستارے) کو ترک کر دینے والا ابراہیم جن کا نقش پا انبیا کے لیے رہنما ہے۔

د آفلو پریښېدونکے ابراهیم د خدائے خلیل دے
چه ئے په سمه لاره پلونه وَ نبیانو ته دلیل دے

(ترکِ آفل ابراہیم خلیل اللہ ہیں جن کے صراطِ مستقیم پر نقشِ پا انبیا کے لئے دلیل ہے)

؎ آں خدائے لم یزل را آیتے
داشت دردل آرزوئے ملتے(i)

وہ خدائے لازوال کی آیت تھے۔ وہ بھی اپنے دل میں ملت کی آرزو رکھتے تھے۔

خدائے به تل وي داخلیل ئے یوه نخښنه د قدرت وه
او ارمان دده' په زړه کښ د یوښه پتمن ملت وه (۱)

دوسرے مصرعے میں "یوښه پتمن ملت" (ایک اچھی غیر تمند ملت) ایک خوبصورت روزمرہ ہے۔

؎ جوئے اشک از چشمِ بے خواب چید
تا پیامِ طَهِّر بَیْتی شنید(ii)

دواړه سترگے ئے تل روانے نه' ئے خوب نهٔ ئے آرام وه
چه طَهِّر بَیْتی راغلو دَ الله خنے پیغام وه (۲)

مترجم نے حاشیہ میں آیت لکھ کر ترجمہ بھی تحریر کیا ہے۔

؎ بہر ما ویرانہ آباد کرد (iii)
طائفاں را خانہ بنیاد کرد

(i) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد ڈال رہا تھا اور اسماعیل بھی شریک تھا۔ دل و زبان پر یہ دعا جاری تھی: اے پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلا شبہ تو ہی ہے۔ جو دعاؤں کا سننے والا اور دنیا بھر کی مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! ہمیں سچے مسلم ہونے کی توفیق دے اور ہماری نسل میں سے ایک ایسی امت پیدا کر دے، جو تیری فرمانبردار ہو۔

(۱) سمندر، بے خودی، ص ۳۴ (۲) ایضاً ص ۳۵

(ii) سورۂ بقرہ کی آیت :۔ وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ ہمارے نام جو گھر بنایا ہے۔ اسے طواف کرنے والوں کے لیے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ پاک رکھ۔

(iii) ویرانہ آباد کرد :۔ اشارہ ہے سورۂ ابراہیم کی اس آیت : رَبَّنَآ اِنِّىٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ اے ہم سب کے پروردگار! ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں۔ میں نے اپنی بعض اولاد تیرے گھر کے پاس لا کر بسائی ہے۔

ہماری خاطر انھوں نے ویرانہ آباد کیا اور طواف کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے گھر کی از سرِ نو تعمیر کی۔

دہ ځمونږ د خیر دپارہ ورانہ شاړہ کړہ آبادہ
دہ طواف تہ د قامونو د خدائے خونہ کړہ بنیادہ(۱)

؎ تا نہالِ تب علینا غنچہ بست (i)
صورتِ کارِ بہارِ ما نشست

تب کہیں جا کر تُب علینا کے درخت سے کلی پھوٹی (اور) ہماری بہار کی صورت رونما ہوئی۔

پہ آخر کی د تُب علینا بوټے شولو سترګے سترګے
یا ځمونږ د سپرلی بادکړو باغ دګلو سترګے سترګے(۲)

شاعر مترجم نے حاشیہ میں آیت اور ترجمے کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔

؎ امتش در حرزِ دیوارِ حرم
نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم(ii)

نبیؐ کی اُمت دیوارِ حرم کی پناہ میں ہے اور اس طرح نعرہ زن ہے جیسے شیر جنگل میں۔

دَ رسولؐ امت دننہ پناہ ځائے د حرم تل کښں
د تکبیر کوی عږونہ لکہ‌وی زمری ځنګل کښں(۳)

شاعر مترجم نے اس شعر کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ صرف لفظی ترجمہ ہے۔

؎ لا نبی بعدی ز احسان خدا است(iii)
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است

پیغمبر پاکؐ کے بعد کسی اور نبی کا نہ آنا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ اس سے ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ کا تحفظ ہے۔

ګلہ! " لاَ نبیَّ بَعدِی " دا دَ پاک اللہ احسان دے
د نبیؐ دَ دین ناموس تہ دہ پردہ عزت اوشان دے(۴)

مترجم شاعر نے حاشیہ میں " لاَ نبیَّ بَعدِی " کا صرف ترجمہ کیا ہے۔ حدیث کا حوالہ نہیں دیا۔

؎ مرسلانِ انبیا آبائے او
اکرم او نزدِ حق اتقائے او(iv)

(i) جس آیت کا ٹکڑا یہ سلسلہ رموزِ ملت نقل ہو چکا ہے۔ اس کا باقی ٹکڑا یہ ہے: وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم اے خدا ہمیں ہماری عبادت کے سچے طور طریقے بتادے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر۔ بلاشبہ تیری ذات ہے۔ جو رحمت کی بدولت درگزر کرنے والی ہے۔ اور جس کی رحمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں۔

(ii) قصیدہ بردہ: ۔ اَحَلَّ اُمَّتَہٗ فِی حِرزِ مِلَّتِہٖ کالّلیث حل مع الاشبال فی اجم (رسولؐ نے اپنی امت کو ملت کے حصار میں بٹھا دیا۔ جس طرح شیر جنگل میں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔

(۱) سمندر، رموزِ بے خودی، ص ۳۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً ص ۳۷ (۴) ایضاً، ص ۵۰

(iii) انا خاتم النّبیین لا نبی بَعدِی میں خاتم الانبیاء ہوں، میرے بعد کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا۔ (حدیث)

(iv) سورۂ حجرات کی یہ آیت: ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

انبیاء و رُسل اِس امت کے آباء ہیں۔ اس امت کے متقین اللہ تعالیٰ کے ہاں معززین ہیں۔

غور نیکو نه ئے نوم وړی انبیاء او مرسلان دی
په آکرم ئے خدائے بللی پرهیزګاره متقیان دی

شد اسیر مسلے اندر نبرد
قائدے از قائدان یزد جرد(i)

جنگ کے دوران یزد جرد کے سپہ لاروں میں سے ایک سپہ لار مسلمان کے ہاتھوں قیدی بن گیا۔

جنګ د حق او د باطل وه د یخوا نور اخوا انګار وه
یو غازی زمری راګیر کړو دایران سپاه سالار وه(۱)

(حق وباطل کی لڑائی میں ایک طرف نور اور دوسری طرف نار تھا ایک غازی نے (مجاہد) شیر کو گرفتار کیا جو ایران کا سپہ سالار تھا) شاعر مترجم نے نور، نار اور شیر کے اضافے کے ساتھ ترجمہ کیا لیکن یزد جرد کو نظر انداز کیا۔

چوں دُرفش کاویانی چاک شد(ii)
آتشِ اولاد ساساں خاک شد

جب درفش کاویانی (ایرانی جھنڈا) چاک چاک ہو گیا اور ساسانیوں کی آگ بجھ گئی۔

شوه جهنډه دَایران کوزه آخر فتح دا میدان شو
دَ ساسان دَ اولاد اور وه د سرو ایرو ډیران شو(۲)

(ایران کا جھنڈا گرایا گیا اور آخر میدان فتح ہوا۔ ساسانیوں کی اولاد کی آگ ٹھنڈی راکھ کا ڈھیری بن گئی) مترجم شاعر نے درفش کاویانی کی وضاحت نہیں کی

گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوۃ(iii)
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات

قاضی نے کہا۔ زندگی کا دار و مدار قانونِ قصاص پر ہے۔۔ اسی قانون سے زندگی استحکام پاتی ہے۔

قاضي اووے چه سلطانه حکم فی القصاص حیٰوة دے
چه په دے قانون چلیږی هغه ژوند لره ثبات(۳)

(i) یزد جرد :۔ ایران کے بادشاہ کا نام، جو ۲۳۲ھ میں تخت نشین ہوا۔

(i) سمندر، رموزِ بے خودی، ص ۵۳ (۲) ایضاً ۵۷ (۳) ایضاً ص ۳۱

(ii) جب ضحاک کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو کاوہ نامی ایک لوہار نے اپنے چرمی (کھال) سے لباس کے ایک ٹکڑے کو علم پر لگایا اور ملک میں عام بغاوت پھیل گئی۔ بعد میں ایرانی فرمانبرداروں نے اسکی یاد کے طور پر اپنے قومی جھنڈے کو درفشِ کاویانی کہہ کر پکارا۔ درفش یعنی کپڑے کا نکون ٹکڑا جس پر سنہری طلائی کام ہوا ہو (حوالہ سید عابد علی، تلمیحات اقبال، بزم اقبال لاہور، طبع دوم، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۷۸۳)

(iii) سورہ بقرہ کی آیت :۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ اور اے اربابِ دانش! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔

؎ اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر

معنئی ذبح عظیم آمد پسر

ان کے والد (حضرت علیؓ) بائے بسم اللہ کا ساتھا اور سیدنا حسین ذبحِ عظیم کی تعبیر ہیں۔(i)

دَ پلار شان ته خوئے وگورہ لکه "بے" دَ بسمِ اللّٰه وه

د خوئے شان ئے خوسرہ لوئے دے د ذبح عظیم معنے وه(۱)

لفظی ترجمہ ہے لیکن حاشیہ میں آیت اور اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

؎ بہر آں شہزادۂ خیرا لملل

دوش ختم المرسلین نعم الجمل(ii)

بہترین امت (امت مسلمہ) کے اس شہزادے کے لیے نبی کریمؐ ختم المرسلین کا دوش مبارک سواری تھی اور کیا اچھی سواری تھی۔

چه دے خیر ذأمتونو د هغه د سترگو تور دے

چه خاتم دے دَنبیانو ذهغه د اوږ و سور دے (۲)

ترجمہ لفظی ہے اور حاشیہ میں نعم الجمل کی وضاحت بھی نہیں ہے۔

؎ پیشِ پیغبرؐ چو کعبِ پاک زاد

ہدیۂ آورد از بَانَتَ سُعَاد(iii)

جب حضرت کعبؓ نبی کریمؐ کی خدمت میں قصیدہ بانت سعاد لکھ لائے۔

کعبؓ راغلو پیغمبرؐ ته چه ئے پر یښولو عناد

دۀ لیکلی قصیده وه نوم ئے وه بانت سعاد(۳)

کعبؓ پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دشمنی چھوڑ دی۔ قصیدہ موسوم بَانَتَ سُعَاد لکھ کر لائے۔

مترجم نے حاشیہ میں تفصیل فراہم کر دی ہے۔

؎ جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز

بود اندر آب و گل آدم ہنوز(iv)

آپؐ کا جلوہ اس وقت بھی فرشتوں کے سینوں کو گرما رہا تھا جب آدم کا بدن تخلیق کے اولین مراحل میں تھا۔

---

(۱) سمندر، رموزِ بے خودی، ص ۴۵ (۲) ایضاً ص ۴۴ (۳) ایضاً ص ۷۱

(i) حضرت علیؓ بسم اللہ کی ب تھے اور ان کے بیٹے امام حسینؓ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (اور ہم نے ایک بھاری قربانی کو اس کا فدیہ کر دیا، سورہ صفٰت) کا مطلب بن گئے

(ii) نعم الجمل :۔ ایک روایت کی طرف اشارہ ہے۔ ایک موقع پر رسولؐ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو دونوں کندھوں پر اٹھائے لیے جا رہے تھے کہ کسی نے کہا" نعم الجمل" یعنی کتنی اچھی سواری ہے۔ فرمایا "سوار بھی تو اچھے ہیں" بحوالہ مولانا غلام رسول مہر از مطالب اسرار و رموز۔

(iii) حضرت کعبؓ آپؐ کو بہت دکھ دیتے تھے، فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے پھر اسلام قبول کر لیا۔ وہاں سے مشہور قصیدہ بانت سعاد لکھ کر لائے اور معذرت چاہی۔ جس کے صلے میں آپؐ نے اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔ امیر معاویہؓ نے بڑی قیمت دے کر لے لی تھی۔ خلفاء اسے عیدین کے موقع پر اوڑھا کرتے تھے۔

(iv) ایک حدیث "کُنْتُ نَبِیاً وَّ اٰدَمَ بَیْنَ الماء والطین" (میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم مٹی اور پانی کے درمیان تھے) لیکن یہ حدیث ثابت نہیں (مولانا غلام رسول)

لاَ په خاورو په اوبو کښې آدم پروت وه چرته لرې
چه لیوالو فرښتو کړې د هغه ذ نور خبرې

شاعر مترجم نے حدیث کی تحقیق میں کاوش نہیں کی۔ حاشیہ میں حدیث اور ترجمہ نقل کیا ہے۔

؎ آں کہ در قرآں خدا اوراستود
آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود(i)

آپؐ کی یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں آپؐ کی تعریف فرماتے ہیں اور آپؐ کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں

هغه ذات چه په قرآن کښې خدائے کوی دکوم صفت
چه الله ئے ژبه کړی ده د سر د حفاظت(۱)

مترجم شاعر نے قرآنی آیت کی کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ حاشیہ میں کوئی حوالہ دیا

؎ اُمیؐ پاک از ھویٰ گفتارِ او(ii)
شرحِ رمزِ ماغویٰ گفتارِ او(iii)

آپؐ ایسے امیؐ ہیں جن کی گفتار ہوائے نفس سے پاک ہے۔ اور رمز ماغویٰ کی شرح۔

اُمیؐ هغه چه گفتار ئے پاک وينزلے له هوىٰ دے
امی هغه چه ئے خبرے بنه تفصيل ذ ماغوىٰ دے(۲)

سمندرؔ نے آیت اور ترجمے کیئے ہیں لیکن حوالہ نہیں دیا ہے۔ جہاں بھی انھوں نے ترجمہ کیا۔ حوالہ نہیں دیا

املا کی غلطیاں

صفحہ	غلط	صحیح	صفحہ	غلط	صحیح
۵۴	احوا	آخوا	۱۰۹	غوندے	غونڈے
۷۲	طاقت	طاعت	۱۱۰	واوَه	واڈره
۸۸	تفوص	تپوس	۱۳۷	تسحیر	تسخیر
۸۸	خکلے	ښکلے	۱۴۸	پائیداری	پائیدار
			۱۵۵	عرت	عزت
			۱۸۲	پوته	پورته
			۱۹۷	کره	کړی

(i) سورۂ مائدہ کی آیت :۔ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اور اللہ تمہیں انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

(ii) سورۂ نجم کی آیت :۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۔اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو وحی ہے بھیجی ہوئی۔

(iii) سورۂ نجم کی آیت :۔ مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی بھٹکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا۔

(۱) سمندرؔ، د رموزِ بے خودی، ص ۷۵ (۲) ایضاً ص ۱۳۳

ب

کتاب :- **اسرارِ خودی** (۱۹۱۵ء)

مترجم :- سمندر خان سمندرؔ

ناشر :- پاکستان پبلیکیشنز کراچی

سن اشاعت :- ۱۹۵۴ء

صفحات :- ۲۳۷

اسرار خودی

اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں ایک بے نظیر مقدمہ تھا، جس میں علامہ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا تھا۔ اس میں نفی خودی کے نظریہ کی ابتداء اور مسلمانوں میں اس کی اشاعت کے اسباب اور نتائج اور اسلامی تحریک کا حقیقی مقصد واضح کیا گیا تھا۔ آخر میں لفظ خودی کو تشریح درج تھی۔ مجمل ہونے کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کے سبب اس کو دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا۔ علامہ نے حافظ شیرازی کے خلاف ۳۵ اشعار لکھے اور لب ولہجہ بھی سخت تھا۔ اس سے حافظ کے مداحوں نے اقبال کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کیا۔ دوسرے ایڈیشن میں مصلحت کی بناء پر علامہ نے دانشمندی سے کام لے کر ان اشعار کو یکسر حذف کر دیا۔ اور اسکی جگہ "اصلاح ادبیات اسلامیہ اور حقیقت شعر" کا عنوان شامل کیا۔

مثنوی کا ماخذ قرآن کریم اور مثنوی مولانا روم دو کتابیں ہیں۔ یہ گوسفندی نظریہ، عجمی تصوف اور وحدت الوجود کو توحید قرار دینے کے خلاف کاری ضرب ہے۔ ساری مثنوی خودی کی تفسیر و تشریح ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط محررہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء میں علامہ تحریر کرتے ہیں :۔

> "یہ مثنوی جس کا نام اسرار خودی ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضہ میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی۔ بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہولے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔"(۱)

خودی ہی وہ عرفان ذات و نفس ہے۔ جو افراد و اقوام کی زندگی کی ضامن اور انسان کو بلند ترین مادی و روحانی مدارج پر پہنچانے کی کفیل ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم رہے، بلکہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے، جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آسکتا۔

اسرار خودی میں تمہید، نظامِ عالم کی بنیادِ، خودی اور عشق و محبت، خودی اور سوال، خودی اور نظام عالم، مغلوب قوموں کے مخفی حیلے، افلاطون اور مسلکِ گوسفندی، حقیقت شعر اور اصلاحِ ادبیات، تربیت خودی کی منزلیں وغیرہ عنوانات کے تحت خودی کی تشریح کی گئی ہے۔ علامہ نے دیکھا کہ مسلمان افلاطونی (گوسفندی) فلسفے کی تقلید میں بے عملی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ وحدت الوجود، عجمی تصوف، رُہبانیت اور پیرپرستی جیسے باطل نظریات اسلام کی اصل روح کو محو کر رہے ہیں، چنانچہ اقبال سے مسلمانوں کی یہ بے عملی، گمراہی اور زبوں حالی برداشت نہ ہو سکی اور انھوں نے اسرار خودی لکھ کر تمام باطل عقائد کا قلع قمع کر دیا۔

محی الدین ابن عربی نے نظریہ وحدت الوجود کی بنیاد ڈالی، جس کے مطابق کائنات کی روح میں انسان کا جذب ہونا ضروری ہے۔ یعنی انسانی نجات کے لیے خودی کی نفی ضروری ہے۔ اس نظریے کے مطابق دنیا میں اصل وجود صرف ایک ہے۔ یہ کائنات میں مختلف رنگوں اور شکلوں میں پایا جاتا ہے، وجود کا کمال یہ ہے کہ مختلف قیود سے آزاد ہو کر وجودِ مطلق میں فنا ہو جائے اور فنا کا یہ نظریہ

---

(۱) جاوید اقبال، زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص ۲۰۲ / "صحیفہ" اقبال نمبر (حصہ اول) مجلس ترقی ادب لاہور کا علمی مجلہ، ص ۱۶۸، ۱۶۹

اقبال کو اسلامی تعلیمات کے خلاف دکھائی دیتا ہے۔ ابن تیمیہ نے اس نظریے پر کاری ضرب لگائی۔ امام غزالی، حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اس نظریے کے خلاف وحدت الشہود کے قائل تھے۔

علامہ اقبال نے "خودی" کا تصور مسلمان صوفیا و حکماء کے افکار سے اخذ کیا۔(۱) خودی وجدان کی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر انسانی روح کو اپنے آپ اور مقصودِ زندگی سے شناسائی حاصل ہوتی ہے اور فطری و دینی عظمت کا احساس ارزانی ہوتا ہے۔ یہ وہ استقلالِ ذاتی ہے جو ہر مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے۔ خدا، خودیِ مطلق ہے اور خودی کا سب سے بڑا منبع۔ کائنات کی ہر چیز میں خودی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ چھوٹی خودی والے اجسام بڑی خودی والے اجسام کے گردش کرتے ہیں۔ چاند زمین کے گرد اور زمین سورج کے گرد حرکت کرتی ہے۔ اس طرح تمام کائنات کو اشرف المخلوقات کا تابع کر دیا گیا ہے۔ کائنات میں فرمانبرداری کا یہ عمل اطیع اللہ و اطیعو الرسول پر دلالت کرتا ہے۔

عبادات خودی کی نشوونما کا قوی وسیلہ ہیں۔ وجدان، اخلاقی و روحانی تعبیرات و اقدار کی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن ان تمام کی بنیاد عشق پر قائم ہے۔ مردِ مومن کا وجود استحکامِ خودی کے بغیر ممکن نہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کے مراحل طے کرنے کے لیے بے پناہ عشق کی ضرورت ہے۔ انبیائے کرام کی خودی بے پناہ عشق کے سبب مستحکم ہوئی تھی۔ صدقِ خلیلؑ، صبرِ حسینؓ اور معرکۂ بدر و حنین وغیرہ عشق کی مختلف صورتیں ہیں۔

خودی علامہ اقبال کے پیغام کا خلاصہ اور اس کے افکار و تصورات کا مرکز ہے۔ اسرارِ خودی کے علاوہ شذراتِ فکرِ اقبال، ڈاکٹر نکلسن کے نام خط، پیامِ مشرق کی رباعیات، زبورِ عجم کے گلشنِ رازِ جدید، جاوید نامہ کی بعض منظومات، ضربِ کلیم کی بعض نظمیں، بالِ جبریل کی غزلیات اور ارمغانِ حجاز کی تصویر و مصور نظم اور رباعیات میں خودی کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ نظم "ساقی نامہ" میں خودی کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

انسانی شخصیت کی تین حالتیں ہیں۔ بشریت، ملکیت و نورانیت اور مظہریت۔ بشریت وجودِ خاکی سے عبارت ہے، یہ انسانی شخصیت کا ظاہر ہے۔ اس کی بنیاد پر انسان عالمِ خلق سے متصف ہو جاتا ہے۔ ملکیت و نورانیت ہر انسانی شخصیت کا باطن ہے۔ جو روح سے عبارت ہے۔ اور اس کی بنیاد پر انسان عالمِ امر سے متصف ہوتا ہے۔ مظہریت، انسان کے باطن کا بھی باطن ہے۔ اور یہ وہ جلوہ گاہ حقیقت ہے کہ انسان تمام تعینات کی جہتیں کھو کر ذاتِ مطلق کے حسن میں گم ہو جاتا ہے۔ اِن تین مدراج میں انسان کی ناسوتی، ملکوتی اور لاہوتی شخصیتیں تشکیل پاتی ہیں۔ اِس ارتقائی منزل کی آخری کڑی کو اقبال طائرِ لاہوتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی شخصیت اگر اپنے مقصود و کمال کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تو اُسے بشریت اور ملکیت کے تعینات سے بھی باہر آنا پڑے گا۔(۲)

انسانی نفسیات کی بھی تین حالتیں ہیں۔ خاکی، نوری اور حقیقی۔ اقبال کا آدمِ خاکی ارتقاء کی منزلیں طے کر کے نفسِ امارہ سے اٹھتا ہے۔ نفسِ ملہمہ پر جاتا ہے۔ اور نفسِ لوامہ پر جا کر رکتا ہے۔ نفسِ امارہ برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ ملہمہ پر خیر و شر میں تمیز ہو جاتی ہے۔ اور لوامہ پر آدمِ خاکی کا نفس لعنت و ملامت شروع کر دیتا ہے۔ جب آدمِ خاکی نوری کے دور میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں تعین ملکیت

(۱) ڈاکٹر نکلسن کے نام خط حوالہ شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ، شیخ محمد اشرف، تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، حصہ اول، ص ۴۷۶

(۲) وحید عشرت، مرتب، اقبال ۷۵، طبع اوّل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۹ء

کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مقام پر نفسِ مطمئنہ ، نفس راضیہ اور نفسِ مرضیہ کے مراحل طے کرتا ہے۔ پہلے مرحلے پر آدمِ نوری، تقوٰی پرہیزگاری کو اپنے اندر جاگزیں کرنے لگتا ہے۔ نفسِ راضیہ کے مقام پر ہر حال میں اپنے رب کریم کے پانے کا طلبگار رہتا ہے۔ مرضیہ کے مقام پر خدا کی ذات بھی بندے کو راضی کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ نفسِ راضیہ طالب اور نفسِ مرضیہ مطلوب بن جاتا ہے۔ نفسِ راضیہ محبّ اور نفسِ مرضیہ محبوب بن جاتا ہے۔ انسان یہ مدراج طے کرنے کے بعد آدمِ حقیقی کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر انسان کا نفس، نفسِ کاملہ بن جاتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةِ اِرْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥

یہ وہ مقام ہے جہاں عالمِ بشریت اور عالمِ ملکوت اسکی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔ یہاں خدا کی ذات اپنے جلوؤں سے آشنا کرتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں عالمِ حقیقی کی منزل پاکر دیدارِ خویش نصیب ہوتا ہے۔ انسان معرفتِ نفس کے مقام پر فائز ہو جائے تو اِس سے معرفت حق کی راہ نکلتی ہے۔ اس قول "مَنْ عَرَفَہ نَفْسَہُ فَقَدْ عَرَفَہ رَبَّہُ " کے مطابق جب خود کو تلاش کرتے ہیں تو ذاتِ حق کو پالیتے ہیں۔ اس لیے شخصیت کے پردوں کے تعینات سے نجات پانے اور مقامِ آدمیت کے حصول کے لیے عقل نہیں بلکہ عشق و محبت کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

اس مقام پر خدا اس کے کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ اللہ اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اللہ اس کے ہاتھ بن جاتا ہے جس سے بندہ گرفت کرتا ہے۔ اللہ اس کا دل بن جاتا ہے جس سے بندہ ارادہ کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مردِ مومن کی ایک نظر سے دنیا کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ شر کی قوتیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ حق و صداقت کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ باطل مٹ جاتا ہے۔ اور وہ بنی نوعِ انسان کے لیے سراپا خیر و برکت کا بیش قیمت متاع بن جاتا ہے۔

دیباچہ از سمندر (خلاصہ) :-

سمندر خان سمندر نے اسرار خودی کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کا دیباچہ بھی خود تحریر کیا۔ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔
خودی علامہ اقبال کی تعلیمات کا مرکز ہے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اس کے مترادفات بالترتیب میں، من، انا اور Ego ہیں۔ یہ وہ شیطانی خودی نہیں جو ہوس، کینہ اور بغض سے عبارت ہو بلکہ علامہ اور مولانا روم عرفانِ نفس کے لیے قوتِ تسخیر، قاہری اور جابری چاہتے ہیں تاکہ انسان کی بے عملی اور سستی جاتی رہے اور وہ صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو کر معراجِ آدمیت پر فائز ہو سکیں۔ جلال و جمال اور قاہری و دلبری لازم ملزوم ہیں۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم گر عاشق نباشد کافر است

مسلمان کی فطرت عشقِ الٰہی سے قاہر ہے (غلبہ پاتی ہے)۔ اگر مسلمان عاشق نہیں تو وہ کافر ہے۔

مسلمان د عشق له تاوه تل بے باکه هم قاهر دے
مسلمان چه عاشق نه وی مسلمان نهٔ دے کافر دے(۱)

انسان دنیا کا ایک فعال فرد ہے۔ زندگی کے یہ ہنگامے، سائنسی ایجادات و کمالات اور تغیرات انسان کے دم سے ہیں۔ وہ اپنے شعور اور علم و عمل کے ذریعے کائنات کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتا ہے۔ تاکہ اپنے داخلی جوہر کو بروئے کار لا کر ارفع مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ یہی جوہر اقبال کی خودی کہلاتا ہے۔ جوں جوں اس کے ممکنات ظاہر ہوتے ہیں یہ مستحکم ہوتی جاتی ہے۔

از محبت اشتعالِ جوہرش
ارتقائے ممکناتِ مضمرش

محبت ہی سے اس کا جوہر نکھرتا ہے اور محبت ہی سے اس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

هم د مینے له اثره سره لنبه ددے جوهر شی
چه ئے پټ څه ممکنات دی ورو ورو وده کړی بهرشی(۲)

عشق خودی کی حقیقت و ماہیت اور اس کے ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے۔ یہ خودی نقطۂ نور ہے، یہی ہمارے بدن میں زندگی کا شرر ہے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

چه پوهان ئے خودی بولی ده نقطه د نور بلیږی
دا سپرغۍ د ژوندانهٔ ده څموږ خاوره کښې ځلیږی(۳)

افراد کے روزگار حیات کی تن آسانی میں غربت و رہبانیت، انسانیت کے مرقات بن جاتے ہیں۔ انہی میں عجمی تصوف اور بدعات و ظلمات جنم لیتے ہیں، جس کے اثرات زائل کرنے کیلیے اقبال خودی کا درس دیتے ہیں۔ مسلمان کو اس کے لیے اطاعت، ضبط نفس، اور نیابت الٰہی کے مراحل سے گزرنا ہے۔ ______ اقبال کے ہاں وقت کاٹنے والی تلوار ہے، یہ تخلیقی ارتقاء، وجود کی حقیقت اور خودی کا نام ہے۔ زمانہ تخلیقی حرکت ہے۔ جو کبھی چوب کلیم اور کبھی سیف علی کے روپ میں نمودار ہوتا ہے۔ حدیث قدسی ہے۔ لَا تَسُبُّو الدَّهْرَ فَاِنِّي اَنَا الدَّهْر(۴) قوت حیات کو وسعت دینے میں مصروف عمل اور خودی میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے والے انسان کا زمانہ امروز و فردا سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دن رات میں مقید غلام ہے۔ حُر اس بند ھن سے آزاد اور تسخیر کائنات کا فریضہ انجام دیتے ہوئے دنیا کو اسلام اور حریت کی تعلیم دیتا ہے۔

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۱۸۸

(۲) ایضاً، ص ۶۸ (۳) ایضاً،

(۴) یُؤذِینِي ابنُ ادمَ یَسُبُّ الدَّھرَ وَاَنَا الدَّھرُ بِیدِ الاَمرُ یُقَلِّبُ اللَّیلَ وَالنَّھار حوالہ مشکوٰۃ المصابیح، نور محمد، تجارت کتب خانہ دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۱۳

ترجمے کا تعارف :۔

سمندر نے اسرار خودی کا ترجمہ کر کے پشتونوں کو اقبال کے ابدی پیغام سے روشناس کیا۔ یہ کام اتنا آسان اور سادہ نہ تھا۔ اقبال جیسے بڑے عالم اور فلسفی شاعر کے فلسفیانہ اور متصوفانہ کلام کی پیچیدگی بعید از قیاس نہیں۔ اس کے لیے قرآن اور فلسفۂ اقبال سمجھنا ضروری ہے۔ مترجم نے پوری کوشش کی ہے کہ اسرار کا ترجمہ سلیس، سادہ اور بامحاورہ ہو۔ اس لحاظ سے اکثر اشعار کے ترجمے مثالی اور دلکش ہیں کیونکہ انھوں نے اقبال کے مفہوم کو منظوم پشتو میں نہ صرف پیش کرنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے بلکہ اس میں روزمرہ کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔

؎ پیر رومی خاک را اکسیر کرد

از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

خما تن وہ سپیرے خاورے دَروم پیر لکہ کیمیا کڑے

دہٗ خما لہ تورو خاؤرو رنڑاګانے راپیدا کڑے(۱)

ترجمہ زیادہ تر خوبصورت اور دلکش ہے۔ بحرین مختصر اور چست ہیں۔ شعر کے مصرعوں میں توازن قاری کا دل موہ لیتا ہے۔ لذت ورعنائی اور سرور وتُرد ترجمے کی جان ہیں۔

راہبِ دیرنہ افلاطوں حکیم

از گروہ گوسفندانِ قدیم

حکیم افلاطون جو ایک قدیم زمانے کا راہب ہے، وہ اپنے عہد کے گوسفندوں کے گروہ میں سے تھا۔

افلاطون یو زوڑ راھب وہ فلسفے تہ ئے کبنیښوے جڑے

بوډا ګکہ دَ زوړ کنډک وہ وے بنکرونوئے کڑے دڑے (۲)

(افلاطون ایک پرانا راہب، اس نے فلسفے کی بنیاد رکھی۔ وہ ایک پرانا مینڈھا قدیم ریوڑ کا تھا۔ وہ بہت پرانا اور تجربہ کار تھا)"بنکرونو ئے کڑے دڑے" خوبصورت محاورہ جو نہایت قدیم اور تجربے سے عبارت ہے۔

جب مثالی اور بامحاورہ ترجے کے معیار کو سامنے رکھا جائے اور اسی کسوٹی پر اسرار خودی کے تمام ترجے کا جائزہ لیا جائے تو بعض مقامات پر مترجم نے اقبال کے کلام کا مفہوم سمجھنے میں دھوکہ کھایا ہے۔ اور ترجمہ غلط، مشکوک اور پھیکا ہو کر رہ گیا ہے۔

؎ شعلۂ آبے کہ اصلش زمزم است

گر گدا باشد پرستارش جم است

وہ آتشیں شراب جس کی اصل زمزم سے ہے، اس کا چاہنے والا اگر گدا بھی ہو تو وہ بادشاہ ہے۔

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۴۳

(۲) ایضاً، ص ۱۰۵

هغه اوبه چه تر شغلے ځی او چه اصل ئے زمزم دے
که ئے څښونکے ګدا هم وی نو په خدائے ګو شاعالم دے[1]

شعلۂ آب سے مراد آتشیں شراب ہے۔ جبکہ مترجم نے لفظی ترجمہ (پانی کا شعلہ) کر کے دھوکہ کھایا ہے جو کہ غلط ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود بھی ترجمہ معیار سے ساقط نہیں سمجھا جاسکتا، کیونکہ خوبیاں ترجمے کی خامیوں پر بھاری ہیں اور ہم ترجمہ اور مترجم کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ پشتو زبان و ادب میں ایسا بہترین شاعر نہیں جو اس سے دلکش ترجمہ پیش کر سکے۔

﴿...ترجمے کا تفصیلی جائزہ...﴾

ے اعتبارِ کوہ بخشد کہ را
قوتِ شیراں دہد روباہ را

یہ (شراب) تنکے کو پہاڑ کا وقار عطا کرتی ہے۔ اور لومڑی کو شیروں کی قوت بخشتی ہے

چه شعله ئے د مچ وزر هم درونډ په ځائے لکه دغر کړی
چه قوت د شنو زمریو ګیدړانو ته هم ورکړی[2]

(جس کا شعلہ مکھی کے پر کو پہاڑ جیسا بھاری کر دے اور جو گیدڑ کو سبز شیروں جیسی قوت بخش دے) ظاہر ہے کہ ترجمے میں شعلہ اور سبز کے الفاظ اضافی ہیں۔ "تنکے" کے لیے "مکھی کا پر" کا استعمال خوش آئندہ ہے لیکن غضب یہ ہے کہ بحر کی طوالت سے شعر پر نثر کا گمان ہوتا ہے۔

ے تنگ دل از روزگارِ قومِ خویش
از ستم ہائے ہزبراں سینہ ریش

(وہ زیرک اور معمر بھیڑ) وہ اپنی قوم کے حالات سے بہت پریشان ہوئی۔ شیروں کے ظلم سے اس کا سینہ زخمی ہو گیا۔

د خپل قام په غم غمژنه دغه نیا وه د اوریو
خر او څکه پر حرام شول له ظلمونو د زمریو[3]

(وہ بھیڑوں کی نسل کی دادی اپنی قوم کے غم پر غمناک تھی۔ شیروں کے ظلم و ستم سے اس پر چرنا اور چکھنا حرام ہوا) شاعر نے مفہوم سمجھانے میں فراخدلی سے کام لیا ہے۔

ے جملہ عالم ساجد و مسجود عشق
سومناتِ عقل را محمود عشق

(۱) سمندر، اسرارِ خودی، ص ۴۱
(۲) ایضاً، (۳) ایضاً، ص ۹۶

ساری دنیا عشق کے سامنے سر بسجود ہے۔ عشق (محمود) ہی عقل کے سومنات کو بتوں سے پاک کرتا ہے۔

تول عالم که وه پوهیږی په سجده د عشق کښی سود دے

منم عقل سومنات دے ولے عشق ورته محمود دے(۱)

شاعر نے قافیہ پیمائی کی مجبوری میں "سود" کا لفظ استعمال کیا، جس کا کوئی ضروری مطلب اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لفظ نے مفہوم کے سمجھنے میں جو الجھن پیدا کی وہ ظاہر ہے۔ ذیل میں ایسے ترجمہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن میں اصلاح کی گنجائش ہے۔

مشکوک تراجم :۔

؎ تابکے چوں غنچہ می باشی خموش

نکہت خود را چو گل ارزاں فروش

کب تک کلی کی مانند خاموش رہے گا، اپنی خوشبو کو پھول کی مانند عام کر دے۔

خوبه چپ لکه غوټئی ئے شابه تهٔ غوړیدلے ګل شه

کړه خورے وږمے ارزانے څه ورځه پکار ډبل شه (۲)

دونوں مصرے ہم وزن نہیں ہیں، اس لیے پہلے مصرے میں تھوڑی سی ترمیم کی ضرورت ہے۔

ع خوبه چپ لکه غوټئی ئے شابه تهٔ سپړدلے ګل شه

؎ حلقۂ زد نور تا گردید چشم

از تلاش جلوہا جنبید چشم

نور نے اپنی خودی سے کام لے کر حلقے کی شکل اختیار کی تو آنکھ بن گیا۔ پھر آنکھ نے جلوؤں کی تلاش میں جھپکنا سیکھا(۳)

چه په ګینړه کښی نور غونډ شو زکه شوے دلیدو سترګے

د جلوے په تلاش ګرځی مدام شوے په کتو سترګے(۴)

(جب نور حلقہ میں جمع ہوا تو دیکھنے والی آنکھیں بن گئیں۔ آنکھیں ہمیشہ جلوے دیکھنے کی تلاش میں رہیں) دوسرے مصرے میں "جنبید" کا مطلب واضح نہیں کیا، اس لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔ (د جلوؤ په تلاش ګرځی زنبوی په کتو سترګے)

؎ نے بروں از نیستاں آباد شد

نغمہ از زندانِ او آزاد شد

نے نے نیستان سے باہر نکل کر اپنی آبادی کا سروسامان کیا تو جو نغمہ اس کے قید خانے میں بند چلا آتا تھا وہ آزاد ہو گیا۔(۵)

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۲۰۸

(۲) ایضاً ص ۳۶

(۳) میاں عبدالرشید، کلیات اقبال، ص ۳٦ (۴) سمندر، اسرار خودی، ص ۵۹ (۵) غلام رسول مہر، مطالب اسرار و رموز، ص ۷۱، ۷۲

شپیلئی اووته له بنړه چه بهر شوه

پکښې سوی‌نغمه قید وه نو هغه هم شوه(۱)

دوسرے مصرعہ غلط ہے۔ کیونکہ مطلب واضح نہیں ہورہا۔ صحیح مصرع اس طرح ہوگا۔

پکښې سوی نغمه قید وه آزاد هم شوه

(په کښې سوے نغمه بنده وه رهی زرشوه)

سمندر نے بہر حال اس بات کی تگ ودو کی ہے کہ ان کا ترجمہ ہر لحاظ سے بہتر ہو لیکن بندہ بشر کا کلام عیوب سے مبرّا نہیں ہو سکتا۔ اگر چہ ان کے کلام میں کوتاہیاں ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر اشعار ایسے ہیں جن کا ترجمہ مثالی اور بامحاورہ ہے۔

بامحاورہ تراجم :۔

؎ گرم رَواز جستجوئے نو شوم

روشناس آرزوئے نو شوم

تاکہ میں ایک نئی جستجو کے راستے میں سر گرم ہو جاؤں اور اپنے آپ کو ایک نئی آرزو سے متعارف کراؤں ______

چه په نوي شوق لټون کښې بلوے پورته موتي چوکړم

چه د نوی ارمان سیند کښې ځان پخپله ورلاهو کړم (۲)

"بلوے پورته موتي چوکړم" (پانچ چڑھائے مٹھی بند کرکے) سے مراد مکمل تیاری کے ساتھ سرگرم عمل ہوتا ہے۔ دوسرا مصرعہ (نئی آرزو کے دریا میں اپنے آپ کو ڈبوؤں) بھی روزمرہ کے لحاظ سے قابل ستائش ہے۔

؎ سازد از خود پیکر اغیار را

تا فزاید لذتِ پیکار را

وہ (خودی) اپنے آپ ہی سے اپنے اغیا کے پیکر تیار کرتی ہے۔ تاکہ جدلِ باہم کی لذت بڑھے یعنی جدال وقتال اور رزم و پیکار کی لذت میں اضافہ ہو جائے۔

دا پخپله له خپل ځانه د پردو وجود پیدا کړی

چه جنګ تود شی خودنڈئے واخلی او سره دا خپله خوا کړی (۳)

دوسرے مصرعہ میں " خواسره ول "(کسی کو شکستِ فاش / نقصان دینے پر جو مسرت اور دلی تسلی ہوتی ہے) ایک دلکش محاورہ باندھا گیا ہے۔

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۶۵

(۲) ایضاً، ص ۳۲

(۳) ایضاً، ص ۵۴

ے رخشِ او در ظلمتِ معقول گم

در کہستانِ وجود افگندہ سم

اس (افلاطون) کا گھوڑا معقولات (فلسفے) کے اندھیرے میں راہ گم کئے ہوئے ہے۔ جو ہستی کے کوہستان میں عاجز ہو کر رک گیا ہے۔

داسے ئے آس پہ ترپ سیلئی شو د دنیا پہ غرونو شاړو

پہ تیارۀ د فلسفہ کبنی آدو ورک شو چرتہ لاړو(۱)

(اس کا گھوڑا بادِ تند کی طرح صحراؤں اور پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔ اور فلسفے کی تاریکی میں بالکل ہی بھٹک کر غائب ہوا۔) دونوں مصرعوں میں "ترپ سیلیئی " اور "ادو ورک شو چرتہ لاړو" خوبصورت محاورے باندھے گئے ہیں جو شعر میں حسن کا باعث ہیں۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں

می شود فرماں پزیر از دیگراں

جو اپنے اوپر حکم نہیں چلاتا، اُسے دوسروں کی حکم برداری کرنی پڑتی ہے۔

خبلو اکتوب کہ چاجورنہ کړو د خبل خان پہ دنیا باندے

لکہ خاورے بہ تل پروت وی سر د بل د پښنو د لاندے(۲)

(اگر کسینے اپنی دنیا پر اپنا حکم نہیں چلایا، وہ ہمیشہ کے لیے خاک کی طرح، اس کا سر دوسروں کے پاؤں تلے رہیگا۔ شعر میں "خبل داکتوب" ایک خوبصورت ترکیب ہے۔ "سر د بل د پښنو دلاندے" (نہایت ہی پست اور ذلیل و خوار) میں اقبال کے مفہوم پر زبردست گرفت ہے۔

ے خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں(i)

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۱۰۵

(۲) ایضاً ص ۱۱۰

(i) علامہ نے رومی کا شعر بغیر کسی تغیر کے نقل کیا ہے۔

دلبروں کا راز دوسروں کی کہانیوں میں بیان کیا جائے تو زیادہ دلربا ہو جاتا ہے۔

دا خبرے دی د نورو په بنکاره چه زه لگیا یم
دک له خونده آدم خان ته د درخئی رازونه وایم(۱)

[یہ دوسروں کی باتیں ہیں کہ میں ظاہری بتا رہا ہوں۔ آدم خان کو دُرخانئی کے لذت و سرور سے بھرے ہوئے راز بتا رہا ہوں۔ (آدم خان درخانئی کی عشقیہ داستان مشہور ہے)] شاعر مترجم نے تمثیل سے شعر کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

از خیال خود فریب و فکر خام
می کند تاراج را تسخیر نام

وہ اپنی خود فریبی اور کم فہمی کی وجہ سے، لوٹ مار کو فتح کہتا ہے۔

په خطا فکر روان دے ځان تیرباسی شائے لارته
دا ئے خومره ناپوهی ده چه تسخیر وائی ناتارته(۲)

[وہ خطا فکری میں اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہوئے راہِ راست کو پشت دکھا رہا ہے۔ یہ کتنی نادانی ہے۔ کہ ناتار (ماتم، بربریت) کو تسخیر کہتا ہے۔]

"شائے لارته" اور ناتار کے الفاظ ایسے دلکش ہیں جس نے شعر کو دیدہ زیب بنادیا ہے۔

آخری نظم" دعا" کا یہ شعر:۔

از مقدر شکوه ها داریم ما
نرخ تو بالا و نادار یم ما

ہمیں اپنے مقدر سے یہ شکوہ ہے۔ کہ آپ کی قیمت بہت بالا ہے۔ اور ہم مفلس ہیں۔

له نصیبه گیله من یو اسویلی موځی براس دے
ستا دحسن نرخ اوچت دے او خمونږ ورته تش لاس دے (۳)

ہمیں اپنے نصیب سے گلہ ہے۔ اور ہم آہیں بھرتے ہیں کیونکہ تیرے حسن کی قیمت بالا ہے۔ اور ہمارے ہاتھ خالی ہیں) شعر میں آہیں اور بھڑ اس اور حسن کے الفاظ اضافی ہیں جو شعر کی شرح میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خالی ہاتھ، مفلس کے لیے خوبصورت استعارہ ہے۔

---

(۱) سمندر، اسرارِ خودی، ص ۱۶۷
(۲) ایضاً، ص ۱۹۵
(۳) ایضاً، ص ۲۲۸

مثالی تراجم :۔

سمندر نے اکثر اشعار کا ترجمہ سلیس، سادہ اور آسان الفاظ میں کیا ہے۔ ایسا ترجمہ جہاں سلیس و سادہ الفاظ میں اقبال کے مفہوم کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے اور روزمرہ بھی صحیح ہے مثالی تراجم کے ذیل میں آتے ہیں۔

ے در جہاں خورشید نوزائیدہ ام

رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام

میں دنیا میں نیا طلوع ہونے والا سورج ہوں۔ میں نے بھی آسمان کے طور طریقے نہیں دیکھے

په دے غونده د دنیاکښې څه راغلے نوے نمریم

د آسمان له دود دستوره لاتر اوسه نهٔ خبریم(۱)

آسان، سلیس الفاظ میں شعر کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

ے نغمۂ من از جہانِ دیگر است

ایں جرس را کاروانِ دیگر است

میرے نغمے کا تعلق ایک اور ہی دنیا سے ہے، اس جرس کے لیے ایک نیا قافلہ آئے گا۔

داچه څه سندرے وایم دابه خان ته بیل جهان وی

دا د هغه جرس غږدے چه د دهٔ به بیل کاروان وی(۲)

(یہ جو میں نغمے گا رہا ہوں، یہ اپنے لیے علیٰحدہ جہاں رکھتے ہیں۔ یہ اس جرس کی آواز ہے جس کا الگ قافلہ ہوگا۔) شاعر نے اقبال کے مفہوم کو خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

ے برقہا خوابیدہ در جانِ من است

کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است

میری جان میں بجلیاں خوابیدہ ہے۔ کوہ و صحرا ہی میری تگ و تاز کے لائق ہیں۔

تندرونه تندرونه دی اودهٔ ځما په ساکښې

صحراګانے غرونه غارے څه رانغارم به بر یښنا کښې (۳)

(میری جان میں برق ہی برق خوابیدہ ہیں۔ کوہ و صحرا اور دامن کو میں اپنی چمک کی لپیٹ میں لیتا ہوں) دونوں مصرعوں کی بحریں چست اور دلکش ہیں اور روزمرہ بھی قابل تعریف ہے۔

ے پیر رومی خاک را اکسیر کرد

از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۳۵

(۲) ایضاً ص ۳۷

(۳) ایضاً ص ۳۹

پیر رومی نے میری خاک کو اکسیر بنادیا اور میرے غبار سے کئی جلوے پیدا کر دیے۔

خما تن وہ سبیرے خاورے ذروم پیر لکه کیمیا کړے

دہ خما له تورو خاوړو رنړاگانے رابیدا کړے(۱)

(میرا جسم حقیر خاک تھا، پیر رومی نے کیمیا بنادیا۔ اس نے میری بد نصیب خاک سے روشنیاں پیدا کر دیں)"سپیرے خاورے" اور "تورے خاورے" اور "کیمیا" کے الفاظ شعر کی ساخت میں ساکھ قائم کئے ہوئے ہیں۔

؎ آشنائے لذّتِ گفتار شو

اے درائے کارواں بیدار شو

لذّتِ گفتار سے آشنا ہو (کچھ کہہ)۔ تو قافلہ کے لیے بانگ رحیل ہے، اُٹھ (قافلے کو جگا)

د دنیا سره اشنا شه خوند ئے واخله وه زنگیږه

د کاروان جرسه ویښ شه څو به چپ ئے وه تنگیږه(۲)

(اے قافلہ کے جرس! دنیا کی آشنائی کی لذت لے کر جھومو۔ اے کارواں کے جرس! تو کب تک خاموش رہیگا۔ ٹنگ ٹنگ کی آواز پیدا کر۔)" زنگیږه "اور تنگیږه ایسے قافیے ہیں جن کی وجہ سے شعر میں موسیقی اور غنائیت کا رنگ پیدا ہوا ہے۔ جو بڑا دلآویز ہے۔ دنیا کے ساتھ واقفیت، اور کب تک خاموشی، کے الفاظ اضافی اور تشریحی ہیں۔ جن سے مقصد و مفہوم کی اشاعت ہوتی ہے۔

علامہ اقبال" مولانا روم کا ارشاد" کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ تو کیوں چپ بیٹھا ہے؟ بات کہنے اور پیغام پہنچانے میں بڑی لذت ہے، اس کا مزہ چکھ۔ تجھے قافلے میں جرس کی حیثیت حاصل ہے۔ تیرا منصب یہی ہے کہ خود جاگ اور دوسروں کو جگا۔ (یہاں تک وہ تلقین تھی جو پیر روم نے خواب میں شاعر تک پہنچائی)۔(۳)

؎ از رہِ عامل فقیر آزردہ رفت

دلگراں و ناخوش و افسردہ رفت

فقیر حکمران کے ہاتھوں ازردہ خاطر، رنجید، ناخوش اور افسردہ گیا۔

لاره خوشي شوه حاکم ته فقیر خاورو کښې ریمن لاړ

په خفگان او زړه ئے ډک وه رنګ ئے زیړ اومړ غیږن لاړ(٤)

(حاکم کے لیے راستہ خالی ہو گیا اور فقیر خاک آلود، خفہ، دل بھرا ہوا، رنگ پیلا اور مرجھایا ہوا چلا گیا)

علامہ نے بو علی قلندر کے ایک مرید کا قصہ رقم کیا ہے۔ جو بازار میں چل رہا تھا کہ حاکم کی سواری آئی۔ حاکم کے عامل نے ہٹانا چاہا لیکن وہ شراب معرفت میں مست تھا جس پر عامل نے اُسے سر پر رسید کیا۔ پیر سے فریاد و شکایت کرنے پر مکتوب کے ذریعے بادشاہ پر

---

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۴۳

(۲) ایضاً، ص ۴۸

(۳) غلام رسول مہر، مطالب اسرار و رموز، ص ۴۰

(۴) سمندر، اسرار خودی، ص ۹۰

کپکپی طاری کی اور معافی مانگنے پر مجبور کیا_____ مترجم کا ترجمہ آزاد، طبع زاد اور اصل مفہوم کو گرفت میں لینے کے ساتھ ساتھ اس میں دلکش اضافہ بھی کرتا ہے۔

؎ خشک سازد ہیبت او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را(i)

اس کی ہیبت سے دریا خشک ہو جاتا ہے اور وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے آتا ہے۔(غلاموں کو آزادی کی دولت سے ہمکنار کرتا ہے۔)

له هیبته که ئے خبر شے نو وچ کړس دریاب دنیل کړی
د فرعون له قیده خلاص دے و اولاد د اسرائیل کړی(۱)

ترجمے میں "وچ کړس" اور "له قیده خلاص" ایسے تراکیب ہیں جس میں روزمرہ کا پورا حق ادا ہوا ہے۔اصل مفہوم کے ساتھ وضاحت بھی موجود ہے۔

؎ خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

خاک ہونا پروانے کا مذہب ہے۔اور خاک کا باپ (ابو تراب) بن کہ یہی مردانگی ہے۔

دا دے دین د پتنګانو چه څان خاورے کړی هښیار شه
میړنتوب دسړی دادے شیر د خدائے د خاورو پلار شه(۲)

(خاک ہونا پروانے کا دین ہے۔۔ ہوشیار ہو جا کہ مردانگی شیر خدا کا ابو تراب ہونے میں ہے۔) ترجمے مین کتنی خوبصورت تلمیح بنادی گئی ہے۔ حضرت علیؓ شیر خدا لقب سے پکارے جاتے اور ابو تراب کنیت تھا۔

؎ گر خردمندی فریب او مخور
مثلِ حربا ہر زماں رنگش دگر(ii)

اگر تو عقلمند ہے۔ تو اس کا فریب نہ کھا، یہ (کمزوری) ہر لحظہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔

که ښبنتن ئے ته د پوهے نو وه نه خورے څنے تیر
د کربوړی غوندے زر زر بدلوی رنګونه ډیر(۳)

ترجمے میں الفاظ و تراکیب کی ترتیب صحیح اور محاور "وه نه خورے تیر" کی نشست درست ہے۔

(i) اس شعر میں حضرت موسیٰ کے قصے، کی طرف تلمیح
(ii) ایک قسم کا جانور (گرگٹ) جو ہر گھڑی اپنا رنگ بدلتا ہے۔
(۱) سندر، اسرار خودی، ص ۱۴۴
(۲) ایضاً، ص ۱۵۲ (۳) ایضاً، ص ۱۵۸

۔۔۔۔تراجم کا معیار۔۔۔۔

علامہ اقبال نے اسرار خودی میں بحضور رسالت مآب التجاپیش کی کہ میں جو کچھ امت محمدیہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں بلکہ جو کچھ پورے عالم انسانیت کی نذر کر رہا ہوں، وہ قرآن ہی کی روشنی میں نذر کر رہا ہوں۔ علامہ نے مولانا روم کو پیرومرشد قرار دیا ہے۔ اسرار خودی میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

پیر حق سرشت ظاہر ہوئے جنہوں نے فارسی زبان میں قرآن پاک کی حکمت بیان کی ہے۔(i)

دَ روم پیر مے پہ خوب اولید دراستئی او علم کان
داھغہ چہ ئے دے بنکلے پہ فارسئی ژبہ قرآن (۱)

پیر روم جو راست باز اور علم و حکمت کی کان تھے، کو خواب میں دیکھا، جنہوں نے فارسی زبان میں خوبصورت قرآن لکھا۔

علامہ کو مولانا جلال الدین رومی سے جو عقیدت ہے اس کی بنیاد قرآن پاک ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور دیگر تصانیف کے ذریعے مولانا کے مطالعہ کی سماجی اہمیت کو روشناس کیا ہے۔ مذکورہ مثنویاں جو آفاقی تعلیمات کی حامل ہیں مولانا رومی کے طفیل ہیں چنانچہ سید عبدالواحد فرماتے ہیں

" ان دو عظیم شعراء اور مفکرین کا مطالعہ ایک دوسرے سے علیٰحدہ ناممکن ہے۔ اقبال اور رومی دراصل ایک ہی تصویر کے دورخ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا مطالعہ دوسرے کے بغیر ناممکن ہے" (۲)

سمندر خان سمندؔر نے علامہ کی شہرۂ آفاق مثنویوں کو پشتو کا منظوم دیدہ زیب جامہ پہنایا۔ ان کی عمر چودہ برس تھی جب اسرار خودی شائع ہوئی۔ وہ پہلے پشتون شاعر ہیں جنہوں نے اقبال کے فارسی کلام کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا اور اس کے نتیجے میں وہ اثرات جو ان کے دل و دماغ پر ثبت ہوئے، ان سے ملت افغاں کو مستفید کرنے کے لیے پشتو ترجمہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اقبال کی وفات پر مرثیہ لکھا۔ چنانچہ اقبال سے یہی عقیدت و محبت ان کے ترجمے سے ظاہر ہے۔

ترجمہ ویسے بھی آسان کام نہیں اور پھر منظوم ترجمہ تو اور بھی لوہے کے چنے چبانا ہے۔ دونوں زبانوں پر قدرت و مہارت اور اصطلاحات، فکر و خیال، نظریات اور فلسفیانہ نذاکتوں کا علم ایک مترجم شاعر کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اس طرح کی کاوشوں میں سمندؔر کامیاب ہوئے ہیں۔ ترجمے کے خدوخال مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ترجمہ لفظی ہوتا ہے۔ تشریحی انداز مفقود ہوتا ہے۔ لیکن بعض الفاظ کی تشریح میں اضافی کلمات سے مترجم کا وضاحت فراہم کرنا مفہوم کو چار چاند لگانے کے مترادف ہے۔

(i) مولانا روم

(۱) سمندر، اسرار خودی، ص ۴۵

(۲) یونس جاوید، صحیفۂ اقبال، بزم اقبال لاہور، ص ۳۲۶

۲۔ شاعر کو جو ترجمہ پسند نہیں آیا۔ جس شعر کا ترجمہ اُسے معیار سے گراہوا معلوم ہوا، اس کا دوسرا ترجمہ حاشیہ میں تحریر کیا۔

۳۔ کلامِ اقبال کے حواشی کو اسی طرح حاشیہ میں پشتو کا جامہ پہنایا۔ اس کے علاوہ بھی بعض نادر الفاظ کی وضاحت حاشیہ میں دی گئی ہے۔

۴۔ شاعر نے روز مرہ محاورے کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ تشبیہات و استعارات، تمثیلات اور ضرب الامثال کا بھی بھرپور استعمال بطریق احسن کیا ہے۔

۵۔ اسرار و رموز میں چند گنے چنے اشعار ہیں۔ جو قافیہ پیمائی کی آڑ میں یا الفاظ و تراکیب کی ہیر پھیر سے مشکوک سے ہو کر رہ گئے جس کی وجہ سے اصل مفہوم تک آسانی سے رسائی حاصل کرنا معدوم ہو گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکا راقم نے بعض مصرعوں کی اصلاح کر دی، لیکن بہر حال یہ شعری ترجمے کی ازلی مجبوری ہے۔ مگر ترجمے کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ یہ کوتاہیاں معیاری تراجم کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ ترجمے کی خوبیاں، خامیوں پر بہت بھاری اور غالب ہیں اس لیے ترجمے کی ساکھ کو ٹھیس پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۶۔ طبع زاد کلام شاعر کی مرضی پر منحصر ہے لیکن ترجمہ میں دوسرے شاعر کے منتخب راستے کو مدنظر رکھنا ہے۔ ان کے مخصوص دائرے سے انحراف، اعترافِ کوتاہی کے مترادف ہے۔ یہ کام اس لیے سخت ہے کہ اس میں دوسرے شاعر کی چال چلنا ہے، کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا کے مصداق کے خلاف سمندؔر ایسی چال چلنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور وہ اسرار و رموز کے سمندر میں ایک ماہر تیراک کی طرح ایسے غوطہ زن ہوئے کہ اس کی تہہ سے بیش بہا دُرِ تابناک ساحل روہ پر لے آئے، جسکی تابناکی سے ارضِ افغان جگمگا اٹھی۔

۷۔ ترجمہ سادہ اور سلیس ہے اور علامہ کے پیچیدہ افکار کو منظوم صورت میں پیش کرنا شاعر کا کارنامہ ہے۔ اس لیے شاعر کی پرُ خلوص کاوشیں قابل تحسین و آفرین ہیں۔

۸۔ بحور چست اور مختصر ہونے کی وجہ سے ترجمے میں غنائیت کا رنگ بھرا ہوا ہے۔

۹۔ الفاظ و تراکیب اور مروزمرہ اور محاورہ کی ترتیب و نشست موزوں اور دلکش ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سمندؔر جیسا بہترین شاعر نہیں جو ایسا پرُ کیف اور دلاویز ترجمہ پیش کر سکے۔

باب دوم

بالِ جبریل

(ا) **پلوشے** (پشتو ترجمہ ۱۹۵۹ء) از عبد اللہ جان اسیر

بال جبریل پر ایک نظر ترجمے کا تفصیلی جائزہ

آزاد تراجم، مثالی تراجم

(ب) **بالِ جبریل** (پشتو ترجمہ ۱۹۶۷ء) از قاضی عبد الحلیم اثر افغانی

مترجم کا تعارف

ترجمے کی نوعیت، تفصیلی جائزہ

۱

کتاب :۔ **پلوشے** (ترجمہ بال جبریل)

مترجم :۔ عبداللہ جان اسیر

ناشر :۔ عزیزالرحمٰن ۱۳۸-ای- جہانگیر روڈ
کراچی نمبر ۵ (انجمن پریس کراچی)

سن اشاعت :۔ یکم نومبر ۱۹۵۹ء

صفحات :۔ ۲۲۶

باب دوم

---بالِ جبریل---

مترجم کا تعارف :۔

عبداللہ جان اسیرؔ موضع زیدہ ضلع صوابی میں ۱۳ جولائی ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ جماعت نہم سے شاعری کی ابتداء ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں خیر آباد سکول میں جے وی پوسٹ پر تعینات ہونے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی اور ۱۹۶۰ء تک کراچی میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پھر محکمہ اطلاعات میں ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کوئٹہ سے ماہوار رسالہ "اولس" جاری کیا۔ اس رسالہ کے جاری ہونے کے ایک سال بعد پشاور آئے اور پشتو ماہنامہ "جمہورِ اسلام" میں ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

اسیر نہایت خوش طبع، خوش اخلاق، صاف گو اور صفائی وسادگی پسند شخص تھے۔ آپ جہاں بھی رہے پشتو زبان وادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ نے ۱۳ نومبر ۱۹۷۸ء میں وفات پائی۔

تصانیف :۔ درسِ عبرت (ڈرامہ)، د سپرلی گل (قطعات اور نظموں کا مجموعہ)، د زرۂ قطرے (منظوم کلام)، درسِ عمل (نثر)، پلوشے (بال جبریل کا منظوم ترجمہ)(۱)

اسیر کی شاعری میں اگرچہ بعض خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی احساس اور تعمیر کے بنیادی مقاصد کے جذبات کلام کا حصہ ہیں۔ "پلوشے" کے عنوان سے بالِ جبریل کا جو ترجمہ کیا شاید پشتو اکیڈمی کے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا اور عبدالحلیم اثر کے ترجمے کو ترجیح دی گئی۔

--- تعارف ---

---بال جبریل---

بال جبریل بانگ درا کے گیارہ سال بعد علامہ اقبال کا دوسرا اردو مجموعۂ کلام ہے۔ بانگ درا سے پہلے بھی انھوں نے اسرارِ خودی (۱۴ء)، رموزِ بے خودی (۱۵ء)، اور پیامِ مشرق (۲۲ء) تینوں کتب فارسی میں لکھی تھیں اور اس کے بعد بھی مذکورہ گیارہ سال کے عرصے میں بالِ جبریل سے پہلے زبورِ عجم (۲۷ء)، جاوید نامہ (۳۲ء) اور مسافر (۳۳ء) فارسی ہی میں لکھی گئیں۔ اس مقام پر علامہ کی پختہ کاری اور حسن کاری عروج پر ہے کیونکہ انھوں نے اس میں اپنی فارسی کتابوں کے اکثر بنیادی تصورات کو اردو زبان میں پیش کیا ہے۔

(۱) ہمیش خلیل، پہنتانۂ لیکوال، ص ۱۷۲

یہ تصنیف در حقیقت علامہ کے نظریات کی تکمیل، اس کے معتقدات و خیالات کی معراج اور اس کے مسلک کا صحیح عکس ہے۔ بانگِ درا اقبال کے ارتقائی منازل کی پہلی سیڑھی ہے۔ اور اس میں وہ ایک ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہیں لیکن بال جبریل میں وہ ایک پانے والے کی مانند مطمئن اور پر سکون نظر آتے ہیں۔ بانگ درا زیادہ تر رنگ ہے اور بال جبریل زیادہ تر رس۔ اس مقام پر علامہ خود آگاہ اور خدا آگاہ کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔ وہ منزلِ مقصود کے لیے دو اہم نسخے احساس خودی اور سخت کوشی تجویز کرتے ہیں۔ یہ ایک صحیفۂ پیغمبری ہے۔ جس میں اہلِ عالم کو پیامِ حیات دیا گیا ہے۔ جوش، تنوع اور رنگینی نہ سہی لیکن بیان کی سلاست، اخلاقی اور حکیمانہ مضامین اور طرز ادا کی بے باکی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اکثر و بیشتر اشعار مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّه اور لَیسَ لِلاِنسانِ اِلَّا مَا سَعٰی انہی دو نظریوں کی تفسیر و توضیح ہے۔ بانگ درا میں ایک پہاڑی ندی کا زور و شور پایا جاتا ہے جبکہ بال جبریل میں ایک میدانی دریا کی سی وسعت، گہرائی اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔(۱)

بال جبریل ۵ ۱۹۳ء میں شائع ہوئی، اس کا رنگ شاعرانہ ہے اور جاوید نامہ کا فلسفیانہ۔ یہ تصنیف علامہ کی چاروں تصانیفِ اردو میں گلِ سر سبد ہے۔ بال جبریل میں فلسفہ کم اور شاعری زیادہ ہے۔ اس میں بلند اور پاکیزہ مضامین ہیں جن کا مقصد اعلیٰ روحانی حقائق کا اثبات ہے۔ خودی کے فلسفے کو کسی حد تک واضح کیا گیا ہے۔ اس کی بعض بہترین نظمیں افغانستان ، سپین، انگلستان اور اٹلی میں قیام کے دوران لکھی گئیں۔ مسجد قرطبہ نے اقبال کو بہت متاثر کیا۔ "ذوق و شوق" سوز و گداز کا مرقع اور سفرِ فلسطین کا حاصل ہے۔ اور ساقی نامہ سب سے زیادہ پر جوش نظم ہے، انہی شہرۂ آفاق منظومات سے بال جبریل مزیّن ہے۔

بال جبریل تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۱۶ نظمیں ہیں، جس میں بندہ و خدا میں ناز و نیاز، گلہ و شکوہ اور دعا و مناجات کے مختلف مناظر ہیں۔ اپنی عبودیت اور درماندگی اور شان و غیورِ خداوندی عروج پر ہے۔ دوسرا حصہ ۶۱ منظومات پر محیط ہے۔ پہلے اور دوسرے حصوں میں منظومات کے عنوانات مفقود ہیں۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں کو زیادہ تر مقامِ آگہی کا درس دیا گیا ہے۔ علامہ اُمتِ مسلمہ کو خود آگاہی اور اسلام کا غلغلہ بلند کر کے دنیا پر چھا جانے کا پیغام دیتے ہیں۔ تیسرے حصہ میں مختلف عنوانات کے تحت بعض طویل اور اکثر مختصر منظومات ہیں۔ اس حصے کا آغاز اس دعا سے ہے جو قرطبہ کی مسجد میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے: سینکڑوں حکیمانہ اور عارفانہ خیالات ہیں جن کی تبلیغ کی گئی ہے اس میں بانگ درا سے بڑھ کر شاعرانہ صنعتکاری، سلاست اور بے ساختگی میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے۔ بانگ درا کی طرح جذبات اور جوش و خروش کا مرقع نہیں لیکن حکمت و معرفت، نکتہ رسی اور حقیقت شناسی کے انمول موتیوں سے اس کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اپنی حالت پر غور و پرداخت، خیالات میں رفعت، اسرار الہٰیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی، اجتماعیات میں حیات اسلامی روح کی صحیح معرفت، مسلمانوں کے سامنے ان کی معیاری زندگی کی اصل تصویر کشی اور جوانانِ سعاد تمند کے پند و نصیحت میں پیر دانا کی سی مشفقانہ حکمت آموزی، جیسے جواہرات سے بال جبریل کے بلند معیار کا پتہ چلتا ہے۔(۲)

---

(۱) سکندر علی واجد، "بال جبریل" نقد اقبال حیات اقبال میں، مرتب، ڈاکٹر تحسین فراقی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۳۹۳

(۲) سید سلیمان ندوی، "بال جبریل"، اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، مرتب اختر راہی، بزم اقبال لاہور، طبع اول، مارچ ۱۹۷۸ء ص ۷۰، ۷۱

ترجمے کا تعارف :۔

"پلوشے" ایسا ترجمہ ہے۔ جس پر کسی قسم کا دیباچہ یا تعارف نہیں ہے۔ ترجمے میں شاعر کی مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ شاعر مترجم کی شاعری میں شک نہیں لیکن شاعری تنوع، جدتِ جذبات اور متانت کے بغیر ناممکن ہے۔ اسیؔر کے ہاں ان اجزا کی خاص کمی محسوس کی جاتی ہے۔ عدم متانت کی وجہ سے کلام کی ساکھ کو ٹھیس پہنچی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر لفظی ترجمے سے کام لیا اور وہ بھی نہایت مختصر اور نامکمل۔ اصل خیالات وافکار سے بے اعتنائی برت کر لفظی ترجمے سے مقصد کا پورا ہونا محال ہے۔ "ساقی نامہ" کا ترجمہ اس کی بہترین یا بدترین مثال ہے۔ بحر کو چست اور شگفتہ بنانے میں اختصار حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ بنابریں بعض الفاظ اور تراکیب حذف کر دی گئی ہیں۔

ـــ ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
اِرم بن گیا دامنِ کوہسار!

ترجمہ :۔

چمن کبنں راغے بہار
د غرۀ لمن سبزه زار(۱)

(چمن میں بہار آئی اور دامن کوہسار سبزہ زار بنا) خیمہ زن اور کاروانِ بہار کے مرکبات حذف کر دیے گئے ہیں۔ کاروان کو خیمہ زن سے جو گہرا ربط ہے، ترجمہ اسکے اثرات وتأثرات اور تصورات سے محروم ہے۔ اسی نظم کے تیسرے بند کا شعر ہے۔

ـــ مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

ترجمہ :۔

راکړه د عشق وزرے
د بغداد ئے کونترے(۲)

(مجھے عشق کے پَر دے اور بغدادی کبوتروں کی طرح اڑا)۔ خاک سے عشق کی بنیاد پر جگنو بنانے اور اڑانے کی جو تمنا ہے، وہ سوز عشق سے کرمک ناداں کی طرح پُر مُر ہونے اور کرمکِ شب تاب بن جانے سے تعبیر ہے۔ یہی تصورات ہیں جن کا شمہ بھی ترجمے میں نہیں پایا جاتا۔

ہر شاعر کی انتہائے نگارش خوب سے خوب تر کی تلاش ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسیؔر کا ترجمہ احساس اور تعمیر کے بنیادی مقاصد کے جذبات سے خالی نہیں اور شاعری میں یہی جذبات کار فرما ہیں، غزل نمبر ۷ :

---

(۱) پلوشے، ص ۱۴۴
(۲) ایضاً ص ۱۴۸

ے نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرہ نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ترجمہ :۔

اقبال نۀ دے نا امیده له دے خپل سپیرۀ پټی نه
که لږ وتر پکبن اوشی فصل اوبه کړی بسیاره(۱)

غزل نمبر ۸ کا ترجمہ دلکش اور دلچسپ ہے۔ شاعر نے سیدھے سادے الفاظ میں اقبال کے تخیل کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔

ے تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی!

ترجمہ :۔

پیمانه کبن دزۀ عکس د سپوږمئ وینم
پرے روښانه کړه زما تورتم مابنام(۲)

ذیل میں بالترتیب ترجمے کا تفصیلی جائزہ لیا جارہا ہے۔ غزل نمبر ۱

مری نوائے شوق سے شورِ حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

زمادَ عشق په چغار شور په حرم کبن دے ستا
زما په زوګ آباده د بتکدو دا دنیا(۳)

ترجمے کے دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہیں۔ دونوں کی بحریں جدا جدا ہیں۔ ترجمہ میں دوسرے مصرعے کا مطلب ہے کہ میرے شور سے بت کدوں کی دنیا آباد ہے۔ جو اصل مصرعے کا متضاد ہے۔ اس لیے ترجمے میں اصلاح کی گنجائش ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس کی تفسیر میں طویل حشئیں کی ہیں انھوں نے اس غزل کو بالعموم اور اس شعر کو بالخصوص بال جبریل کی جان قرار دیا ہے۔ غلام رسول مہر اس شعر کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

"میرے عشق کے نغموں سے ذات کی بارگاہِ خاص میں شور پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان نغموں کے باعث صفات کے بت خانے سے "پناہ خدا" کے غلغلے بلند ہونے لگے" (۴)

رباعی :۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

(۱) پلوشے، ص ۱۶

(۲) ایضاً ص ۱۸

(۳) ایضاً ص ۵ (۴) مولانا غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال اردو۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

ستا په خم کښی نور شراب نیشته باقی
اے صاحب! که زمانهٔ ئے ساقی
سمندر که تږی حلق ته څاڅکی واچئی
بخیلی ده دے ته نهٔ وائی رزاقی(۱)

ترجمے میں نہ شاعرانہ خوبی ہے اور نہ رباعی کی دلکش بحر ہے۔ اس لیے ترجمہ پھیکا سا ہو کر رہ گیا ہے، منظوم ترجمے میں اگر ایک طرف شاعر کے تصور اور خیال کو دوسری زبان میں متعارف کراتا ہے۔ تو دوسری طرف عروض اور غنائیت کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ ترجمہ اس طرح درست ہوگا۔

ستا په جام کښی نور شراب نیشته باقی
راته وایه تهٔ زمانهٔ ئے ساقی
سمندر تږی ته پرخه ورکوی
بخیلی ده دا څه نهٔ ده رزاقی

تیسری غزل:۔

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!
نغمہ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

که ستا حسن پټ پردو کښی زما عشق هم پټ په پټه
یا خو خپله رابنکاره شه یا بنکاره کړه زما ځان
که نصیب کښی زمانه وی د بهار خوږے سندرے
دَ بهار مرغوله ورکړه زما سوز زما فغان(۲)

مذکورہ ترجمہ (تیسری غزل) ترنم اور غنائیت کی بہترین مثال ہے۔ فلسفۂ اقبال کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ترجمے کی دلکش بحر بھی قابل تحسین ہے۔

غزل نمبر ۴ کا ترجمہ آزاد ہے۔ لیکن الفاظ غیر مانوس استعمال کیے گئے ہیں۔

(۱) پلوشے، ص ۴
(۲) ایضاً، ص ۸

؎ خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد!

مرغئی بهادره خوبنه وی کله د زړه له شوقه
هغه چمن چه مرغ گیر پکښې گزر نه لری(۱)

ترجمے کا مطلب :۔ جرأت مند پرندہ دلی ذوق سے بھلا ایسے باغ کو کیسے پسند کر سکتا ہے، جہاں مرغ گیر (صیاد) کا گزر نہ ہو۔ مرغ گیر کی بجائے "ښکاری" استعمال کرنا چاہیئے۔ غزل نمبر ۵ کا شعر :۔

وہ عشق جس کی شمع بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

هغه عشق چه بس اجل ئې خاتمه شی
په هغې کښې یو بخرے نیشته خوند(۲)

دوسرے مصرے کا ترجمہ خانہ پری کے مترادف ہے۔ کیونکہ "تپش" اور "انتظار" جو لوازمات عشق میں سے ہیں کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔

؎ کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

چه له سرېکو نه ئې نهٔ شمه اوزګار زهٔ
ازغی هغه سے په زړهٔ کښې کړه پیوند(۳)

پہلا مصرعہ اس طرح صحیح ہو گا :۔ چه له سرېکونه ئې مدام شم په لړزان

غزل نمبر ٦

؎ کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

په بل جهان کښې هم دا عشق زما کانې اونکړی
بیا را ژوندیے لیلیٰ مجنون محمود ایاز نهٔ شی(۴)

مترجم شاعر نے افسانہ دنبالۂ محمل کی جو تشریح کی ہے۔ قابل ستائش ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

---

(۱) پلوشے، ص ۱۰
(۲) پلوشے، ص ۱۲
(۳) ایضاً
(۴) ایضاً ۱۳

ستوری حیران گونه په خوله بنی آدم ته گوری
چه له دے مات ستوری نه چرته بدر سازنهٔ شی(۱)

ترجمہ کی بحر مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس غزل کے دوسرے اشعار کے مقابلے میں۔ اسلیے اس شعر کے ترجمے میں اصلاح کی گنجائش ہے۔، ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا۔

ستوری هم ویریږی د خاورین آدم پرواز نه
هسے له دے مات ستوری نه چرته بدر ساز نهٔ شی

غزل نمبر ۷ ۔ متاعِ دین ودانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافرادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی ؟

چا د مخ نه رنړا ورخ کښ دے نقاب برسیره کړے
خاوندان د عقل و دین ئے گرفتار کړل گرفتاره(۲)

(کسی نے روشن دن میں نقاب ہٹایا جس نے عقل ودین کے حاملوں کو گرفتار کیا) اصل اور ترجمے کے الفاظ وتراکیب کا فرق صاف واضح ہے۔ ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا۔

۔ د دین و دانش پنګه د الله د مئین لوټ شوه
دا د کوم حسین کافرخونی غمزه وه اے ساقی

غزل نمبر ۹ :۔ نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ ورباب!
سکوتِ کوہ و لبِ جوئے ولالۂ خودرو!

چپے چپیامِ د بیدیا زړګی ته لار جوړه وی
شوق مِ د زرهٔ ذمے اونے او ذغوغا اووتو(۳)

ترجمے میں کوہ ولب جوئے ولالۂ خودرو کا ترجمہ مفقود ہے۔

غزل نمبر ۱۰:۔

۔ متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

په بدل د بندګئے کښ خدائی ناخلم
دے کښ خوند د بندګانو د شان نیشته(۴)

(۱) پلوشے ص ۱۴
(۲) ایضاً ص ۱۵
(۳) ایضاً ص ۱۹
(۴) ایضاً ص ۲۱

(بندگی کے بدلے خدائی نہیں لیتا۔ اس میں شانِ بندگی کی لذت نہیں) پہلے مصرعے کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ غزل نمبر ا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

هغه سر وتکی ته به خل پل مخکښې څهٔ پاتے شي
چه د تمام جهان دپاره رب پیدا کړے دے(۱)

شاعر نے چنگاری کو بمعنی انگارا استعمال کیا اور نیستاں کو حذف کر دیا۔ غزل نمبر ۳

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

دا دنیا ده جوړ لا هغسے نیمګړے
چه آواز دکن فیکون راځي هر آن(۲)

دوسرے مصرعے کی کی بحر دقیق ہے۔ عبدالحلیم اثر نے ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

معلو میږی کائنا ت دے ، لا تر اوسه ناتمام دے
دم په دم چه ترے نه خیژی غږ دکُن او فیکون(۳)

غزل نمبر ۵ میں مسلمان سے خطاب ہے۔ اور ہر شعر ایک پیغام کا حامل نظر آتا ہے، لیکن اس میں ایک مرکزی خیال بھی ہے جو ہر شعر میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنا زاویہ نگاہ آفاقی بنائے اور مادیات سے بلند تر ہو جائے۔

تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر!
مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر!

لا په لاره تهٔ روان ئے ځان بندی دَ مقام مهٔ کړه
مهٔ مصری مهٔ حجازی شه ځان دَ روم او د شام مهٔ کړه(۱)

غزل نمبر ۷ دراصل ایک نظم ہے جسمیں شاعر نے من و تن کی دنیا کا موازنہ کیا ہے۔ پہلے تین شعروں میں مظاہر فطرت کا بیان، چوتھے شعر میں گریز کا رنگ ہے۔ اس کے بعد پانچ شعروں میں من و تن کا موازنہ، بیان کی سلاست اور تاثیر ایسی کہ شاعری کی سرحد الہام سے مل گئی ہے۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

نهٔ پرراج د فرنگی شته نهٔ پکښې څوک شیخ ملا شته
دا د زړهٔ دنیا عجب ده څه عجب لری بایار( )

---

(۱) پلوشے، ص ۴۰ (۲) ایضاً ص ۴۴
(۳) قاضی عبدالحلیم اثر، ال جبریل، ص ۴۴
(۴) ایضاً ص ۴۶ (۵) ایضاً ص ۴۹

غزل نمبر ۲۸ میں رندانہ، پیمانہ، میخانہ، افسانہ، بیگانہ اصل قوافی استعمال ہوئے ہیں۔

اسیر نے علامہ کی فکر کو گرفت لینے کی کوشش میں آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اسطرح کے ترجمے میں شاعر اصل الفاظ و معانی کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی کوشش میں بعض اوقات ترجمہ مشکوک سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

غزل نمبر ۱۱ :۔

؎ میرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!

انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ!

خلق وائی چه بهار کښې بلبلان دی جوړ خوشحاله

چه د عشق له زوره زاړی په چمن کښې بلبلان (۱)

(لوگ کہتے ہیں کہ بہار میں بلبل خوش ہیں مگر وہ عشق کی تڑپ سے باغ میں نوحہ کناں ہیں۔)

غزل نمبر ۱۳ :۔

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے ؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے ؟

یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تیری کرشمہ سازی

زۀ یم چرته تۀ ئے چرتهٔ ؟ تۀ ئے دلته یاکه هلته

قدرتو نه دِ ښکاریږی چه پیدا دِ کړه دنیا(۲)

(میں کہاں ہوں تو کہاں ہے ؟ تو یہاں ہے یا کہ وہاں۔ دنیا کی پیدائش سے تیری قدرتیں ظاہر ہوئیں)

مجھ پر یہ بھید اب تک نہ کھلا کہ میں کہاں ہوں اور تو کہاں ہے ؟ جس دنیا میں میرا بسیرا ہے اُسے مکان سمجھنا چاہیے کہ لامکان ؟ اس دنیا کا وجود میرے حواس کا نتیجہ ہے۔ یا اسے تیری کرشمہ سازی سمجھا جائے (۳) غزل نمبر ۱۴

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

اس غزل کا بنیادی تصور یہ ہے کہ عشق، انسان کو زمان و مکان کی قیود و حدود سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور یہ وہ نکتہ ہے جو اقبال کے نظام فکر میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کو اپنی تصانیف میں اور بالخصوص فارسی تصانیف میں پیش کیا ہے۔ (۴)

د آسمان لاندے وے ما زما جهان دے

کور د خټو ته م وے زما مکان دے(۵)

(آسمان کے نیچے مٹی کے گھر کو اپنا جہاں اور مکان سمجھتا تھا) غزل نمبر ۱۶

؎ احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر

تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند!(i)

(i) ژند کی تفسیر، پارسیوں کی مقدس کتاب جو ان کے عقیدے کے مطابق ان کے پیغمبر و رہبر زرتشت پر اتری۔

(۱) پلوشے، ص ۲۳، (۲) ایضاً ص ۲۷ (۵) ایضاً ص ۲۹

(۳) مولانا غلام رسول مہر مطالب کلام اقبال، ص ۳۰ (۴) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح بال جبریل، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ص ۱۸۱

موبږ د قرآن هم تفسیر ونه ذمطلب کوو

ستا وینا خو توله بے شبے ربه رښتیاده(۱)

(ہم قرآن کی تفسیر اپنے مطلب کے مطابق کرتے ہیں، اے رب! تیرے سارے ارشادات بے شک حق ہیں۔)

؎ ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند!(i)

دوسرا مصرع :۔ داخوله م د غنچے په شان له وازه په خنداده(۲)

(غنچے کی طرح میرا منہ کھلا ہنستا ہے۔) حکیم سنائی کے مزار پر غزل نمبر ا

؎ لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

نوے تهذیب د زمانے نوے احوال وینمه

زړو شرابو نه خالی خپل جام هر چاکړے دے(۳)

(زمانے کی نئی تہذیب اور نئے احوال دیکھتا ہوں۔ پرانی شراب سے ہر ایک کا جام خالی ہے۔) غزل نمبر ۵ کا ترجمہ دلکش ہے۔

؎ کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر!

ستا ګزار لکه ذتندر تۀ د دوؤکونو واکدار

نور دَ تورے په شان عیش اندرون په نیام مۀکره

(تیری ضرب برق کی کڑک، تو دونوں جہانوں کا سردار، تلوار کی طرح اب مزید نیام میں عیش نہ کر)

اے مسلماں! تجھے خدا نے لاالٰہ الااللہ کی وہ ضرب عطا کی ہے۔ جو پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ تو ہی مغرب و مشرق کے عقدے کھول سکتا ہے۔ اور ان کی مشکلیں دور کر سکتا ہے۔ عام تلواریں خاصا وقت نیاموں میں رہتی ہیں۔ لیکن اے مسلمان! تو تیغِ ہلال کی طرح میان کے عیش و آرام سے بالکل کنارہ کش رہ یعنی تیرا کام یہ ہے کہ ہر وقت حقیقی ضرب لگاتا رہے اور توحید کا پیغام دنیا کو پہنچاتا رہے۔ اس پر مشرق و مغرب کے عقدوں کا حل ہونا موقوف ہے(۴)

آزاد تراجم :۔

آزاد ترجمہ کرنے سے اسیر مشکوک تراجم کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ اس لیے ایسے تراجم میں اقبال کی فکر کو پشتو کا جامہ پہنانے کی ناتمام کوشش ہے۔ غزل نمبر ۱۰؎

(i) شکر خند :۔ خوشی کی ہنسی

۱) پلوشے، ص ۳۳ (۲) ایضاً ص ۳۵ (۳) ایضاً ص ۳۹

(۵) غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال، ص ۵۸

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راہ الوندی!(i)

زما قبر زیارت گاه د همت ناکو
چه له مانه پوهه زیات څوک راز دان نیشته

(ہمت والوں کے لیے میری قبر زیارت گاہ ہے۔ کیوں کہ مجھ سے زیادہ ذی شعور راز دان نہیں)

مترجم شاعر نے دوسرے مصرعے کو اپنے فکر و خیال کی لڑی میں پرویا ہے۔ قاضی عبدالحلیم اثر نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

زما قبر زیارت گاه دے، د همت لرونکو خلقو
چه سے خاورو ته د لارے، راز ښودلے الوندی(۱)

چونکہ میں نے مسلمانوں کی ترقی اور سربلندی کا راز بتایا ہے، اس لیے مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید واثق ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری قبر، زیارت گاہ بن جائیگی۔ اہلِ عزم و ہمت، یعنی دیندار مسلمان مجھے دعائے خیر سے یاد کیا کریں گے اور دور و نزدیک سے لوگ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آیا کریں گے۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اقبال کی یہ دعا قبول کرلی۔ بلا مبالغہ ان کا مزار آج زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں میں جس قدر مذہبی شعور پیدا ہوگا، اُسی قدر اقبال کی عزت ان کے دلوں میں پیدا ہوگی۔(۲) غزل نمبر ۱۲

؎ حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

هغه نابوهه دے چه وائی زمانه دے کره یار
که زمانه کوی جنګ ته هم ورته برند شه په ځان(۳)

(وہ ناسمجھ جو زمانہ کا ساتھ دینے کی تلقین کرے اگر زمانہ جنگ کرے تو بھی جنگ کے لیے تیار ہو جا)

اس شعر میں اقبال نے اپنا مخصوص فلسفۂ زندگی پیش کیا ہے۔ یہ بے خبروں اور ناشناہوں کا قول ہے کہ تو اپنے آپ کو زمانے کے موافق بنالے۔ جو لوگ زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ ہیں ان کا اصول یہ ہے کہ زمانہ اگر تجھ سے موافقت نہ کرے تو اس کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جا(۴) مطلب یہ کہ عالی ہمت جواں مرد زمانے کو بزور اپنے پیچھے چلاتے ہیں جو لوگ ہمت سے خالی ہوتے ہیں وہ زمانے کے پیچھے چلتے ہیں غزل نمبر ۱۵

؎ اِک دانش نورانی، اِک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

یو عقل نور نه ډک دے بل دے فضل د رحمان
صاحب د مرتبے شي، هم په دے عقل حیران (۵)

---

(۱) قاضی عبدالحلیم اثر، ترجمہ بال جبریل، ص ۲۲

(۲) یوسف سلیم چشتی، شرح بال جبریل، ص ۱۵۶، ۱۵۷ (۳) غلام رسول تنر، مطالب کلام اقبال، ص ۲۹ (۴) ایضاً ص ۲۵ (۵) ایضاً ص ۳۱

(i) الوند ایران کے بلند و بالا پہاڑ کا نام ہے۔

(ایک عقل، نور سے بھری اور دوسری رحمان کا فضل ہے۔ صاحب مرتبہ اس عقل پر حیران ہے) اثر کا ترجمہ دیکھیے۔

یوہ پوهه د دلیل ده، بله نور ځنے پیدا

زیاتوی د دلیل پوهه، که ئے ګورے حیرانتیا

اقبال کے کلام میں عقل و دل اور عقل و عشق کے مضامین بکثرت ہیں۔ وہ عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل خداداد کے قائل ہیں۔ جب عقل اور عشق کا موازنہ کرتے ہیں تو عشق کا درجہ بڑھا کر اس کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

دانش نورانی سے انسان کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس عقل کے نور سے انسان اپنے محبوب کو دیکھ لیتا ہے۔ اور دید کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے برعکس دانش برہانی سے انسان کے دماغ میں شکوک و شبہات کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ یہ عقل پردہ اٹھا کر محبوب کا جمال جہاں آرا نہیں دکھا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل تجلی کی تاب نہیں لا سکتی۔ یہ عشق ہی ہے کہ عاشق میں مشاہدہ کی طاقت پیدا کر دیتا ہے، چنانچہ وہ اطمینان کے ساتھ دیدار یار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ نہ اس کی نگاہ میں کجی پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ وہ اپنے مقصد سے منحرف ہو سکتی ہے۔(۱) غزل نمبر ۱۴

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کورم په دهلی نه په صفا نه، سمرقند کښې دے(i)

خدائے باند توکل زما وطن توله دنيا ده (۲)

شاعر مترجم نے پہلے مصرعے کو نظر انداز کر کے اس طرح ترجمہ کیا۔ اللہ پر بھروسہ رکھکر ساری دنیا میرا وطن ہے ــــــ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اثر کا ترجمہ قابل تعریف ہے۔ ملاحظہ ہو

دوریش مسست د خدائے په مینه نه شرقی وی نه غربی وی

ځائے ځائیګے مے نه ډیلے دے، اصفهان نه سمرقند(۳)

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش

خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند(ii)

حق باند میئن به دروغ هیڅکله او نه وائی

شپے ته به ځنګ واوائی چه دغه ورځ رنړاه ده(٤)

(حق پرست کبھی بھی دروغ گوئی نہیں کر سکتے۔ رات کو روشن دن وہ کیسے کہہ سکتے ہیں) دوسرے مصرعے کو بالکل بدل کر کے رکھ

(i) صفاہاں:۔ اصفہان ایران کا مشہور شہر۔ سمرقند: دریائے جیحوں کے اس پار (جو ایران و توران کا حد فاصل ہے) بارونق شہر (ii) الوند اور دماوند ایران کے مشہور پہاڑ ہیں۔ اقبال نے فارسی شعرا کے تتبع میں ان کا تذکرہ اپنی تصانیف میں کیا ہے۔

(۱) یوسف سلیم، شرح، ص ۱۸۷ (۲) پلوشے، ص ۳۴ (۳) ایضاً ص ۳۵ (۴) اثر بال جبریل، ص ۳۴

دیا ہے۔

ع میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند(i)

زۀ یمه مومن په ایمان کلکه زما ملا ده

(میں بندہ مومن ہوں، ایمان پر میری کمر مضبوط ہے)

مترجم شاعر نے "دانۂ اسپند" کی وضاحت نہیں کی۔ علامہ کہتے ہیں کہ میں سنت ابراہیمی پر کاربند ہوں اور ان کی طرح آگ کے شعلوں میں صبر وضبط کئے بیٹھا ہوں۔ کیا میں ہرمل کا دانہ ہوں کہ آگ میں پڑتے ہی ترخوں اور پھٹ جاؤں؟ بلکہ اللہ پر میرا ایمان پختہ ہے۔

ے پر سوز و نظر باز و نکو بیں و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

نیکی م په رګ رګ کښې کم آزاره نظربازیم
آزاد له وسوسونه په مال کله م پروا ده(۱)

(نیکی میری سرشت میں ہے، کم آزار و نظر باز ہوں۔ وسواس سے آزاد اور مال سے بے نیاز ہوں)

ترجمہ میں پرسوز، کیسہ (جیب) اور خورسند (خوشی) کا ذکر تک نہیں، حالانکہ انہی الفاظ سے شعر کی ساکھ بڑھ گئی ہے۔ عبدالحلیم اثر نے شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

د ک له سوزه نظرباز یمه، نیک دل او کم آزار یم
هم آزاد هم گرفتاریم، میانئی تشه او خورسند(۲)

اثر نے کیسہ بمعنی میان کے لیا ہے۔ جس سے شعر کا مفہوم غلط ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مصرعے کے اصل الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں ع چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال

اقبال په ورځ د حشر جوړه کړے شنګ غوغا ده(۳)

(اقبال نے روزِ قیامت کیسا غوغا بلند کیا ہے)

اثر کا ترجمہ زیادہ صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو: په حضور د پاک مولی کښې هم اقبال چپ پاتے نه شه(۴)

غزل نمبر ا، علامہ اقبال ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان گئے جہاں حکیم سنائی غزنوی کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ اشعار اس تقریب سعید کی یادگار میں لکھے گئے۔ اس غزل کا پہلا حصہ تمہیدی ہے۔ دوسرے حصے میں مشرق و مغرب کی کیفیت، تیسرے حصے میں آزادی اور غلامی کی حقیقت، چوتھے حصے میں مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں کے مقابلے کے لیے قرآنی تعلیم کو سب سے بڑا حربہ قرار دیا گیا ہے۔ آخر میں چند شعر لغت کے ہیں۔

---

(۱) پلوشے، ص ۳۵
(۳) ایضاً
(۵) ایضاً ص ۴۰
(۲) عبدالحلیم اثر، ترجمہ بال جبریل، ص ۳۵
(۴) ایضاً (i) اسپند کا پشتو لفظ "سپیلنی"

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے

زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

په زمانه کښې سربالا نن هغه خوان وينمه

جنګ په ميدان کښې ورسره چه پرون جاکړے دے

(وہ جوان آج زمانے میں سربالا ہے، کل جس کے ساتھ میدان میں جنگ ہوئی ہے) شاعر مترجم کو ترجمہ کرنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔نہ صرف اصل الفاظ کو انظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ فردا کو گزشتہ کل کے معنوں میں لیا ہے۔ دور حاضر کا قائد ور ہنما اور مالک ومختار اسی کو سمجھا جاسکتا ہے جو ہمت سے کام لے اور زمانے کے سمندر سے آنے والے کل کے موتی نکالے۔

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ

ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوے لالا!

د سنائی له ادب بس دے نور به هيڅ نۀ وائم

د نوراشعا رويلونه ځان ځکه جپ ساکړيدے (۱)

(سنائی کے کلام کے بعد مزید کچھ نہیں کہہ سکتا۔اور اشعار کہنے سے میں نے اس لیے خاموشی اختیار کی)

ترجمہ اصل کا مطلب ادا کرنے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔اس لحاظ سے آثر کا ترجمہ معیاری ہے۔

وو ادب د سنائي چه مرجونړا نهٔ شوم که نۀ وے

لا دی پاتے دے درياب کښې مرغلرے بيش بها(۲)

نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس کی تعریف کی کوئی حد نہیں۔ میں اس بات کو ادب خیال کرتا ہوں کہ آپؐ کی تعریف میں حکیم سنائی سے بڑھ جاؤں۔اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ ابھی اس بحر میں لاکھوں موتی موجود ہیں۔ غزل نمبر ۲

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز

اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

په چمن کښې څوک عجب رنګ نغمه زن دے

چه دانا هم کله کله ځان اوتر کړی(۳)

(چمن میں کون عجب نغمہ زن ہے کہ دانا بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو بد حواس کر دیتا ہے۔)

ترجمہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاعر اس طرح گاتا ہے کہ اس سے خود شاعر کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے ـــــ اس شعر میں اقبال نے اپنی شاعری کی حقیقت بیان کی ہے کہتے ہیں کہ میرے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سوز و گداز اور کیف و مستی سے لبریز ہے۔جس کے پڑھنے سے روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔دوسرے یہ کہ عقل کے ساتھ ساتھ انسان میں عشق کا رنگ بھی پیدا کر دیتا ہے۔انھوں نے ہماری واقفیت کے لیے اپنی شاعری کی مندرجہ ذیل تین خصوصیات اس شعر میں بیان کر دی ہیں۔

---

(۱) پلوشے، ص ۱۴۱ (۳) ایضاً ص ۴۲

(۲) آثر بال جبریل، ص ۱۴

۱۔ پرُسوز ہے یعنی وارداتِ عاشقی کی سچی تصویر ہے۔

۲۔ نشاط انگیز ہے، یعنی عشق و مستی کے جذبات کو بیدار کرتی ہے۔

۳۔ اندیشہ (عقل) میں جنون (عشق) کا رنگ پیدا کردیتی ہے۔ واضح ہو کہ اقبال مرشد روی کی اتباع میں اس مسلک کے مبلغ ہیں کہ محض عقل، انسان کو کامیاب نہیں کرسکتی۔ اس کے ساتھ انسان کے اندر عشق کا جذبہ بھی کار فرما ہے تو حقیقی معنی میں انسانیت کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ غزل نمبر ۸

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

زما گیله د استاذانو د مکتب ځنے ده
چه د هوا مرغوته بنئي د خاکبازئ کاروبار(۱)

(مجھے اساتذۂ مکتب سے شکایت ہے کہ ہوا کے پرندوں کو خاکبازی کا کاروبار سکھاتے ہیں)

دوسرا مصرعہ اس طرح ہونا چاہیے۔ چه د شاهین بچو ته بنئي خاورنیک کاروبار

غزل نمبر ۱۱ ع غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق!

"درازی" نکتے که ښے دی زمانه کبنی (۲)

ترجمے سے شے کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ــــــ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ امام فخر الدین رازی(۳) نے تفسیر میں عجیب و غریب نکتے پیدا کئے ہیں۔ یہ صرف عقلی مباحث ہیں جو ایمان کی قوت پیدا نہیں کرسکتیں۔ غزل نمبر ۱۴

ع کہ مغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

چه د قسمت رنړا دِلوټ نه کاندی څوک داکه مار(٤)

کہ تیری قسمت کی روشنی پر کوئی ڈاکہ نہ ڈالے)۔ مغ زادہ بمعنی آتش پرست اور مئے فروش کے ہیں اقبال نے غیر مسلموں کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگر تو اسی طرح اللہ کی نافرمانی کرتا رہا تو غیروں پر اللہ اپنا فضل نازل کردیگا اور تو محروم رہ جائیگا۔ جو قوم ترقی کی کوشش نہیں کرتی اللہ بھی اس قوم کی مدد نہیں کرتا(۵) غزل نمبر ۱۹

سنے نہ ساقی مہوش تو اور بھی اچھا
عیار گرمیٔ صحبت ہے حرف معذوری

بنه ده بنه ده که په غوږ و یار وا نه وری
چه صحبت د اشنالا یولوئے جنجال دے(٦)

(اگر یار کانوں سے نہ سنے تو یہ اور بھی اچھا ہے کیونکہ صحبتِ محبوب بھی ایک جنجال ہے)

---

(۱) پلوشے، ص ۵۰ (۲) ایضاً ص ۵۴ (۴) ایضاً ص ۵۸ (٦) ایضاً، ص ۶۴

(۳) رے (ایران) میں ۵۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ منطق، فلسفہ، اور الٰہیات تینوں علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ قرآن کی تفسیر (مفاتیح الغیب جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے) لکھی۔ انھوں نے تفسیر سے زیادہ علم کلام کیا ہے۔

(۵) یوسف سلیم بال جبریل، ص ۲۹۹

جبکہ علامہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساقی میری طرف متوجہ نہیں ہے تو یہ کوئی رنجیدہ ہونے کی بات نہیں ہے، کیونکہ جس قدر وہ تغافل کرے گا، اُسی قدر اس کی طرف میرا التفات زیادہ ہوگا۔ اور یہ شدتِ التفات کامیابی کی ضامن ہے۔ اسی طرح سالک بھی اپنی ارادت کیشی اور خدمت سے کسی نہ کسی دن شیخ کی توجہ حاصل کرلے گا۔ غزل نمبر ۲۲

ع نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے

دَ منزل نشان دِماله رادِ نه کړو څه به وایم

مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔ (د منزل نشان دِ ماله رادِ نه کړو اے حکیمه) غزل نمبر ۲۴

ے جسے کساد سمجھتے ہیں تاجران فرنگ

وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

تاجران چه د فرنګ ورته ډیر قیمتي وائی

هغه بل څه ګورے نه دی د هنر نه زیاتی نور(۱)

پہلا مصرع غلط ہے۔ صحیح اس طرح ہوگا۔ تاجران چه د فرنګ ورته ډیر بیکاره وائی۔ غزل نمبر ۵۴

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز

یہی رختِ سفر میر کارواں کے لیے

نظر اوچت خوږ ے خبرے بنه خوند ناک طبیعت

دغه سامان دے د سالارے کاروان دپاره(۲)

شاعر مترجم کا پہلا مصرعہ ترجمے کا وہ حق ادا نہیں کرتا جو علامہ کے تفکر کا طرۂ امتیاز ہے۔ نگہ بلند سے مراد اعلیٰ نصب العین یعنی اسلام کا بول بالا کرنا۔ سخن دلنواز سے مراد قرآن وحدیث کے علوم کا ماہر ہی دل میں گھر کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور گفتگو دلنواز نہیں ہو سکتی۔ جاں پرسوز سے مراد عشق رسولؐ سے سرشار ہونا ہے۔ تینوں باتیں عشق رسولؐ ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔(۳)

غزل نمبر ۳۲ ے تعمیر آشیاں سے میں نے یہ راز پایا

اہل نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ

چه م جاله جوړکړله هله پوهه په دے راز شوم

چه د تندرګزار نیغ د غریب په آشیانے دے(٤)

تعمیر آشیاں سے مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہ غریب کے آشیانے کے لیے بجلی کی کڑک ہے۔)

علامہ کا مقصد ہے کہ آشیاں بنانے سے مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ نغمے گانے والوں کے لیے آشیاں بجلی کا حکم رکھتا ہے۔(۵)

مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے آزادی اور زندگی کے پیغام کا حامل بنایا ہے، وہ دنیوی راحت وآسائش کے سامان جمع بھی کر لیں فانی ہونے کے سبب ان کے ابدی اشیاء (آزادی، پیغام) کے حق میں زہر قاتل ہے۔ آخر ترجمہ دیکھیں:

(۱) پلوشے، ص ۷۱ (۲) ایضاً ص ۴۷ (۴) ایضاً، ص ۸۰

(۳) یوسف سلیم بال جبریل، ص ۳۴۲ (۵) غلام رسول مہر، ص ۱۰۳

جوړولو نه د جالې، د غه رازسې اوسوندلو

آشيانه شي ورله تندر چه خاوند وى د نوا(۱)

غزل نمبر ۳۶ کے ترجمہ کا ہر شعر الگ قافیے اور ردیف میں ہے۔ غزل نمبر ۳۶

مئے یقین سے ضمیر حیات ہے پرسوز

نصیب مدرسہ یارب یہ آبِ آتشناک!

د يقين د ميوو ژوند تروتازه دے

په نصيب شو د مکتب ښکلے شراب(۲)

(یقین کے پھلوں کی حیات تروتازہ ہے۔ خوبصورت شراب مکتب کے نصیب میں ہے)

علامہ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ یقین کی شراب نے زندگی کے ضمیر کو سوزوگداز سے بھر رکھا ہے۔ اے اللہ! میری دعا ہے کہ یہ آب آتشناک (مئے یقین) مدرسے والوں کو بھی نصیب ہو یعنی وہ بھی یقین کی دولت سے بہرہ یاب ہوں (۳)۔ مذکورہ شعر کا ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا۔

دَ يقين شراب سوزناک د ژوند ضمير کړى

که نصيب شي د مکتب دا ښه شراب

نظم "دعا"

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور

تجھ سے میرے سینے میں آتشِ اللہ ھُو!

ستا په مخ کښې ګريوان چاک يم

زړه ٔ مِ ګلې ستا په غوغا دے(۴)

(تیرے سامنے میرا گریباں چاک ہے۔ اور دل تیرے لیے بے قرار ہے۔)

تو نے ہی وہ جنونِ عشق عطا کیا، جس کی بدولت میرے گریباں نے صبح قیامت کے طلوع کا نقشہ پیدا کر لیا یعنی اس سے ویسے ہی ہنگامے اٹھ رہے ہیں، جیسے قیامت کی صبح کو اٹھیں گے اور تیری ہی برکت سے میرے سینے میں اللہ ھو کی آگ بھڑک رہی ہے۔

چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر

جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو!

ستا کرم ته منتظر دى

جام په لاس کښې دهر چادے(۵)

(سب ہاتھوں میں جام لیے ہوئے تیرے کرم کے منتظر ہیں) ترجمہ اتنا مختصر ہے کہ اکثر الفاظ حذف کر دیے اور اصل مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

اے رحمت کے ساقی! ہم پر پھر لطف و کرم کی نظر فرما۔ ہمارے امیر اور غریب، شاہ و گدا، دنیادار اور دیندار، علماء اور صوفی

---

(۱) عبدالحلیم اثر بال جبریل، ص ۸۰

(۲) پلوشے، ص ۹۷ (۳) ایضاً، ص ۱۲۳ (۵) ایضاً، ص (۳) غلام رسول مہر، ص ۱۲۷

سب اپنے اپنے ظرف لیے انتظار کر رہے ہیں۔ تیری عنایت سے انھیں وہ پرانی شراب مل جائے۔ اثر کا ترجمہ اس لحاظ سے بہتر ہے۔

د کرم نظر د بویه ، اے ساقی په انتظار دی

جلوتیان لوښی په لاس کښې ، خلوتیان په لاس کا سه(۱)

"مسجد قرطبہ" ؎ تو ہو اگر کم عیار ، میں ہوں اگر کم عیار

موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

ستا دپاره مرگ نجات ما دپاره هم نجات

فام کړه مه شه ډیر عیار زهٔ به هم نهٔ شم عیار(۲)

(تیرے اور میرے لیے موت نجات ہے۔ دیکھو! زیادہ عیار نہ بن، میں بھی زیادہ عیار نہ بن جاؤں)

تو ہویا میں، جو وجود بھی وزن اور خاصیت میں کم حیثیت ثابت ہو، زمانہ اُسے مٹا دیتا ہے۔ اور اس کی قسمت میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا(۳) _____ اس لیے کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ اثر نے اس طرح ترجمہ کیا۔

که ناقص او که کوته ئې که ناقص او کوته زهٔ یم

تا به هم مرګے فنا کړی او ماهم به ورکوی(۴)

(میں اگر ناقص ہوں تو اگر کھوٹا اور ناقص ہے۔ موت تجھے بھی فنا کر کے رکھ دے گی اور مجھے بھی)

قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل

خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!

دا د څیګروینه م ځه سنګِ فارس دے

دے سره دے سوزوساز، دے سره دے زیروبم(۵)

(میرا خونِ جگر سنگ فارس ہے۔ اس سے سوز ساز اور زیر و بم ہے) اثر کا ترجمہ صحیح ہے۔

د څیګر د وینے ځاځکے دَ اوج کانړی نه زرهٔ رغ کړی

د څیګر وینه سرور دے ، هم سرودسوزوصدا(۶)

؎ تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور

تیرا منار بلند جلوہ گہ جبریل

دنګو منارو کښې دے ځائے د جبرئیل وینم

ته په هر یو ګټ کښې خپل بل د نور مشال لرے

تیرے بلند میناروں میں جبرئیل کی جگہ ہے۔ تو ہر کونے میں اپنے نور کی مشعل روشن رکھے ہوئے ہے۔ مترجم شاعر نے در و بام کو"

---

(۱) عبدالحلیم اثر، بال جبریل، ص ۱۲۴

(۲) پلوشے، ص ۱۲۷ (۳) غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال، ص ۳۷۱ (۴) عبدالحلیم اثر، بال جبریل، ص ۱۲۷ (۶) ایضاً ص ۱۲۹

(۵) پلوشے، ص ۱۲۹

ہر کونے" اور وادیٔ ایمن کا نور کو اپنے روشن مشعل سے بدل دیا ہے۔ جس کا ترجمہ معیاری نہیں رہتا۔ نظم (طارق کی دعا)

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

په خپل صفا تو باندے تاسزین کری همه
دک له اسراره دا غازیان دی د غزا په میدان(۱)

(تو نے ان پراسرار غازیوں کو میدان جنگ میں اپنی صفات سے مزین کیا ہے۔) ترجمے میں دوسرے مصرعے کی وضاحت نہیں۔ اثر کا ترجمہ بااثر ہے۔

دا غازیان دا نالیدلی پر اسرار ہ بندگان ستا
د خدائی د ذوق چه ایښی پکښی تا دی قوتونه(۲)

ے خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

لاله په طمع انتظار کښی قبالاس کښی لری
عرب به کله دے وطن کښی خپلے وینے کری(۳)

(گلِ لالہ لباس ہاتھ میں لیے اس انتظار میں ہے کہ عرب کب اس وطن میں خون بو تا ہے) اثر کا ترجمہ

خیابان کښی منتظره ریدی گل دے له مودونه
یو قبا ورله پکارده د عرب د وینو سرونه(۴)

نظم "فرمان خدا" میں کنجشک فرومایہ • بے حقیقت یا بے حیثیت چڑیا کا ترجمہ " خارودبیابان" یعنی صحرا کی مینا کیا گیا ہے۔

ع گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے

متے د غلام په خپل همت باندے مضبو طے کریٔ(۵)

(بازوئے غلام کو اپنی ہمت سے مضبوط بنائیں) سوزِ یقین اور لہو گرمانے کا کوئی ذکر نہیں۔ نظم "ذوق و شوق "

در یغ آمدم زاں همه بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

کا ترجمہ مفقود ہے۔ البتہ آثر نے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔

افسوسناکه رابنکاره شوه چه له دا هسے گلانو
زه دِ ورشم تش لاسونه د صحبت له دِ د وستانو(۶)

(چمن کے پھولوں سے احباب کی محفل میں خالی ہاتھ جانا مجھے گوارا نہیں)

---

(۱) پلوشے، ص ۱۴۲
(۲) اثر، بال جبریل، ص ۱۴۲ (۴) ایضاً
(۳) پلوشے، ص ۱۴۳ (۵) ایضاً، ص ۱۴۹ (۶) ایضاً، ص ۱۵۱

ع آگ بجھی ہوئی اِدھر ، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر(i)

ایسته اور مړ شوے وینم، هورته پروت رباب بے تار(۱)

شاعر مترجم نے ٹوٹی ہوئی طناب کا ترجمہ رباب کے ٹوٹے ہوئے تار سے کیا ہے۔

ے صدق خلیلؑ بھی ہے عشق صبر حسینؓ بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

په خلیل شو اور گلزار، حسینؓ ځان پر خپل قربان کړو

دا د عشق دی کارونه خبردا ر کۀ د پر ځان کړو(۲)

(خلیلؑ کے لیے آگ گلزار بن گئی، حسینؓ نے اپنی جان قربان کر دی، یہی عشق کے کام ہیں اگر تم سمجھتے ہو) ترجمے میں ابراہیم خلیل اللہ کے صدق، حسینؓ کے صبر اور بدر و حنین کے معرکے کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ نظم "الارض للہ

ع کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار

د سهیل نه چا راوستی دا بادونه د خوند خوند(۳)

"سہیل" بمعنی جنوب کے ہے، اس لیے اثر کا ترجمہ صحیح ہے۔ جاراکبنلے او راوستے د قبلے هوا سازگاره(۴)

نظم "نصیحت" ے ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں!

گرمه وینه د ځوانئے پخپله اور دے

په کوشش د ژوند تراخه د شاتو کان دے(۵)

"د شاتو کان" یعنی شہد کی کان، اور شہد کی کان نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے اثر کا ترجمہ کچھ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ځوانی نوم دخپلے وینے په سور اور کښې سوزیدل دی

هله تریخ ژوندون گبین شی چه څوک اوکړوی ځان (۶)

ے جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر

وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

هغه خوند دبنکار په وینه کښې دے چرته

چه په ښکار غوته کیدو کښې کوم پنهان دے(۷)

ترجمے میں کبوتر اور پسر کے الفاظ نظر انداز کر کے کام چلایا ہے۔ اثر کا ترجمہ

په کنتر غوته کیدو کښې چه کوم خوند دے زماځویه!

گمان کړم ددۀ په وینه کښې خوندنۀ وی هغه شان!(۸)

(i) طناب بمعنی خیمے کی رسی

(۱) پلوشے، ص ۱۵۲، (۲) ایضاً، ص ۱۵۳ (۳) ایضاً، ص ۱۶۱

(۴) اثر، بال جبریل، ص ۱۶۱ (۶) ایضاً، ص ۱۶۳ (۸) ایضاً، (۵) پلوشے، ص ۱۶۳ (۷) ایضاً

نظم "لالۂ صحرا" ۔ غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو

ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی!

غوپه په محبت کښې، الله دِ نګهبان شي

قطره ددے درياب، درياب دے په خپل ځان (۱)

مترجم شاعر نے غواص کو غوطہ خور کی بجائے غوطہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے مصرعے کا مطلب بھی واضح نہیں ہے۔ آثر کا ترجمہ اس کے مقابلے میں ہر اصل لفظ کے ترجمے پر حاوی ہے۔

مرجونړا د محبت دِ په امان کښې د خدائے اوسي

د درياب غوندے ژوره د درياب هر ه قطره!(۲)

۔ اے بادبیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو

خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی!

اے با دِ بيابانه نن زهٔ هم په دعا يم

په عشق کښې بدمست وے ، خاموشه وے سوزان(۳)

مترجم قافیہ پیمائی کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے مطلب مشکوک سا ہو کر رہ گیا ہے۔ "ساقی نامہ" کے اشعار کا ترجمہ اتنا مختصر ہے کہ اکثر الفاظ و تراکیب نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

۔ ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار

ارم بن گیا دامن کوہسار

چمن کښې راغے بهار

د غرهٔ لمن سبزه زار(۴)

(چمن میں بہار آئی، دامن کوہسار سبزہ زار بن گیا)۔ تیسرے بند کا شعر:

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا

مری خاک جگنو بنا کر اڑا

راکړه د عشق وزرے

د بغدا دئے کونترے(۵)

(بغدادی کبوتر کی طرح عشق کے پر دیدے) شاعر مترجم نے دوسرے مصرعے کو سرے سے چھوڑ دیا۔

مری ناؤ گرداب سے پار کر

یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر!

---

(۱) پلوشے، ص ۱۶۳ (۳)ایضاً، ص ۱۶۵ (۲) اثر مبال جبریل، ص ۱۶۳

(۴) پلوشے، ص ۱۶۶ (۵)ایضاً، ص ۱۶۸

دوبه کښتئ م کړه پار

کړه ئے روانه په لار(۱)

(۳) میری ڈوبتی کشتی راہ پر روانہ کر کے پار کرادے) شاعر نے دوسرے مصرعے کو یکسر نظر انداز کیا۔

ے کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ

لہو سے چکوروں کے آلودہ رنگ

کله شاهین دے خوش رنګ

د ښکار په وینو ګلرنګ(۲)

کبھی خوش رنگ شاہین شکار کے لہو سے گلرنگ ہے) شاعر مترجم نے جرہ، سیماب اور چکوروں کے الفاظ کو قابل اعتنائے نہ سمجھا۔ اثر کا ترجمہ ملاحظہ ہو

جرته کبښ دے کته باز سیمائی رنګ

سرے په وینو د تنذرو د دهٔ چنګ (۳)

ے فریب نظر ہے سکون و ثبات

تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

دادے فریب د نظر هرګز پرِ مه کړ باور (یہ فریب نظر ہے ہرگز اس کا اعتبار نہ کر) ترجمہ لغو ہے۔ مطلب واضح نہیں۔

نظم "پیر و مرید "

ے علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود

ترجمہ کی بجائے اصل شعر نقل ہے۔ اثر نے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

کبښ په تن اودهے علم جوړ ترے مارشی

که په زړهٔ اووهے علم جوړ ترے یارشی(۴)

اگر تو علم کو تن پروری کے لیے استعمال کرے گا تو وہ سانپ بن کر ڈس لے گا اور اگر تو اس کے ذریعے اپنا باطن آراستہ کرے گا تو وہ تیرے لیے دوست اور رفیق کا کام دیگا۔ مذکورہ نظم میں جہاں بھی فارسی اشعار ہیں ترجمہ میں اصل صورت میں نقل ہیں۔ اس نظم میں جو مکالمانہ انداز ہے اقبال نے مولانا رومؒ کی زبان سے بعض مسائل کی حقیقت بیان کی ہے اور اس سلسلے میں مثنوی کے مختلف اشعار کی بھی صحیح شرح فرمادی ہے۔

عبداللہ جان اسیرؔ کا ترجمہ علامہ اقبال کے کلام سے بالعموم اور بال جبریل سے بالخصوص محبت و عقیدت کا بیّن ثبوت ہے۔ اگر چہ ان کے فروگزاشتوں اور کوتاہیوں کا تفصیلی جائزہ بھی لیا گیا اور ان کی سعی و عمل اور انتھک کاوشوں کا خاکہ بھی پیش کیا گیا لیکن اس کے باوجود

---

(۱) پلوشے ص ۱۶۹ (۲) ایضاً، ص ۱۷۱ (۳) عبدالحلیم اثر، بال جبریل، ص ۱۷۱ (۴) ایضاً، ص ۱۸۰

بھی ایسے اشعار کافی ہیں۔ جن کا ترجمہ مثالی اور معیاری ہے ذیل میں مثالی تراجم ملاحظہ ہوں

مثالی تراجم:۔ غزل نمبر ۷ ۔ نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال نه دے ناامیده له دے خپل سپیرهٔ پټی نه

که لږ وتر پکښې اوشی فصل ا وبه کړی بسیاره(۱)

غزل نمبر ۸ کا ترجمہ دلکش اور سلیس الفاظ میں شاعر کے تخیل کو گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش ہے۔

۔ تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ

تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

پیمانیه کښې دِ زهٔ عکس د سپوږ مئی وینم

پرِ روښانه کړه زما تور تم ماښام(۲)

غزل نمبر ۱۴ ۔ کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند!(i)

خوشے چنړے نه یم د تهذیب غلام هم نه یم

حق کوم خبره زهٔ وینا زما رښتیاده(۳)

غزل نمبر ۳ ۔ علاج آتش رومی کے سوز میں ہے تیرا

تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

ستا په عقل د افرنګو کوډے اوشوے

خو رومی به درله کوز کړی دا پیریان (۴)

(بامحاورہ ترجمہ کی خوبصورت مثال ہے "کوډے او پیریان کوزول" پشتو اصطلاحات ہیں)

نظم "ذوق شوق" ۔ قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

چینه د نور بهیږی سحر وخت په بیابان پکښې

زړهٔ او سترګے پرِ خوشحاله نمر چه اوخیژی آسمان کښې(۵)

۔ بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس

میری نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو!

(i) ابلہ مسجد:۔ مسجد کا نادان، احمق

(۱) پلوشے، ص ۱۶ (۲) ایضاً، ص ۱۸ (۳) ایضاً، ص ۳۴ (۴) ایضاً، ص ۴۴ (۵) ایضاً، ص ۱۵۱

د چمن خارو خس واړه د سحر په باد تازه دی

د آرزو د گل دپاره ، زما دم باغ وبهار(۱)

نظم "جاوید کے نام" ← خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ!

خودی کے ساز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ!

د پښتو په ساز کښې پټے د دایم ژوندن بدلے (i)

شمعے دی د امتونو د "پښتو" په لمبه بلے (۲)

نظم "گدائی" ← مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج

کوئی مانے نہ مانے میر و سلطان سب گدا

چه خیر غواړی یا خراج هر یو فقیر دے

خان ملک دے یاکه میاں دے یا مُلا(۳)

(صدقہ یا خراج مانگنے والا ہر ایک فقیر ہے، خواہ خان ہو، ملک، میاں یا مُلا ہو)

نظم "خوشحال خان کی وصیت"

← مغل سے کسی طرح کمتر نہیں

قہستاں کا یہ بچہ ارجمند

د مغلو نه په هیڅ څیز کښې کم نهٔ دے

(ii)لا ډیر درونږ دے د پښتون دَ بچی سام(۴)

(مغل سے کسی طرح کم نہیں، پشتون بچے کا رعب بہت بھاری ہے۔) نظم "شاہین"

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا

مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ

نورخاته تر قبلے جهان دزرکو

زما سانگو لره جوړ بره آسمان (۵)

اگرچہ شاعر مترجم نے نیلگوں آسمان کا ترجمہ بلند آسمان کیا ہے لیکن مطلب پر کوئی حرف نہیں آتا۔

(i) "بدلے" پشتو کی ایک صنف ہے

(ii) "سام" پشتو کی خوبصورت اصطلاح ہے

(۱) پلوشے، ص ۱۵۳

(۲) ایضاً، ص ۱۵۷

(۳) ایضاً، ص ۱۵۸

(۴) ایضاً، ص ۲۰۶

(۵) ایضاً، ص ۲۲۰

ب

کتاب :- بال جبریل (۱۹۳۵ء)

مترجم :- قاضی عبدالحلیم اثر افغانی

ناشر :- پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سن اشاعت :- نومبر ۱۹۶۷ء

صفحات :- ۲۲۴

مترجم قاضی عبدالحلیم اثر :۔

قاضی عبدالحلیم اثر افغانی جون ۱۹۱۰ء میں ضلع مردان کے فیروز پور نامی گاؤں میں سید کریم کے گھر پیدا ہوئے۔ علمی و دینی گھرانہ کے طفیل اسلامی خطوط پر پرورش ہوئی۔ اکیس (۲۱) سال کی عمر میں پشاور، مردان اور قبائلی علاقہ جات کے علماء سے مروجہ علوم حاصل کئے۔ طالب علمی کے زمانے میں نظم ونثر کا مجموعہ "گلدستہ" (فارسی) اور عربی میں یتیمۃ الادب جیسی چھوٹی کتب لکھیں۔ ۱۹۳۰ء میں روزنامہ سرحد پشاور کے پشتو حصہ کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۶ء میں جمیعت العلما (میرہ) کے ناظم اعلیٰ اور ہشتنغر اور مردان کے اعزازی رکن تھے۔ ۱۹۴۳ء میں "انجمن اتحاد باجوڑ" کے ناظم اعلیٰ تھے۔ مردان کے خلاصۃ الاخبار کے (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۵ء) مدیر رہے۔ ۴۶۔۱۹۴۵ء میں سابق صوبہ سرحد کے صوبائی مسلم لیگ کے ممبر اور صوبائی جمعیت العلماء کے نائب ناظم تھے۔ ۱۹۴۶ء میں پشاور سے روزنامہ "سرحد" پشتو کی ہفتہ وار اشاعت شروع کی اور مردان سے ہفتہ وار "انصاف" کا اجرا بھی کیا۔ آخر کار ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو وفات پاگئے۔

اثر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت میں ملاکنڈ ایجنسی باجوڑ کی طرف سے مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر تھے اور جیل کی سختیاں بھی برداشت کیں۔ وہ ایک اچھے نثار، محقق اور مؤرخ تھے۔ پشتو کے غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مطالعہ وسیع اور مشاہدہ تیز تھا۔ غزلیات میں پختگی اور سنجیدگی ملتی ہے لیکن جدت اور رنگینی نسبتاً کم ہے۔ بعض اوقات اپنے مقالات میں حقیقت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر عالمانہ، جامع، پیچیدہ اور مشکل ہے۔ فارسی عربی الفاظ کا استعمال عام ہے۔ اس کا ملایانہ انداز طوالت وبوریت کا سبب ہے۔

تصانیف:۔

پشتو نثر، سیرت نبویؐ، پښتنانه شاعران جلد اول، دوم، پشتو ادب، وحدت الوجود، بال جبریل کا منظوم ترجمہ، تیر هیر شاعران، روحانی رابطہ، د قائداعظم د ژوند قیصه، تذکرہ سید جمال الدین افغانی اور بیشتر مقالات بھی ان ہی کا کارنامہ ہیں۔

ترجمے کا تعارف اور تفصیل :۔

بال جبریل کا ترجمہ کلام اقبال کے پشتو تراجم میں، پشتو اکادی کی چھٹی کوشش ہے۔ یہ ترجمہ جان کنی کا کام ہے۔ اور پھر منظوم ترجمہ بذات خود تو اور بھی مشکل اور دقیق ہے۔ اثر نے حتی الوسع کوشش کی کہ ان کا ترجمہ اصل کا عکس، مثالی اور دلکش ہو، انھوں نے علامہ کے فکر وفن دونوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ قاری ایسا محسوس کرتا ہے گویا وہ علامہ کے کلام کا مطالعہ خوشحال ورحمان کی پشتو شاعری کے رنگ میں کر رہے ہیں۔ چونکہ فکر وفلسفہ سے زیادہ روحِ شاعری اور جذبہ کار فرما ہے اس لیے سادہ اور سلیس کلام ہے۔ بال جبریل کا ترجمہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی اور مترجم اپنی منزل کی رکاوٹیں دور کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

علامہ کی شاعری ایمان وایقان، خوفِ خداوندی اور رجائیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہاں وہ ایک مفکر سے زیادہ ایک اعلیٰ شاعر قومی ترجمان کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔ قوم کی قنوطیت اور تن آسانی ان سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ضمن میں وہ ایک نوجوان سے خطاب کرتے ہیں۔

؎ تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

ستا صوفے دی د فرنګ، قالینونه ایرانی
ژړوي مې په سرووینو د زلمو تن آساني(۱)

پھر ساتھ ہی علاج بھی بتاتے ہیں۔

؎ نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضری کی تجلی میں!
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی!

لټون مه کړه ددې څیز تهٔ د تهذیب نوې ځلا کښې
چه معراج د مسلما ن مې دې لیدلې استغنا کښې(۲)

اقبال دشت حجاز کا دیوانہ ہے۔ اس کا دل دکھتا ہے۔ جب وہ مسلمانوں کو تہذیب حاضر کے تصنع اور چمک دمک سے مرعوب دیکھتے ہیں، جس میں سطحی اور تعیش کے سامان موجود ہیں۔ اسلیے تہذیب فرنگ کا پول اس طرح کھولتے ہیں۔

؎ نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

د فرنګ اندازه مه کړه د هغهٔ له پرقه پروقه
د بجلئ په قمقمو کښې دا جوهر کوی ځلا(۳)

علامہ تہذیب و علوم جدیدہ سے سخت بیزار ہیں، اس لیے فرماتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

شکایت مې دې یا ربه! د مکتب له خاوندانو
خاکبازی سبق کښې بنائی ، دوئ بچو ته د بازانو(۴)

علامہ اپنے فرزند ارجمند جاوید اقبال سے خطاب کرتے ہوئے اسے فرنگ کی عیارانہ چالوں سے آگاہ کرتے ہیں اور اسے شیشہ گرانِ فرنگ کے زیرِبار منت نہ ہونے کے لیے پرزور الفاظ میں تاکید کرتے ہیں۔

؎ اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے میناو جام پیدا کر

(۱) قاضی عبد الحلیم اثر، بال جبریل، ص ۱۶۳
(۲) ایضاً، ص
(۳) ایضاً، ص ۷۵ (۴) ایضاً، ص ۵۰

فیرنگیان بنیبنه گران دی، چه احسان ئے پورته نه کړے
له هندی کود نړو څان له تهٔ مینا اوجام پیدا کړه(۱)

علامہ کا تو ایک ایک شعر تجلی کے سوز و براقی کا حامل ہے۔ جس روح کو بھی اقبال کا پیغام ملا اس کو انتہائی بلندیوں اور وسعتوں پر لے گیا۔ مسلمانوں کی کایا پلٹ دی، انھیں خواب غفلت سے بیدار کر کے بلند پرواز اور وسیع النظر بنادیا۔ ان کے دلوں کو وہ سوز و گداز اور تڑپ عطا کیا جس سے انسانیت کی تکمیل ہوئی، مختصر یہ کہ اس مجموعہ کی ہر نظم دلآویز اور نصیحت آمیز ہے۔ اور اس میں بے حد پرواز ہے۔ نظم "پیرو مرید" میں پیر مولانا روم اور مرید خود شاعر مشرق علامہ اقبال ہیں مرید عرض کرتا ہے۔

چشم بینا سے ہے جاری جوے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!

له چشمانو مے سرے وینے رابهیږی
نوی علم نه دین ، ورځ په ورځ خواریږی

مولانا جواب دیتے ہیں۔

علم را بر تن زنی مارے بود!
علم را بر دل زنی یارے بود!

که په تن اووهے علم جوړ ترے مارشی
که په زړهٔ اووهے علم جوړترے یارشی(۲)

اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ جبریل اور ابلیس کے درمیان ہے۔ اس کے علاوہ دین و سیاست کی آمیزش کا فلسفہ کس خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری

راهبئی باندے ولاړ د کلیساوؤ بنیادونه
په دے فقر کبن به کله ځائیدله امیری

اس کے علاوہ پروانے اور جگنو کا مختصر مناظرہ اخلاقی بلندی کا آئینہ دار ہے۔ عبدالرحمٰن اول کے سرزمین اندلس میں پہلا کھجور کا درخت بونے پر جو نظم ہے، وہ اقبال کے آرٹ کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ ایک کھجور کے درخت میں شاعر تاریخ و روایات کے آب و رنگ سے کمال بینی کی تصویر دیکھتا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر انسان کے دل میں معاوہ سب حالات گزر جاتے ہیں جو فاتح عربوں کے ذوقِ عمل کے آئینہ دار تھے۔ عبدالرحمٰن کھجور کے درخت کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

---

(۱) قاضی عبدالحلیم اثر، بال جبریل، ص ۱۹۸
(۲) ایضاً ص ۱۸۰

میری آنکھوں کا نور ہے تو

میرے دل کا سرور ہے تو

زما چشمانو لره نُور تهٔ ئے

ان دزړګی زماسرور تهٔ ئے(۱)

انسان اپنے عمل کے بے پناہ زور سے ہر ماحول پر قابو پا سکتا ہے اور ہر کہیں رس بس سکتا ہے۔ وہ کسی ایک سرزمین سے وابستہ نہیں انسان کی فضیلت خاک کی بدولت نہیں بلکہ اس کے سوزِدروں کی رہینِ منت ہے۔

ہمت کو شناوری مبارک

پیدا نہیں بحر کا کنارا

مبارک، لامبوزنی دِشی همت ته

غاړه هیڅ د سمندر نهٔ معلومیږی(۲)

ہے سوزِدروں سے زندگانی

اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ(۳)

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے

مومن کا مقام ہر کہیں ہے

د مومن د جهان هیڅ نشته بریدونه

هر مقام مومن ته خپل ځائګے ښنکاریږی(۴)

جدید اردو ادب کی شاہکار نظم "مسجد قرطبہ" میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے۔ اس میں آرٹ اور تاریخ اور فلسفہ ایسے خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا اور داد دیتا ہے۔ ہسپانیہ کے اسلامی عہد کی تاریخ کے چند اشارے ضخیم تاریخوں پر بھاری ہیں۔ کائنات کی کوئی بھی شے زمانے کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں۔ علامہ کے نزدیک زندگی ایک متحرک حقیقت ہے اور تغیر و انقلاب سے فرار ممکن نہیں۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات

سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

سلسله د ورځو شپو ده، حادثے چه رغوی

سلسله د ورځو شپو ده، موندِد ژوند او دمرګی

اول وآخر فنا، باطن وظاہر فنا

نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

---

(۱) قاضی عبدالعلیم اثر، بالِ جبریل، ص ۱۳۸ (۲) ایضاً، ص ۱۳۹ (۳) اس شعر کا پشتو ترجمہ شامل نہیں ہے (۴) ایضاً، ص ۱۳۹

هم اول آخر فنا ده ، هم باطن ظاهر فناده

نقش نوے وی کہ زوړوی، د هغے آخر فناده(۱)

لیکن اقبال اپنے نغمے کو مایوسی کی اس لے پر ختم نہیں کرتا، کائنات کی ناپائیداری میں عشق ایسا عنصر ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا، یورپ کے مختلف انقلابات کا ذکر کرنے کے بعد عالم اسلام کا روح پرور نظارہ دیکھتا ہے۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور نظارے کا خواب

اے د اوبو د کبیر واورئے دا په غاړے ستا سے څوک دے

ذا دبلے زمانے چه دے لګیا دے وینی خواب

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

روحِ امم کی حیات کش مکشِ انقلاب

چه پکښ انقلاب نه وی هغه ژوند په مرګ حساب دے

د قومونو د روح ژوند دے کشمکش د اِنقلاب(۲)

بال جبریل کے پہلے حصے کی نظم نما غزل نمبر ۳ اقبال اپنے کمال کے اعلیٰ ترین مرتبے پر جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔ شاعر ذات باری سے التجائیں کرتا ہے، لیکن ان میں بھی شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ہر لفظ سے راز و نیاز افشا ہوتے ہیں اور ان سے شاعر کے تخیل کی بلندی، احساس کی شدت، گہرائی اور پیرایۂ بیان کی بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

ول په ول زلفے دیاره پیچ و خم په څوځو وار کړه

عقل و هوش له مانه یو سه اوس مے زړهٔ نظر هم ښکاره کړه(۳)

اقبال توانائی کا قدردان ہے۔ چاہے وہ عالم فطرت میں ہو یا عالم انسانی میں۔ بعض اوقات لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ اس جذبے کے تحت متضاد خیالات کا اظہار کر جاتے ہیں۔ اس کی محفل میں لینن اور مسولینی، نطشے اور ٹالسٹائے، برگساں اور کارل مارکس، مصطفی کمال اور جمال الدین افغانی پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ فکر کا تضاد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے خیال کی تہہ میں لطیف ہم آہنگی موجود رہتی ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی سب کچھ ہے لیکن منطق نہیں۔ زندگی کے مظاہر کی طرح آرٹسٹ بھی منطق کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ اپنے جذبے کی ہم آہنگی چاہتا ہے نہ کہ منطق کی۔ وہ جذبے کے ذریعے حقیقت پر قابو پاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک خود حقیقت کی روح جذبے میں مضمر ہے نظم "مسولینی" میں فرماتے ہیں۔

---

(۱) قاضی عبدالحلیم اثر، ص ۱۲۷

(۲) ایضاً، ص ۱۳۶ (۳) ایضاً، ص ۸

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ذوقِ انقلاب !
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ملت کا شباب !

نوئے فکر ، عمل څه دے ؟ دے یو ذوق د انقلاب!
نوئے فکر، عمل څه دے؟ په یو قام وخت د شباب(۱)

لینن خدا کے حضور میں اس طرح شکوہ کر رہا ہے۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت !
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات !

دے حکمت، تدبر ، علم، حکومت ئے وینه څکو نکے
په ظاهر د مساواتو معلومیږی روادار

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات ؟

کله ډوبه به کشتئ د زر پرستوشی یاربه؟
د بدل اخستو ورځ ته، د ه نړئ په انتظار(۲)

علامہ اقبال بلبل اور قمری کی تشبیہوں کے بجائے وہ باز اور شاہین کو ترجیح دیتا ہے۔ اس لیے کہ آخر الذکر اس کے وجدان شعری کے لیے زیادہ موزوں ہیں اور ان کے ذریعے سے وہ حسبِ دل خواہ اخلاقی نتائج مرتب کرتا ہے جو اس کا اصل مقصود ہیں۔ "چیونٹی اور عقاب" کے عنوان سے جو دو شعر لکھے ہیں ان میں انسانی سیرت کے رازوں کو تمثیلی انداز میں ظاہر کیا ہے۔ چیونٹی عقاب سے پوچھتی ہے۔

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

زۀ پائمال خوار او خسته یم هم دړد مند
ستا مقام په څه له ستورو دے بلند

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں!
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

---

(۱) ترجمہ بال جبریل، ص ۲۰۲
(۲) ایضاً ص ۱۴۷

تهٔ خپل رزق لټوے په منځ د خاورو کبنې د راه

آسمانونه نهه واړه نه راځی سے په نګاه(۱)

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا

جہاں رزق کا نام ہے آب ودانہ!

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

اوکړه ما د خاورو له هغے آډاتړے دده

نوم چرته چه د رزق دے په تیاره د خوړلو

زهٔ یم لکه درویش په دنیا کښی کبنې د مارغانو

شاهین یم غم ے نشته هیڅ د جالے جوړولو(۲)

زندگی کا اصل محرک اثباتِ خودی کا جذبہ ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے اور اپنی توسیع وبقا کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ عمل پیہم اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہے۔ خودی مثلِ ایک سمندر کے ہے۔ اسکی وسعتیں اتنی ہی ہیں جتنی خود انسان کی ہمت ۔ فرماتے ہیں

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں

توآبِ جو اُسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!

خودی هغه سمندر دے چه هیڅ نه لری کنار

که واله ده تاګنړلے نوزه څه اوکړمه چار(۳)

خودی روحانی شے ہے، جس کی تعمیر سعی وجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلام نے خودی کی آزادی کو عبدیت سے محدود کیا ہے کہ اس کے بغیر اس کی تعمیری صلاحیتیں بروئے کار نہیں آسکتیں اور اس کی حقیقی نشو ونما نہیں ہو سکتی۔ خودی کا اسلامی تصور یہ ہے کہ فرد مخلوق ہے۔ جس کی ذات میں ذاتِ باری نے بے انتہا امکانات پوشیدہ رکھے ہیں۔ جو سب کے سب زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے۔ خودی اپنے شعور کے اعلیٰ ترین نقطے پر پہنچ کر بھی عبدیت کے عقیدے کے مطابق طابع اور محدود رہتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں

خودی کی شوخی و تندی میں کبر وناز نہیں

جو ناز ہو بھی ، تو بے لذّت نیاز نہیں

---

(۱) عبدالحلیم اثر، ص ۲۲۴

(۲) ایضاً، ص ۲۱۸، ۲۱۹

(۳) ایضاً، ص ٦٦

د خودئ ، شوخئی تندئ کښ نشته نشته کبرناز
اوکه ناز پکښ څه هم شته بے لذّت نۀدے له نیاز(۱)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے ،بتا تیری رضا کیا ہے!

خودی دومره کړه اوچته ، چه له هرتقدیر نه مخکښ
خدائے پخپله تپوس اوکړی ، اے بنده ستا رضا څه ده!

مولانا محمد حسین عرشی امر تسر "البیان" کے اقبال نمبر میں لکھتے ہیں کہ ایک صحبت میں میرے ساتھ خوش گلو رفیق تھا اور علامہ کی اجازت سے میں نے انھیں بال جبریل کی مندرجہ ذیل غزل پڑھنے کے لیے کہا۔ جب تک یہ غزل گائی جاتی رہی، اقبال روتے رہے اور میں بھی ان کی اس حالت سے بہت متاثر ہوا۔(۲)

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراش آزرانہ

ترجمه:
دا بتان د نوی عمر چه رغ شوی مدرسو کښ
نهٔ آزر غوندے تراشلی نۀئے نازکافرانه

تیری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا ، نہ شکایت زمانہ

ترجمه:
د اخوتۀ بنده پرورئے چه مے شپے ور ځے تیریږی
نۀ ژړا له زمانے کړم ، نۀ اشنا ځنے مانه(۳)

بال جبریل میں انسان کامل کا تصور اپنے عروج پر ملتا ہے۔ محی الدین ابن عربی اور عبد الکریم جیلی نے بھی انسان کامل کے تصور پر بحث کی ہے۔ نبی کریمؐ نے انسان کامل کا اعلیٰ ترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ انسان کامل یا مرد مومن اطاعت ، ضبط نفس کے مراحل طے کرتا ہوا نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ وہ نفس امارہ سے اٹھتا ہے۔ نفس لوامۃ پر آتا ہے۔ اور نفسِ مطمئنہ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھ خدا کی آنکھ ،اسکا کلام خدا کا کلام اور اسکی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

---

(۱) عبد الحلیم، مترجم، بال جبریل، ص ۵۸

(۲) محمد عبد اللہ قریشی، "اقبال کی باتیں اور ملاقاتیں" صحیفہ اقبال، مرتب، یونس جاوید، بزم اقبال لاہور، طبع اول، نومبر ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۵

(۳) قاضی عبد الحلیم، بال جبریل، ص ۲۳، ۲۴

دموسن لاس حقیقت کبنې که ئے گورے لاس د خدائے دے
هم غالب هم کار ویستونکے ، جوړوی واړه کارونه
چه خاکی نوری سرشت شي نو بنده مولا صفت شي
ورته هیڅ وی ددے دواړو جهانو نو دولتونه(۱)

عقل و عشق اقبال کا اہم موضوع رہا ہے۔ اقبال عقل خداداد کے قائل ضرور ہیں لیکن عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی!

یوه پوهه د دلیل ده، بله نور ځنے پیدا
زیاتوی د دلیل پوهه، که ئے گورے حیرانتیا(۲)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

عقل تش خبر خبر دے نور څه نه دے
خو علاج دِ بس نظر دے نور څه نه دے(۳)

زمان و مکان اقبال موضوع رہا ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی آزاد وہ ہے جو زمانے کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ آزاد زمانے کو اپنا غلام بناتا ہے۔ بال جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے۔ " زمانہ " اس میں زمانہ کائنات وحیات کے اسرار اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری صراحی سے نئے حوادث بوندوں کی طرح ہمیشہ ٹپکتے رہتے ہیں۔ دنیا والے جسے روز و شب کہتے ہیں۔ وہ میری تسبیح کے دانے ہیں جنہیں میں شمار کرتا ہوں۔ اگرچہ میں ہر کسی سے آشنا ہوں لیکن میری راہ ورسم ہر ایک سے مختلف ہے عالم فطرت پر میں عائد ہوتا ہوں لیکن نفسِ انسان مجھے اپنے اندرونی جذب سے تخلیق کرتا اور مجھ پر قابو پاتا ہے۔ کہیں میں راکب ہوں کہیں مرکب اور کہیں تازیانۂ عبرت۔ میرے پیچ و خم ایسے پراسرار ہیں کہ نجومی کی آنکھ حیران و پریشان رہتی ہے۔ پر ان کا پتہ نہیں لگا سکتی۔ ہاں مجھے صرف عارف جان اور پہچان سکتا ہے۔ جو پانی خودی کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر رموز کائنات کا رازدار بن گیا ہو۔

---

(۱) عبدالحلیم اثر، ص ۱۳۲
(۲) ایضاً، ص ۳۱
(۳) ایضاً، ص ۷۰

میرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا، نظر نہیں جس کی عارفانہ!

ترجمہ:۔

د نجو میانو سترگے هیڅ پیژندے نه شی د ا پیچ و خم سے
د چا نظر چه د عارف نه وی ، تل ئے خطا ځی د غشی وار!(۱)

علامہ نے مسجد قرطبہ کے پہلے بند میں زمانے کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔اے مخاطب! تیرے شب وروز کی، یعنی جسے تو زمانہ سمجھتا ہے، ماہیت یہ ہے کہ وہ حقیقی زماں کی ایک رو ہے، جس میں نہ دن ہے نہ رات ہے۔نہ ماضی ہے نہ حال ہے اور نہ مستقبل ہے۔یہاں علامہ نے حقیقی زماں کی ماہیت واضح نہیں کی۔البتہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی خودی سے واقف نہ ہو وہ زمانے کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔اس مسئلہ پر علامہ اقبال نے اجمالاً دوسری منظومات اور تفصیلاً اپنے خطبہ "مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں اظہار خیال کیا ہے۔اقبال متکلمین اور بعض حکمائے مغرب کے مقابلہ میں زمانہ کو حقیقی مانتے ہیں۔بایں معنیٰ کہ وہ خارج میں موجود ہے۔اور "الحقیقۃ" کا ایک لازمی عنصر ہے۔لیکن اس کی ماہیۃ مجہول الکنہ ہے۔یعنی اس کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی ہے یہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اس کی حقیقت کو اپنے باطن میں محسوس کر سکتے ہیں۔گویا حقیقی زمانہ ہمارے ایک باطنی احساس کا نام ہے۔یہ حقیقی زماں، ایک نوع کی تخلیقی فعلیت ہے، جس میں ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہے۔بلکہ اس کو مرور یا دورانِ خالص (Pure Duration) سے تعبیر کرتے ہیں۔اس حقیقی زمانہ، یعنی مرور خالص سے زمان مسلسل پیدا ہوتا ہے۔جسے ہم سلسلۂ روز و شب کہتے ہیں۔حقیقی زمانہ ایک وحدت ہے۔جس کا ادراک حواس خمسہ سے نہیں ہو سکتا لیکن ہمارا شعور اس کا ادراک کر سکتا ہے۔(۲) "مسجد قرطبہ" میں فرماتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات

سلسله د ورځو شپو ده ، حادثے چه رغوی
سلسله د ورځو شپو ده ، مونږ د ژوند او دمرګی(۳)
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات!

---

(۱) قاضی عبدالحلیم اثر، بال جبریل، ص ۱۷۵
(۲) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح بال جبریل، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن، ص ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱
(۳) ترجمہ بال جبریل، ص ۱۲۶

ستا د شپو او ستا د ورځو وایه نور څه حقیقت دے

یو حرکت د زمانے دے شپه او ورځ چه نه لری

بال جبریل کا ترجمہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی، مشکل اس حالت میں، جب اردو زبان وادب پر قدرت رکھنے والے پشتو قارئین اصل اور ترجمے کا موازنہ کرتے ہیں۔ یہ گھڑی مترجم کے لیے آزمائش کی گھڑی ہے۔ غزل نمبر ۲۵ کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ترجمہ	اصل
شان شوکت د سکندر نه بالاتر ده فقیری	نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!
چه په خواست غواړی باجونه نوبیاڅه شوه قیصری	خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!
له بتانو امید وارئے ، له خپل خدائے نه ناأمیده	بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
لږ خو اوښایه تهٔ ماته ، نوره څه ده کافری!(۱)	مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

پشتو زبان وادب کے نقاد، ادیب اور ڈرامہ نگار ترجمہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غزل اور ترجمہ الگ الگ بحور میں ہے۔ اصل کے رواں دواں موجزن بحروں کے زور و شور سے مانوس، نقلی، پھیکی اور متزلزل بحور سے کبھی حظ اٹھا نہیں سکتے۔ سب سے کٹھن مرحلہ وہ ہے جب مترجم شاعر سے شعری تراکیب کا مزہ سُست پڑ جاتا ہے اس کیفیت میں اصل جیسی چستی اور چابکدستی باقی نہیں رہتی (۲)۔ مترجم کا اپنی زبان میں قادرالکلام ہونا ضروری ہے۔ جب ترجمہ پڑھنے والے اصل سے بھی واقف ہوں تو اصل اور ترجمہ میں فرق صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غزل نمبر ۳۴ ملاحظہ ہو۔

ترجمہ	اصل
چه له څانه خبر يد لو چاته عشق اوښائی لار	جب عشق سکھاتا ہے آداب خودآگاہی
غلامانو ته ښکاره شی د شاهئی واړه اسرار	کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
هغه رزق نه مرګ ښه دے اے مارغه د لاهوت تاله	اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
کوم یو رزق کموی چه د الوت درله رفتار(۳)	جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ایسے مقامات جہاں منظومات وغزلیات قافیے کی قید سے آزاد ہوں اور ہر شعر الگ الگ قافیے میں ہو، جہاں ترجمہ فرد فرد اور بیت بیت کا ہو، وہاں ترجمہ قابل ستائش ہے جیسے: "ساقی نامہ" کے یہ اشعار

(۱) قاضی عبدالحلیم اثر، بال جبریل، ص ۷۱، ۷۲

(۲) محمد اعظم اعظم "پښتو کښے اقبال" دوم، ماہنامہ پشتو، مارچ اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۳۸۳

(۳) قاضی عبدالحلیم، بل جبریل، ص ۸۲، ۸۳

﴿ترجمہ﴾	﴿اصل﴾
خیمے لگے کړے کاوان د نوبهار	ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
جنت ساز شو له لمنو د کوهسار	ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گلاب گل ، نرگس سوسن او نسترن دے(i)	گل و نرگس و سوسن و نسترن!
ازلی شهید لاله خونین کفن دے(۱)	شہید ازل لالہ خونین کفن!

قاضی عبدالحلیم اثر نے پوری کوشش کی کہ ترجمہ سادہ، سلیس اور عام فہم ہو۔ انھوں نے علامہ کے فکر و فن کو اپنی گرفت میں لینے کی سعی بلیغ کی ہے لیکن اس کے باوجود بھی جگہ جگہ فکری و فنی خامیاں نظر آتی ہیں۔ اکثر مقامات پر اصلی قافیے استعمال کئے ہیں۔ بعض الفاظ کے تراجم نہیں کئے۔ بعض الفاظ اضافی استعمال کئے۔ املا کی اغلاط، زمانے کی اغلاط اور غیر زبان کے الفاظ قارئین کے لیے بیزاری اور پیچیدگی کا باعث ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جہاں قافیے اصلی ہیں وہاں ترجمہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ ذیل میں ترتیب وار منظومات و غزلیات کا اور ان کے اشعار کا تنقیدی جائزہ لیا جارہا ہے۔

سرورق پر شعر کا پہلا مصرع : اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

ترجمہ :- پاسه چه اوترو خورشید وته سامان دسفر

اس ترجمہ میں خورشید کا ترجمہ "نمر" نہیں گیا۔ مترجم نے بعض الفاظ کے تراجم کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ غزل نمبر ا میں شور حریم ذات، تخیل، تجلیات، حرم، دیر وغیرہ اپنی اصلی حالت میں ہیں۔ آخری شعر غور طلب ہے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

ترجمہ :-

دا دِ څه نا پسندے اوکړے زهٔ دِ هم آخر ښکاره کړم
ومه نغښتے په پردو کښې، زهٔ يوراز ووم کائنات کښې

ترجمے کی بحر مشکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا غضب کیا کہ مجھے آشکارا کر دیا۔ میں پردوں میں لپٹا ہوا ایک رازِ کائنات تھا۔ "پردوں میں لپٹا ہوا" کے الفاظ اضافی ہیں دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہئے۔

---

(۱) عبدالحلیم، بال جبریل، ص ۱۴۴

(i) سوسن اور نسترن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

زۀ خو هم ومه يو راز په سينه د کائنات کښې

غزل نمبر ۴ میں صیاد اور غزل نمبر ۷ میں غمزہ کا ترجمہ نہیں کیا۔ غزل ۷، ۸ میں ردیف "ساقی" ہے۔ اسی طرح ترجمہ میں بھی ساقی کو ردیف قرار دیا ہے۔ غزل نمبر ۸

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی(i)
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی!

بنړ د خيرنے شو خالي له شنو زمريانو څنے
تش د صوفي او ملا پاتے غلام اے ساقي

ترجمہ کافی دلکش اور خوبصورت ہے۔

غزل نمبر ۹ میں :۔

ع نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب!

ترجمہ میں کسی لفظ کے ردوبدل کی ضرورت محسوس نہیں کی بجز رباب (رباپ) کے۔ اسی غزل کا تیسرا شعر :۔

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو!

ترجمہ :۔

د میکدے د ګدا شان ډیر نیازئ اووینه
آبِ حیات چینه چه مومے کوزه ماته کړه بیا

لفظ "گدا" نہیں "گدا" ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب تم چشمۂ حیواں تک پہنچ جاؤ تو سبو توڑ دو جو کہ غلط ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے

آب حیات چینه چه مومي کوزه ماته کړي بیا

غزل نمبر ۱ میں قافیے تقریباً اصلی ہیں، جیسے الوندی، خداوندی، پابندی، لیکن جہاں پر اصلی قافیے کی پابندی نہیں رہی وہاں مترجم شاعر مفہوم ترجمہ کرنے میں تو کامیاب ہوئے ہیں لیکن فنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جیسے مندرجہ ذیل مصرعے :

ع چه نکر یخے فطرت خپله ریدی ګلی لره بردی
ع ولے اور تازه کوی مے چه اوردیږی جدائی
ع دے شاهین لره ذلت چه څان له جاله جوړوی

(i) بیشہ بمعنی جنگل ۔ ن

غزل نمبر ۱۱۔ میں بھی قافیے تازیانہ، کافرانہ، آشیانہ، جاویدانہ، وغیرہ اصلی ہیں۔ غزل نمبر ۱۴ میں ہم عناں، بیکراں، فغاں جوں کے توں ترجمہ میں موجود ہیں۔ غزل نمبر ۱۵ میں تیسرا شعر :۔

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی!

ترجمہ :۔ که فریاد مے اوس تر ستورو، اورسیږی په دے څه شی
د غزل وئیلو چل چه رابنودلے دے هم تا

ترجمہ کے پہلے مصرعے میں فعل ماضی مطلق اور دوسرے میں ماضی قریب ہے۔ اس لیے زمانے کا فرق ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

که فریاد مے اوس تر ستورو، دے رسیدلے په دے څه شی
د غزل و ئیلو چل چه رابنودلے وو هم تا

غزل نمبر ۱۶ میں قافیے ہنر مند، خداوند، پند، پازند، نظربند، پیوند، سمرقند وغیرہ اصلی ہیں۔ اصلی قوافی پر مبنی ترجمہ میں اگرچہ فنی خوبیاں عروج پر نظر آتی ہیں لیکن حقِ ترجمہ کماحقہ، ادا نہیں ہوپاتا۔ بنابریں غیر زبان کے الفاظ قاری کے لیے پیچیدگی اور بیزاری کا سبب بنتے ہیں۔ مترجم نے ان الفاظ کے مترادف تلاش کرنے میں اگرچہ سعی کی ہو گی لیکن شاعر کے لیے بڑا مسئلہ قافیہ پیائی ہے۔، جس کی وجہ سے شاعر فطری مجبوریوں کے چنگل سے اپنا دامن نہیں چاسکتا، لیکن یہ قباحت آخر کار اس کی کامیابی پر منتج ہو جاتی ہے اور ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

بال جبریل کے حصہ دوم، غزل نمبر ۳ میں جنوں، زبوں، گوناگوں، گردوں، کن فیکون، فسوں اور جیحوں اصلی قوافی ہیں۔ غزل نمبر ۴ کا ترجمہ لفظی ہے۔ جس کی وجہ سے معنوی اور فکری خوبیوں کا اندازہ لگانا قاری کے لیے مشکل ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عالمِ آب و خاک وباد! سِرّ عیاں ہے تو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں ؟
وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں ؟

ترجمہ :۔

د عالم د اوبو خاورو، رازعیاں ته ئے که زهٔ
له نظر چه پټ دے هغه بل جهان ته ئے که زهٔ
درد او سوز او غم نه ډکه، شپه چه ژوندور ته وایه شی
زهٔ که تهٔ د دے سحر یو، او اذان ته ئے که زهٔ؟

غزل نمبر ۷ کا آخری شعر :۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا، نہ تن

ترجمہ :۔ زهٔ له شرمه کړم خولے د قلندر دغے خبرے
که موسر بنکته کړو غیر ته، خپل موزړونه، نهٔ تنونه

مجھے قلندر کی اس بات نے شرمندہ کر کے پسینے سے شرابور کیا۔ پہلے مصرعے میں اگرچہ "پسینے" (خولے) کا لفظ اضافی ہے، پھر بھی معیوب نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں "سر" کا لفظ بھی اضافی ہے۔ غزل نمبر ۸ کا چوتھا شعر :۔

قلندر جز دو حرف لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ترجمہ :۔ بے دده تکو لا الٰه نه قلندر سره هیڅ نشته
جمع کړی لغتونه ، حجازی دی عالمانو

دوسرے مصرعے کا مطلب ہے کہ حجازی علمانے لغات جمع کئے ہیں۔ لفظی ترجمہ ہے مگر وہ بھی نامکمل جس سے فکری خوبی واضح نہیں ہوتی۔

غزل نمبر ۹ میں :۔

ع آدمی کے ریشے ریشے میں سماجاتا ہے عشق

ترجمہ :۔ د بنده په بیل بیل رنګ کښی ننوځی عشق داهسے (رنگ کی جگہ رگ چاہیے)

مزکورہ غزل میں ہم، دم، نم، جم، شکم اور حرم اصلی قافیے ہیں۔ غزل ۱۰ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فلسفہ، شاعری اور موسیقی تینوں فنون کا خوش آئند امتزاج پایا جاتا ہے۔ ترجمہ بھی مثالی اور خوبصورت ہے کیونکہ بیباک ، نمناک، ادراک، چاک، افلاک، خاشاک اور لولاک اپنی اصلی صورت و قوافی میں جلوہ گر ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بےباک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

ترجمہ :۔

دے ستا زړهٔ خالی له سوزه هم نظر دے نه دے پاک
بیا حیران ولے په دائے که تهٔ هم نهٔ ئے بیباک

پټ په دے خاوره کښ پروت دے کوم چه ذوق د تجلیٰ دے
مگر اے غافله تا کښ هډو هیڅ نشته ادراک

غزل نمبر ۱۲ میں مضامین کی ندرت ودلکشی اور زور بیان و سلاستِ زبان عروج پر ہے۔ اس میں گواہی، شاہی، راہی، سپاہی اصلی قافیے ہیں۔ غزل نمبر ۱۳ اقبال نے قرطبہ (اندلس) میں قیام کے دوران لکھی۔ یہاں اقبال عربوں کی عظمت رفتہ کے نقوش سے بہت متاثر ہوئے۔ اس میں تغزل کی بجائے تفکر اور فلسفے کا رنگ غالب ہے۔ اس میں قافیے حجاب، رکاب، گرداب، رباب، خراب، محراب، سیماب اور شباب اصلی ہیں۔

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہائے پابرکاب!

ترجمہ:۔

دا حورانے د افرنگ دی زړه نظر لره حجاب!
دے جنت د مغربیانو څو جلوے پښنه په رکاب!

غزل نمبر ۱۴، کے ترجمے کی بحر مشکل ہے۔ مصرعوں کی طوالت پیچیدگی اور اکتاہٹ کا باعث ہے۔ قاری اصل پڑھنے کے بعد ترجمے کی مشکل بحروں سے تنگ آجاتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

ترجمہ:۔

خاوند د ویښ زړهٔ لکه فاروق دے، خاوند د ویښ زړه لکه کرار
مس دآدم نه به سرهٔ زر جوړ کړی، هغه کیمیا ده زړګے بیدار

غزل نمبر ۱۵، اصل میں "نہیں" ردیف ہے۔ ترجمہ میں ردیف کا ستعمال مفقود ہے بلکہ قافیے سے ترجمے میں چستی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ اس غزل کے ترجمے میں یہی کیفیت عیاں ہے۔ غزل نمبر ۱۶ میں صف، ہدف، صدف، تلف، شرف، کف، لاتخف اور نجف اصلی قافیے ہیں۔

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیر نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف

میر د فوځ چه نالائق شی لښکریان ئے وران کړی صف
هائے په هغه نیمکښ غشو، چه هیڅ نهٔ لری هدف!(۱)

---

(۱) اثر، بال جبریل، ص ۶۰

غزل نمبر ۷ ایورپ میں قیام کے دوران لکھی گئی ہے۔ ترجمے میں سحر خیزی، کم آمیزی، پرویزی، چنگیزی اور دلآویزی اصلی قافیے استعمال ہوئے ہیں اس غزل کا آخری شعر اٹلی کے پایہ تخت "روم" کی سیر وسیاحت کے بعد لکھا گیا ہے۔

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے

وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی!

ترجمہ :۔

دلته رومة الكبرئ كښې ، ډيلے ماته راپه يادشو

آعبرت ، هغه عظمت ، هغه شان دِلآويزی(۱)

غزل نمبر ۱۹ کے قافیے اصلی سے مختلف ہیں۔ پھر بھی مترجم اصل کا عکس پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نے نہ ساقئ مہوش تو اور بھی اچھا

عیارِ گرمئ صحبت ہے حرفِ معذوری

که زما ساقی یے مخے ، داوانۀ وری نولاهم ښۀ

د مجلس گرمی كتله، ما د عذر په دے قال(۲)

شاعر نے حرف کا متبادل قال استعمال کیا، جو اس کے قافیہ پیائی پر دال ہے۔ غزل نمبر ۲۰ کے مصرعے مختصر ہیں لیکن ترجمے میں طوالت اور پیچیدہ بحریں الجھن کا باعث ہیں۔

علم میں بھی سرور ہے لیکن

یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

په ظاهر علم كښې شته سرور خوهم دا

جنت داسے چه د حورو قصور نه دے(۳)

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا

کہاں سے آئے صدا لا الٰہ اِلا اللہ

خاوندانو د مكتب خومرئ تالره خپه كړه

غږ د لا اله به راشي، راته وايه له كوم خوا(۴)

(۱) اثر ، بالِ جبریل، ص ۶۳

(۲) ایضاً ص ۶۴

(۳) ایضاً ص ۶۵ (۴) ایضاً ص ۶۹

ترجمہ میں لاالٰہ الا اللہ کا مکمل کلمہ ضروری تھا کیونکہ لاالہ سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مذکورہ غزل میں :

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

ترجمہ :۔

دَ مکتب او د خانقاه نه ډیر غمگین شومه راپورته

دلته ژوند ، معرفت ، مینه او نظر دی تول عنقا

مترجم نے عنقا کہہ کر ساری مذکورہ چیزوں کی نفی کردی ہے جو کہ خوش آئند ہے۔ غزل نمبر ۲۷ میں

ع گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

ترجمہ : د ګوهر خوبس جوهر دے نور څه نه دے

یہ گوہر تو بس جوہر ہے۔ اور کچھ نہیں، جس سے آب جوہر کا مطلب واضح نہیں ہوتا ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے :۔

دے ګوهر کبښ خوبرېښنا ده نور څه نۀ دے

غزل نمبر ۲۷ کا ترجمہ مشکل، پیچیدہ اور بحریں طویل ہیں اصل میں جو چستی، بندش، سلاست اور روانی ہے۔ ترجمہ اس کے برعکس ہے نمونہ ملاحظہ ہو :۔

ثوابے اسیر مکاں! لامکاں سے دور نہیں

وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

لرے تۀ نۀ ئے له لامکانه، اے په مکان کبښ ګیره دلے

ترجمہ :۔ د خاورین کورنه د لرے نه دے ځائے چه یادېږی کوم د جلوے

غزل نمبر ۲۸ یورپ میں لکھی گئی ہے۔ اصل قافیے استعمال کر کے مترجم اقبال کے فکر و فن کو قابو کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن رندانہ، میخانہ، ویرانہ اور فرزانہ پشتو قارئین کے لیے مشکل الفاظ اور قافیے ہیں

ترجمہ	
عقل ماته بخښښ کړ، یو نظر حکیمانه	عشق نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ!
هم را اوښودلے ماته عشق خبری رندانه	سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ!
نۀ شراب نۀ صراحی ده نه ګردش د پیمانے	نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دور پیمانہ
بس رنګین په یو نظر دے دغه بزم جانانه	فقط نگاہ سے رنگین ہے بزم جانانہ

غزل نمبر ۲۹ میں سعی و عمل کا پیغام اور انجام بتایا گیا ہے۔ ترجمہ میں ردیف مستعمل نہیں ہے۔ قافیے اصل ہیں اور بحریں چست ہیں، اس لیے ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ غزل نمبر ۳۰ کی خصوصیت موسیقیت کی بنا پر ہے

اس میں بھی قافیے اصلی ہیں اور اصل الفاظ کا استعمال زیادہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی!	هر څيز مسافر هر شے دے راهي
کیا چاند تارے، کیا مرغ وماہی!	څه سپو مئ ستوری څه مرغ و ماهي
پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے	سترګو ليدلے پير د حرم دے
کردار بے سوز! گفتار واہی!	بے سوزه کردار، پوچ ګويه واهي!(۱)

غزل نمبر ۳۱ کے ترجمے میں ردیف مفقود ہے۔ جس طرح دوسری غزلیات کے ترجمہ میں ہے۔ قافیے اصلی ہیں لیکن خودی کا قافیہ مختلف ہے۔ جس میں ترمیم کی ضرورت ہے نمونہ ملاحظہ ہو

بے ذوقِ نمود زندگی موت	بے له ذوقه ذ نموده ژوندون مرګ دے
تعمیر خودی میں ہے خدائی	د خودئ تعمير کښ پټه ده خدائي
رائی زورِ خودی سے پربت	د خودئ په زور دانه د اوری غرشي
پربت ضعفِ خودی سے رائی!	غر اورے شي چه کمزوری شي خودی(۲)

غزل نمبر ۳۴:۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
چه له ځانه خبر يدلو چاته عشق اوبنائي لار
غلامانو ته ښکاره شي د شاهين واړه اسرار

"شاہین" کی جگہ "شاہیؒ "چاہیے۔

آئین جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
بيباکي که حق ګوئي ده داآئين دے د ځوانمردو
د الله د زمری نه زده د ګيدړ زيست و روزګار!(۳)

روباہی بمعنی فریب، مکر، دھوکہ اور جھوٹ کے ہیں کیونکہ روباہ (لومڑی) میں یہی صفات پائی جاتی ہیں اسلیے ترجمے میں گیدڑ کی جگہ لومڑی چاہیے اس لحاظ سے دوسرا مصرع اسطرح ہوگا۔

د الله د زمری نه زده د لومبړے زيست روزګار

(۱) ترجمہ بال جبریل ص ۷۸، (۲) ایضاً ص ۷۹، (۳) ایضاً ص ۸۳

غزل نمبر ۳۸ کے ترجمے میں مصرعے طویل اور پیچیدہ ہیں۔ بحروں کی طوالت پر نثر کا گمان ہوتا ہے جبکہ اصل مصرعے مختصر اور دلکش ہیں۔ ترجمے میں اکثر الفاظ کے مترادف کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی فعفوری، مجوری، بے نوری، بینائی اور مستوری جیسے قوافی پشتو قارئین کے لیے پیچیدگی کا باعث ہیں۔ نمونہ

یہ پیرانِ کلیسا و حرم ! اے وائے مجبوری!
صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!

پیران دکلیسا ا وحرم گوره چه څه رنګ شول هائے بدے مجبورئ !
انعام کبنې دکوشش او ډکاوش ئے اوموندے، سینو کبنے بے نورئ(۱)

غزل نمبر ۳۹ کے آخری شعر کے ترجمے میں "زراوستم" کی بجائے زراوسیم چاہیے تھا۔ ترجمہ کے مصرعے بے جا طویل ہیں :۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

دے چالاک ډیر زیات عقل ځان بدل کړه په‌سل رنګه
غریب عشق نه ملا دے ،نه زاهد دے ،نه حکیم(۲)

غزل نمبر ۴۰ میں

ع تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں

ترجمہ :۔

ګوره دغه فضاګانې له ژوند و نه خالي نه دي
"ژوندو کی جگہ "ژوندون "چاہیے یہ مصرع :اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا

ترجمہ :۔

ددے شپو ورځو لا نجه کبنې چرته بنکیل ته پاتے نه شے
مترجم نے" بنکیل" کالفظ کہہ کر ترجمے کو نہایت با مقصد اور دلکش بنادیا ہے۔ اس غزل کا آخری مصرع :۔

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں
اوس خبرسے په رازونو عالمونه شته دے نور

بامحاورہ ترجمہ ہے

غزل نمبر ۴۱ میں مترجم نے افشا، رندی، تشنہ کام اور سلطنت جیسے الفاظ کے تراجم ضروری نہیں سمجھے غزل نمبر ۴۳ کا ترجمہ خوبصورت، دلکش اور معیاری ہے۔ بحریں چست اور مختصر ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو

---

(۱) ترجمہ بال جبریل، ص ۸۷
(۲) ایضاً ص ۸۸

منزل رہرواں دور بھی دشوار بھی ہے	ڈ منزل په لوری لاره هم اوږ ده هم کنډ کبر ده(i)
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے۔	خو ک په دغه قافله کښې راته وایه سالار هم شته (۱)

غزل نمبر ۴۷ میں مقصد حیات کو دلنشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ الفاظ کی بندش و چستی اور موسیقیت عروج پر ہے لیکن ترجمے کی طویل بحریں شعریت کے دامن کو تار تار کرنے کا باعث ہیں نمونہ دیکھیں :۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ !	آمرغلره چه یکی یوه ده، داسې راځي نه ستا په ولقه
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ !	چه آزادی اویک رنګی نه وی ستا په همت کښې تر څو پرته
یا سنجر و طغرل کا آئین جہانگیری	یا د سنجر او طغرل آئین دے د تول جها ن د تسخیر کولو
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ	یا د شاهانو غونډے د مرد قلندر بویه طور طریقه(۲)

اس کے علاوہ اسی غزل کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں "حکیم" کی جگہ "کلیم" املا کی غلطی ہے۔
غزل نمبر ۴۹ مسلسل ہے، اس میں خاک عشق کی بدولت جو کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے، اس کا ذکر ہے۔ اس غزل کا ترجمہ حسین ہے اور مترجم کی کاوش عروج پر نظر آتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو

وہ خاک ، کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی	هغه خاوره چه د جالے جوړولو پروانه کړی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک	د چمن ویړه لمن کښې ډکی نه تولو ی دا(ii)
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو	دغے خاورے ته بخښلے هغه اوښکے الله پاک دی
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک !	چه خوله د شرمه ستوری کړی ددے اوښکو ځلا(۳)

غزل نمبر ۵۰ میں :۔

ع رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم

ترجمہ :۔

د بامبڼ چه طلسمات وو، رشي مات نهٔ کړل په ولږو

ترجمہ میں رشی(iii) کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ غزل ۵۱ تین اشعار پر مشتمل ہے۔ اقبال نے اپنی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ترجمہ بھی دلکش اور پر تاثیر ہے۔

(i) "کنډ کبر" پشتو کی ایک خوبصورت اصطلاح ہے جس سے شعر کا حسن قائم ہوا ہے۔ (ii) "ډکی نه تولوی دا" پشتو کی خوبصورت اصطلاح ہے۔

(۱) ترجمہ بال جبریل، ص ۹۳ (۲) ایضاً ص ۹۸ (۳) ایضاً ص ۱۰۱

(iii) رشی :۔ خدا پرست، عابد، زاہد، یہ لفظ ہندو بھگتوں اور عابدوں کے لیے مخصوص ہے۔ اقبال نے یہاں گاندھی جی کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور برہمن سے مراد برطانیہ ہے

غزل ۵۲ میں مترجم نے بعض قافیوں کو ردوبدل کے ساتھ پیش کیا ہے بعض مقامات پر ترجمہ بامحاورہ ہے

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی	نه خو پاتے شوله گوټه نه ئے پاتے شوه بازی
جیتا ہے رومیؔ ہارا ہے رازیؔ!(i)	روی اوکړه دے کبش گټه او بیلات اوکړو رازیؔ
روشن ہے جام جمشید اب تک	د جمشید جام لاتر اوسه که ئے گورے دے روښان
شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی	بے دوکے او بے فریبه نامکنه ده شاهي

غزل ۵۳ میں ترجمے کے قافیے ڈانواڈول ہیں جیسے هغه، سره، تلونکیه، نه ده، صله جس کی وجہ سے ترجمہ پھیکا اور بد مزہ معلوم ہوتا ہے۔اس شعر کا ترجمہ بامحاورہ ہے :۔

گرمِ فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ
وائے وہ رہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ!

سر دے په نعرو جرس ،پاسه درومی قافله
طمع دسور لو چه کړی پاتے په میرو هغه

"۔پاتے په میرو هغه" کے الفاظ اضافی ہیں یعنی جو سواری کا انتظار کرتا ہے وہ دشت میں رہ جاتا ہے

غزل نمبر ۵۷

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی!
دیا ہے میں نے انھیں ذوق آتش آشامی

ترجمہ:۔

په نوا زما ژوندی شول ، عارفان دی که عامی
خوندے دوی ته دے ښودلے څرنگ خلق اور شومی

دوسرے پشتو مصرے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے انھیں یہ لطف دیا ہے کہ لوگ کس طرح آگ تاپتے ہیں۔حالانکہ آتش آشامی سے مراد شراب نوشی (عشق) ہے۔اکسٹھ ویں غزل کے بعد ایک قطعہ ہے، اور پھر رباعیات ہیں ان رباعیات میں اقبال نے تشبیہات، استعارات اور کنایوں کی زبان بکثرت استعمال کی ہے۔ یہ رباعیات حقائق و معارف سے بریز ہیں۔ اس کی بحریں چست اور دلکش ہیں۔ مترجم نے اکثر رباعیات کا لفظی ترجمہ کر کے مصرعوں کو طویل اور بحروں کو متزلزل بنادیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو

مکانی ہوں کہ آزاد مکاں ہوں؟
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں!

(i) فلسفہ و حکمت کے امام رازی اس کی بنیاد پر کسی منزل پر نہ پہنچ سکے ۔جبکہ زندگی میں کامیابی کے لیے سینہ عشقِ حق سے معمور ہونا ضروری ہے مصرع میں رازی کا مہرہ اور مہرہ بازی مقصود ہے۔

اوسیدونکے د مکان یم که ساکن د لامکان

زهٔ لیدونکے د جهان یم که پخپله یم جهان

لا مکان کښِ دِ دے اوسی تل تر تله په مستئی کښِ

خو په دے د کړی ما پوهه چه دے چرته زما ځان

آخری پشتو مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس پر سمجھادیں کہ یہ میری جاں کہاں ہے۔لہٰذا ترجمے سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔
ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

چه په دے دِ کړی ماپوهه چه زهٔ چرته دازماں

ایک دوسری رباعی ملاحظہ ہو۔

ہراک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل	بنکاری زرہ هره ذره کښِ یو پټ پروت دے انغاړلے
اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل	هم په دے جلوت کښِ دے دے چه خلوت ئے دے نیولے
اسیر دوش و فروا ہے و لیکن	دا منم چه بندیوان هم د صبا هم د بیګا دے
غلام گردشِ دوراں نہیں دل	خوغلام جرے گردش د زمانے نهٔ دے ساتلے

آخری مصرعے کے ترجمے کا مطلب یہ ہے کہ غلام نے گردشِ زمانہ کا ساتھ نہیں دیا۔دوسرا مطلب یہ ہے کہ دل اگر چہ غلام ہے لیکن گردش زمانہ سے نالاں ہے۔، لیکن دونوں مطالب باطل ہیں ترجمہ میں ردوبدل کی ضرورت ہے۔اِسی طرح ایک اور رباعی کا ایک شعر:۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر	خو ک شعیبؑ غونډے که چاته په لاس ورشی
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے	شپونکی توب د دکلیمیؑ نه یو قدم دے

دوسرے مصرعے میں "یو" کی جگہ "دوه" چاہیے۔ نظم عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت کے ترجمے میں اس شعر کا ترجمہ مفقود ہے۔

ہے سوز دروں سے زندگانی

اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ

نظم "طارق کی دعا" میں

ع یہ غازی یہ تیرے پرٔاسرار بندے

ترجمہ :۔ دا غازیان د انالیدلی پراسراره بندګان ستا

ترجمہ میں "نالیدلی" (اَن دیکھے) کا لفظ اضافی ہے۔اس کے علاوہ ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔

نظم "لینن" میں

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

خو چینه دَ حیوان نشته دے تیرو کبش یا غفار

ترجمہ میں "حق یہ ہے" کو یا غفار سے بدل دیا ہے۔ نظم "ذوق و شوق" کے پانچ بند ہیں۔ یہ دراصل نعتِ رسول مقبولؐ ہے مترجم نے شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے زیادہ تر اصل الفاظ کا سہارا لیا ہے۔

گرمئ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

بیلتون شور دے هم غوغا هم گرمی د آرزو
هم لتون دے د چپے هم د څاڅکي دے ابرو

نظم "جاوید کے نام" کے ترجمے میں سراغ، چراغ، فراغ، زاغ، بے داغ اور دماغ اصلی قافیے استعمال ہوئے ہیں

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ

فقط دا قدرے وینا چه د مقصود خاوند آدم دے
دا لری فروغ زر چنده هم هزار گونه فراغ(۱)

(ترجمے کا مطلب واضح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے قاری کوئی مطلب حاصل نہیں کر سکتا)

نظم "گدائی" میں اقبال نے واضح کیا ہے۔ کہ ملوکیت بھی گدائی کی ایک قسم ہے۔ مترجم شاعر نے بے حیا "قبا، کیمیا، بے نوا اور گدا کے اصل قافیے استعمال کئے ہیں۔ ملا اور بہشت، دین و سیاست ، الارض للّٰہ ، ایک نوجوان کے نام، نصیحت اور لالۂ صحرا میں شاعر نے ترجمہ کرنے میں کا کمال دکھایا ہے۔ لالۂ صحرا، اقبال کی ایمائی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس کا ہر مصرعہ استعارہ، کنایہ اور مجاز سے لبریز ہے۔ گل لالہ اقبال کی عاشقانہ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ "ساقی نامہ" محاسنِ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے اقبال کی بہترین اردو نظموں میں سے ہے۔ چونکہ اس نظم کا ہر شعر الگ الگ قافیے اور ردیف میں ہے۔ اس لیے یہاں مترجم شاعر نے قافیہ پیمائی سے آزاد ہو کر ترجمے میں کمال دکھایا ہے۔ لیکن سوسن، نسترن، خونین، حیات، راگ، زنار پوش، سالک، ثابت، سیار، مرغزار شش جہات، سومنات، چنگ، جولاں، ازل، ابد، ریگِ رواں، تقویم، زہر ناب، آب، خاکداں، گردشِ روزگار جیسے الفاظ اصلی حالت میں ترجمے میں جوں کے توں موجود ہیں۔ بعض اشعار کا ترجمہ نہایت معیاری ہے۔ جو اصل کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

(i) یہ ایک بات کہ آدمی اس دنیا میں ایک اہم مقصد لے کر آیا ہے۔ ہزار قسم ترقیوں اور ہزار قسم کے اطمینان و دل جمعی کا باعث ہے۔

وہی نان ہے اس کے لیے ارجمند	بختوره ورله ده هغه دودئ
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند	چه پرِ پائی په دنیا هسکه غرئ
ع تری خاک اس خاکداں سے نہیں	چه اورستا نه وے پیداله دے جهانه

ترجمہ میں "وے" کی جگہ "دے" چاہیئے

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں اور روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، پیرو مرید، جبریل و ابلیس، اذان، محبت، جیسے منظومات کے تراجم مثالی ہیں۔ ستارے کے پیغام میں قافیے اصلی ہیں ملاحظہ ہو۔

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی	داتیرے د فضاګانو، نه شی ماهیڅ ویرولے
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی	په خمیر کبن مے اخبنلے ده پاکی درخشانی

نظم "مسولینی" میں اصل اور ترجمے کا فرق ملاحظہ ہو۔

رومۃ الکبرٰی ! دگر گوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بیداری است یارب یا خواب!

ستره روسه! زړګے ستاشوکه پوهیږے په بل شان
دا چه زهٔ خه وینم ربه وی په ویبنه که په خواب!

پہلے مصرعے کا مطلب ہے کہ اے عظیم روم! تیرا دل دوسری طرح سے تبدیل ہو چکا ہے۔ دگرگوں ہو جانا اور تبدیل ہونے میں فرق ظاہر ہے۔

بحیثیت مجموعی قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کا منظوم ترجمہ مندرجہ بالا خامیوں کے باوجود بھی ترجمے کا حق ادا کرتا ہے۔ اگر مذکورہ خامیوں اور اغلاط پر نظر ثانی کی جائے تو ترجمے کا معیار منفرد اور مثالی ہو سکتا ہے۔ پشتو زبان و ادب کے نقاد مولانا عبدالقادر بال جبریل کے دیباچے میں رقمطراز ہیں۔ کہ پشتونوں کے دل بالعموم ہیرے کی مانند سخت ہیں شاید اقبال کے نرم و نازک اور دلکش کلام (بال جبریل) کے پشتو ترجمے سے پگھل کر موم کی صورت بن جائے اور علامہ کی تعلیمات کے زیر اثر عرفانِ نفس و ذات سے مالا مال ہو کر جہاں بانی کے مراتب پر فائز ہو جائیں۔ پشتونوں میں عرفانِ ذات اور جہاں بانی کے اوصاف پہلے سے موجود ہیں اگر یہ اسلامی تعلیمات اور اخلاق کے پیکر بن جائیں تو وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ اقوام عالم عروج وزوال کے مراحل طے کرتی رہتی ہیں اور یہ سلسلہ روزو شب بتدریج جاری ہے۔ اس سیل رواں میں پشتون بھی شامل ہیں جو ذہنی و طبعی صلاحیتوں کے رکھوالے ہیں اگر یہ دورِ جدید کے علوم و فنون اور سائنسی تربیت سے، قوائے فطری کے سبب کماحقہٗ

مستفید ہو جائیں تو اس کی برکت سے وہ تمام نوعِ انسانی کی رہنمائی کے منصب پر متمکن ہو سکتے ہیں۔ اگر اخلاقی نظام پشتنی ہے اور عقیدہ و ایمان اسلامی، تو پشتون علامہ کی تعلیمات کی روشنی میں اقوام کے روزگارِ حیات کے مسائل اُن خطوط پر حل کرے گا، جو انسانی معاشرے کی سالمیت اور بقا کا ضامن ہو گا۔(۱)

﴿۔۔۔ قاضی عبدالحلیم اثر اور عبداللہ جان اسیر کے تراجم کا معیار ۔۔۔﴾

قاضی عبدالحلیم اثر :۔

ترجمے میں اکثر اصلی قوافی مستعمل ہیں جن سے بحریں چست اور پر کشش ہیں، لیکن غیر زبان کے الفاظ پشتو قارئین کے لیے غیر مانوس ہونے کی وجہ سے بیزاری اور مشکلات کا باعث ہیں۔ ترجمے میں اردو الفاظ کے استعمال سے مترجم کی سعی و ہمت پر نہ صرف حرف آتا ہے بلکہ ان کی تن آسانی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اگرچہ مصرعوں کا اختصار قائم اور الفاظ و تراکیب کا تناسب درست رہتا ہے مگر ترجمے کا وہ مقصد پورا نہیں ہوتا، جس کے لیے اس بھاری ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کا قصد کیا گیا ہے۔

ایسے مقامات جہاں منظومات و غزلیات قافیے کی قید سے آزاد ہیں اور ہر شعر الگ الگ قافیے میں ہے۔ جہاں ترجمہ فرد فرد اور ببیت بیت کا ہے وہاں ترجمہ قابل تعریف و ستائش ہے۔ جہاں ترجمہ آزاد ہے اور اصل قوافی مستعمل بھی نہیں وہاں بحور طویل ہو گئی ہیں اور ترجمہ پیچیدہ نثر بن کر رہ گیا ہے۔ قاری اصل پڑھنے کے بعد ترجمے کی مشکل بحروں سے تنگ آجاتا ہے۔ بعض مقامات پر لفظی ترجمے نے مصرعوں کو طویل اور بحروں کو متزلزل بنادیا ہے۔

بعض مقامات پر اصل میں ردیف کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن ترجمے میں صرف قافیے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور اسی سے ترجمے میں چستی کا رنگ بھرا ہوا ہے جو کہ معیوب نہیں۔

بعض مقامات پر قافیے اصل سے مختلف ہیں اور شاعر اصل کا عکس پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بعض تراجم اصل الفاظ و تراکیب کی وجہ سے مشکل، پیچیدہ یا بحروں کی طوالت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اصل مصرعوں میں جو چستی، بندش، سلاست اور روانی ہے ترجمہ اس کے برعکس ہے، جس کی وجہ سے شعریت کا دامن تار تار ہو کر رہ گیا ہے۔

بعض اشعار کے دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہیں۔ اصلی قوافی کے علاوہ بھی اکثر الفاظ اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں اور شاعر مترجم نے ان کے پشتو الفاظ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بعض تراجم مثالی اور قابل تعریف ہیں۔ الفاظ و تراکیب اور محاورات قابل تحسین ہیں۔

بعض قافیے غلط ہیں اور بعض اصلی الفاظ کا مطلب بھی غلط لیا گیا ہے۔ چند ایک شعر کا ترجمہ بھی مفقود ہے۔ جب اردو زبان و ادب پر قدرت رکھنے والے پشتو قارئین اصل اور ترجمے کا موازنہ کرتے ہیں اور جب غزل (اصل) اور ترجمہ الگ الگ بحروں میں ہو تو اصل کے رواں دواں موجزن بحروں کے زور و شور سے مانوس قارئین، نفلی پھیکی اور متزلزل بحور سے کبھی حظ نہیں اٹھا سکتے۔ شاعر سے جب شعری تراکیب کا مزہ سُست پڑ جاتا ہے تو اصل جیسی چستی اور چابکدستی باقی نہیں رہتی۔

---

(۱) عبدالحلیم اثر، بال جبریل، دیباچہ از مولانا عبدالقادر، ص ص

مترجم کا اپنی زبان میں قادر الکلام ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ ترجمہ میں فکری و فنی خامیاں موجود ہیں پھر بھی ترجمہ کے سرکل میں داخل ہے۔ ذاتی جذبات واحساسات اور قافیہ پیمائی شاعر کی ازلی مجبوریاں ہیں اور اس کی ہر اناڑی کو ہم غیر فطری قرار نہیں دے سکتے اس لیے ان کو تاہیوں پر ہم اس کی قابل قدر کاوشوں کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔ اگر ترجمے کو ان غلطیوں سے پاک کیا جائے تو ترجمہ ایک مثالی اور بلند پایہ معیار کا تصور ہوگا۔

عبداللہ جان اسیر :۔

شاعر مترجم نے لفظی ترجمے کو مدنظر رکھا ہے۔ اکثر مقامات ایسے ہیں جن میں آزاد ترجمہ کیا گیا ہے۔ بحروں کو حد سے زیادہ چست اور مصرعوں کو مختصر رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اکثر الفاظ وتراکیب اور مصرعوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا، اور ان کے پشتو مترادفات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ آزاد ترجمے کی دھن میں علامہ کے عالی افکار کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس سے ترجمے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ شاعر نے آثر کے مقابلے میں اصلی قوافی کا استعمال بہت کم کیا ہے۔

بعض مقامات پر دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہیں اور بحریں جدا جدا ہیں۔ بعض تراجم میں نہ شاعرانہ خوبی ہے اور نہ دلکش بحر۔ منظوم ترجمے میں اگر ایک طرف شاعر کے تصور اور خیال کو دوسری زبان مین متعارف کرانا ہے تو دوسری طرف عروض کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔

بعض مقامات پر فلسفۂ اقبال کو بہترین شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ترجمہ مثالی ہو کر رہ گیا ہے۔ بعض الفاظ کا استعمال معیوب ہے۔ بعض مصرعے خانہ پری کے مترادف ہیں جن کی تصحیح کردی گئی ہے۔ آزاد ترجمے کی دھن میں شاعر اصلی الفاظ وتراکیب کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور نتیجتاً ترجمہ مشکوک سا ہو کر رہ جاتا ہے، ایسے ہی مقامات پر آثر اور اسیر دونوں کے تراجم کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بعض الفاظ کے معانی سمجھنے میں اسیر نے دھوکہ کھایا ہے۔ اور ترجمہ غلط ہوا ہے۔ جہاں جہاں فارسی اشعار ہیں، جوں کے توں نقل ہیں اور شاعر نے ترجمے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

عبدالحلیم اثر افغانی کے ترجمے میں قوافی اور اصل الفاظ کا استعمال عروج پر ہے جبکہ عبداللہ جان اسیر نے اس کا استعمال کم کیا ہے۔ اثر کی بحریں طویل اور اسیر کی مختصر ہیں۔ مفہوم کی غلطیوں میں اسیر آگے ہیں ہم اسیر کو بھی مترجمین کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی کاوشیں بھی وقعت رکھتی ہیں اور اکثر تراجم مثالی اور بامحاورہ کئے ہیں لیکن آثر کے مقابلے میں ان کا درجہ کم ہے۔ اگرچہ قوافی اور بحور کے لحاظ سے ان کا درجہ بڑھ کر ہے۔

باب سوم

بانگِ درا

(پشتو ترجمہ ۱۹۶۳ء)

(ا) بانگِ درا

از سیّد راحت اللہ زاخیلی

مترجم کا تعارف

بانگِ درا پر ایک نظر

ترجمے کی نوعیت

ترجمے کا تفصیلی جائزہ

(ب) شکوہ و جوابِ شکوہ

(پشتو ترجمہ ۱۹۴۶ء)

از مولوی صاحب گل

اور عبد المنان اپیل نویس (۱۹۴۵ء)

تراجم کا تقابلی جائزہ

راحت کے ترجمے کا معیار

(۱)

کتاب :- **بانگِ درا** (۱۹۲۴ء)

مترجم :- سیّد راحت اللہ زاخیلی

ناشر :- پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سنِ اشاعت :- جنوری ۱۹۶۳ء

صفحات :- ۳۳۶

تیسرا باب

﴾۔۔۔بانگ درا۔۔۔﴿

مترجم کا تعارف :۔

سید راحت اللہ زاخیلی تحصیل نوشہرہ کے زاخیل نامی گاؤں میں سن ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ عربی صرف و نحو اور قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۱۔۱۹۱۰ء میں ہفتہ روزہ اخبار "افغان" مرتب کیا، شکوہ و جواب شکوہ کے شائع ہونے پر سب سے پہلے انہی منظومات کا ترجمہ کیا۔ وہ اپنے وقت کے تعلیم یافتہ طبقے میں "افغانی اقبال" مشہور تھے۔ ۱۹۲۳ء میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی تصنیف "گلستان" کا پشتو ترجمہ کیا۔ ۳۱۔۱۹۳۰ء میں "ستہرے مسشیے" مجلّہ جاری کیا۔ اس کے بعد فرنٹیر ایڈوکیٹ کے نام سے اخبار مرتب کرنے لگے۔ پشتو روزنامہ "شہباز" کے پشتو حصہ کے مدیر بھی رہے۔ آپ ۲۹ مئی ۱۹۶۳ء کو رحلت کر گئے۔

راحت، صوبہ سرحد میں ادبا و کاتبین کے باوا آدم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ پشتو زبان و ادب کو موجودہ سٹائل میں ڈھالنا آپ کا کارنامہ ہے۔ وہ ایک عام فہم اور رنگین شاعر تھے۔ عشق و محبت، سوز و تڑپ آپ کی شاعری کی جان ہیں۔ فارسی میں بھی نظمیں لکھیں اور ایک اردو ناول "ستارۂ زمین" بھی آپ کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ آپ پشتو زبان کے پہلے افسانہ نگار بھی ہیں۔

تصانیف :۔

> "نتیجۂ عشق (ناول)، سیف الملوک اور سوانح انوربیگ (پشتو نظمیں)، تاریخ افغانستان اور تاریخِ بغداد (پشتو)، خزان دافغان، لغاتِ افغانی، صرف میر، رسالہ بہ نصر (فارسی) قواعد، خوشخطی (فارسی نظم)، فالنامہ، قواعدِ پشتو، تحریر قافیہ اور احوال حضرت علی (منظوم پشتو) اور د راحت افسانے (افسانوں کا مجموعہ) "دا غونہ (شعری مجموعہ)" (۱)

﴾۔۔۔تعارف (بانگِ درا)۔۔۔﴿

بانگ درا علامہ اقبال کی چوتھی تصنیف ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اس سے پہلے اسرار خودی (۱۵) رموز بے خودی (۱۶) اور پیام مشرق (۲۲) فارسی میں شائع ہوئی تھیں۔ پہلے حصے میں وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو ۱۹۰۵ء تک لکھی گئیں۔ وطن پرستی کا جذبہ غالب

---

(۱) اخونزادہ فرمان مسافر، د پښتو ادب ځلنده ستوري، ص ۲۱۵

ہے۔ تصویر درد بہترین نظم ہے۔ اس دور کی غزلیات میں داغ اور امیر کا رنگ نمایاں ہے۔ مشہور مغربی شعرا مثلاً ایمرسن، کاؤپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے خیالات کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ بعض منظومات منظر نگاری کا اعلیٰ مرقع ہیں بعض میں سنجیدہ خیالات اور بعض بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ تلاش، تحقیق اور جستجو کا رنگ نمایاں ہے۔ وطن پروری سے متعلق منظومات میں فارسی کی بجائے ہندی الفاظ مستعمل ہیں۔ بعض منظومات میں آئندہ فلسفیانہ شاعری کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر جو نظم لکھی، سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو شروع ہی سے بزرگانِ دین کے ساتھ دلی عقیدت تھی۔

بانگ درا کا دوسرا حصہ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) نسبتاً کم ہے۔ علامہ نے یورپ میں مغربی تہذیب کی چکاچوند قریب سے دیکھی۔ اسلامی اصولوں اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ چنانچہ بھانپ گئے کہ وطنیت و قومیت بنی آدم کے حق میں مفید نہیں، اسلیے اسلامی اصولوں کی تبلیغ کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے کا فیصلہ کیا اس لیے "پیغام" کا رنگ جلوہ گر ہے۔ جو نظم علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام لکھ کر بھیجی تھی وہ دراصل ان کا پہلا پیغام ہے۔ یہاں وطن پروری کا رنگ ختم ہوا۔ قوم میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے والی نظمیں ہیں عشق و محبت، حرکت و عمل اور اسلامی تبلیغ خاصا ہے۔

بانگ درا کے تیسرے حصے میں وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۳ء تک لکھی گئیں۔ زبان زیادہ صاف اور سلیس ہو گئی ہے۔ سوز و گداز، فلسفیانہ غور و فکر اور آفاقی رنگ جھلکتا ہے۔ اردو پر فارسی کا اثر غالب ہے۔ خیالات میں انقلابِ عظیم نمایاں ہے۔ اب علامہ کا زاویہ نگاہ مکڑی، گائے یا چاند ستاروں پر نہیں بلکہ خدا، خودی، بے خودی اور عشق پر ہے۔ مسلمانانِ عالم کے قلبی جذبات کی ترجمانی اور انگریزوں کی اسلام دشمنی کے جذبات نمایاں ہیں۔ وہ ایک شاعر کے مرتبے سے بلند ہو کر پیامبر بن گئے۔ قوم کو امید اور یقین کا پیغام دینے کے ساتھ ان کے اطاعتِ اسلام کے جذبہ کو بھی ابھارا ہے۔ بعض نظمیں اتنی لاجواب ہیں کہ جن کی بدولت اردو ادب کا دامن جواہرات سے مالامال ہے۔ صدیقؓ اور شری رام چندر جیسی نظموں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ اپنے بزرگوں کے علاوہ تمام مذاہب کے بزرگوں کی عزت کرتا ہے۔ فارسی شعراء کے اشعار پر تضمین سے علامہ کے مطالعہ کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ بعض نظموں میں فلسفۂ خودی کے اکثر مسائل دلکش انداز میں پیش کئے گئے ہیں

﴿۔۔۔ ترجمے کا تعارف ۔۔۔﴾

پشتو زبان میں اقبال کو متعارف کرانے کا سہرا سیدّ راحت اللہ زاخیلی کے سر ہے۔ انھوں نے علامہ کی معروف نظموں شکوہ اور جوابِ شکوہ، کے شائع ہونے پر ان کا پشتو ترجمہ کیا اور پھر بتدریج دوسری منظومات کو پشتو کا منظوم جامہ پہنایا۔ یہ کامیاب اور خوبصورت ترجمہ پشتو اکیڈمی کی وساطت سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ پشتو زبان و ادب کے مایہ ناز ادیب و نقاد مولانا عبد القادر فرماتے ہیں کہ راحت نے اقبال کو پختون بنایا ہے۔ انھوں نے ترجمے کا کام اس دور میں شروع کیا تھا جب اقبال پہلی بار شعر و شاعری کے میدان میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ایک معیاری ترجمے انے انہیں مترجمین میں ایک اعلیٰ درجے پر فائز گیا۔ پھر

پچاس ساٹھ سالہ عمل پیہم نے انہیں اس میدان میں سب سے بڑا مقام عطا کیا تھا۔ اس جیسے مستند مترجم کا ملنا محال ہے۔ (۱)

علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر و فلسفی کے کلام کو پشتو کا منظوم جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن راحت مرحوم شعری محاسن کی ضروریات کا خیال رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں ترجمے میں ضرب الامثال، محاورات، اور روزمرہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ وہ ترجمے کے اس طویل و مشکل سفر کے پیشرو تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راحت اور اقبال دونوں جوان و ہم عصر تھے۔ علامہ سے زیادہ متاثر ہونے کی وجہ سے جب بھی اُن کی کوئی نظم شائع ہوتی وہ ترجمہ کئے بغیر نہ رہتے۔ پشتو کے اس بزرگ ادیب و شاعر نے حیاتِ اقبال کے ہر دور سے اپنا تعلق قائم رکھا اور جب مولانا عبد القادر نے ان سے بانگ درا کے ترجمے کی بات کی تو انھوں نے کاغذ کے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالا جو انھوں نے طویل عرصہ سے مختلف اوقات میں لکھے تھے۔

راحت اور اقبال آپس میں تقریباً ہم عمر تھے۔ راحت پرانے ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس تھے۔ خوشنویس ہونے کے علاوہ وہ اقبال کے شانہ بشانہ شعر و شاعری کے میدان میں منزل مقصود کی جانب گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ (۲) بانگ درا کا ترجمہ راحت کی دیرینہ خوابوں کی تعبیر اور ان کی دلی امنگوں اور خواہشات کا ترجمان ہے۔ اقبالیات پشتو میں سنگِ میل کی حیثیت رکھنے کے علاوہ پشتو زبان و ادب میں بھی یہی ترجمہ ایک نیک شگون ہے۔

بانگِ درا کا ترجمہ کلام اقبال کے تراجم میں چوٹی کا ترجمہ شمار کیا جاتا ہے۔ ترجمہ ایک کٹھن اور جان کنی کا کام ہے۔ شاعر کو لسانیات اور زبان و ادب میں ماہر ہونے کے علاوہ علم عروض سے بھی اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ شعر کا شعر کے سانچے میں ڈھالنا اور خیال اور انداز بیان میں سے ہر ایک کو گرفت میں لینا بھلا کیسے آسان ہو سکتا ہے۔ شاعر شعری غنائیت، اوزان کے توازن، روانئ بحر اور قوافی کے مراحل سے جب گزرتا ہے۔ تو انہیں تراجم کی ازلی مجبوریوں کے سامنے اپنی بے بسی کا احساس ضرور ہو جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو راحت مرحوم کی الفاظ کے انتخاب میں چھان پھٹک، قوافی کے انتخاب، روزمرہ اور محاورہ کا صحیح و موزوں استعمال میں کاوشیں بے مثل ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ اصل کا عکس ہے۔ ترجمہ تمام تر اور حتی الوسع کوششوں کے باوجود بھی اصل کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فکر اقبال پر قابو پانے کے لیے بعض اوقات شعریت کا دامن ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ الفاظ کا تناسب اور کھچاوٹ میں فرق آجاتا ہے۔ مصرعوں کی طوالت بحور کی سستی کا سبب بن جاتی ہے۔ شعر کی موزونیت پر حرف آجاتا ہے اور اوزان ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔ شعر موزوں کلام کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے اور کلام کا مزہ پھیکا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان فطری مجبوریوں سے راحت مرحوم بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔ اسلیے بعض مقامات پر ترجمہ ضرورت سے زائد دکھائی دیتا ہے۔ اور بحروں کی وہ چستی نہیں رہتی جو اصل کا طرۂ امتیاز ہے۔ (۳)

---

(۱) راحت زاخیلی، مترجم بانگ درا، تعارف از مولانا عبد القادر، ص ط

(۲) ایضاً ص ح

(۳) محمد اعظم اعظم، "پښتو کښې اقبال"، حصہ اول، اقبال نمبر، ص ۲۵۰

تفصیلی جائزہ :۔

بانگ درا کا ترجمہ پشتو اکیڈیمی پشاور اور اقبال اکیڈیمی کی مشترکہ کاوشوں میں دوسری کوشش ہے۔اس سے پہلے زبور عجم کا ترجمہ ۱۹۶۱ء میں شائع کیا گیا۔ذیل میں ترجمے کا تفصیلی تحقیقی جائزہ لیا جارہا ہے۔ نظم "ہمالہ" کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں

نوجواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

نښته د زوړوالي درکښ هيڅ نخښنه نښان

ګرځي آسمانونه ستا ځوانئ ته دي حيران(۱)

ترجمے کے دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ افلاک گردش کرتے ہوئے تیری جوانی پر حیران ہیں۔شام و سحر کی گردشِ افلاک گردشِ زمانہ مترادفات ہیں اسلیے ترجمے میں، لفظی نہ ہوتے ہوئے بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ترجمہ آزاد اور بامحاورہ ہے۔ ع دامنِ موج ہوا جس کے لیے رومال ہے۔

ترجمہ :۔ باد درته رومال دے چه دِ مخ پرے صفا کيږی(۲)

ترجمے کا مطلب :۔ ہوا رومال کی طرح تیرے چہرے کو صاف کرتی ہے۔____ ترجمہ روزمرہ کے مطابق اور دلکش ہے۔

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے

تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے

ګورے دی وريځے د باد اَس باندے سورے دی

لاس کښې ئے اخستي کروړے د تندر سرے دی(۳)

(بادل کی گھٹائیں ہاتھ میں برق کے سرخ کوڑے لیے ہوئے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔

ترجمہ بامحاورہ اور دلکش ہے۔اس لحاظ سے "ہمالہ" کا ہر شعر ترجمے میں مثالی ہے۔ترجمہ بامحاورہ اور آزادانہ ہے۔اور ایسا آزادانہ کہ لفظی تراجم کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔"عہد طفلی" کا نمونہ

ع شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے	آه هغه مزه د زنځيرونو په شنړاکښې
ع وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر	هغه د وريځو په مينځ کښې تګ ئے په ګامونو
ع اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر	هغه حيرانتيا مے په دروغو جوابونو

ان مصرعوں میں در، بے آواز اور مصلحت آمیز، کا ترجمہ نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی مطلب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بحریں چست اور مختصر ہیں۔ نظم بعنوان "مرزا غالب" کی بحریں بھی مختصر اور چست ہیں اور ترجمہ آزاد اور بامحاورہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار

تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

(۱) راحت زاخیلی، بانگ درا، ص ۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً ص ۹

مترجم نے فردوسِ تخیل کو صرف تخیل، کشت فکر کو فکر اور عالم سبزہ وار کو عالم زار ترجمہ کر کے ادا کیا ہے۔

ستا د تخیل نه د قدرت هم دے بهار

ستا د فکر کر نه راځو سبزی عالم زار (۱)

"ابر کہسار" نظم کی بحریں ایسی مختصر اور چست ہیں کہ ترجمہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا

ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا

زهٔ یمه اوچته اسمانونه ښکلوم

زهٔ د غرهٔ وریځ یمه ګلونه وروم(۲)

(میں بلندی پر ہوتا ہوں اور آسمانوں کو چومتا ہوں۔ میں ابر کہسار ہوتے ہی پھول برسارہا ہوں)

ع شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا

کرشمه هرخوا ته بحروبر آباد وُم

(ہر طرف گھوم پھر کر بحر و بر آباد کرتا ہوں۔) شاعر نے بحر و بر کہہ کر شہر، ویرانہ اور بن کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی

ع سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

شی د غر شینکے مے بچونړه په کبش خوره شم

(سبزۂ کوہ بچھونا بن کر، اس پر پھیل جاتا ہوں)۔ مترجم شاعر نے "مخمل" کا ذکر بھی نہیں کیا کہ سبزے کی دلکشی قائم رہتی۔

سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں

بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

سیل په سیل چه غاړے د ولے ته وررسیږی

ابو ته مے له څاڅکو نه والئے دی په غوږ کیږی(۳)

[دوسرے مصرعے کا مطلب ہے کہ میرے قطرے پانی (نہر کے) کے کانوں کی بالیاں بن جاتے ہیں] اس لیے ترجمہ میں فرق ہے۔ کیوں کہ بالیاں قطروں کی نہیں بلکہ گرداب کی ہیں۔ "ایک مکڑا اور مکھی" میں

ع دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا

بنائسته دی دیوالونه په سروشنو آئینو صفا

اگر ترجمہ اس طرح ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

بنائسته دی دیوالونه په آئینو صفا زما

---

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۹

(۲) ایضاً، ص ۱۱ (۳) ایضاً، ص ۱۱

ع آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

(i)نوونے خورۂ داسے چه سره ئے کړه پرے خوا(۱)

"آرام سے گھر بیٹھ کے" کی بجائے "سره ئے کړه پرے خوا" استعمال کرنا آزاد اور بامحاورہ ترجمہ کی بہترین مثال ہے۔ اس سے مترجم شاعر کی شاعرانہ خوبیوں اور فنکاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ "ایک پہاڑ اور گلہری"

ع تجھے ہو شرم، تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

حیا که لرے کړه ورک دِبشر

"پانی میں جا کے ڈوب مرے" کا لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے "کړه ورک دِ بشر" خوبصورت اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔"

"ایک گائے اور بکری" تھی سراپا بہار جس کی زمیں

چه پکښې يو لوے بهار د شين کبل وو

(جس میں بڑی سبز گھاس کی بہار تھی) سراپا بہار کی جگہ "لوئے بھار د شین کبل" ایک دلکش اصطلاح ہے۔ جس نے مصرع کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ "ماں کا خواب" میں یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

تکے شنے غوندے جاسے ئے وے اغوستے
ډیوے تولو وے لاسونو کښې نیولے (۲)

قافیے اغوستے، نیولے، صحیح نہیں ہے۔ اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ صحیح اسطرح ہو سکتا ہے۔

ع تکے شنے غوندے جاسے ئے اچولے

نظم "آفتاب"

ع ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

سبب تهٔ د چمن د شته کيدو او نيشت کيدوئے

(تو چمن کے نیست و بود کا سبب ہے۔) شاعر نے ہست و بود کو نیست و بود کے معنوں میں لیا لیکن پھر بھی مفہوم پر حاوی ہے۔ اور مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مترجم کی یہ خاصیت ہے کہ وہ بحروں کو چست رکھنے کے لیے بعض اصلی الفاظ حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً "دردِ عشق"

ع اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا

او اوښکه د ځيګر د هغے نه شی غمّاز

(اسمیں گداز کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔) اگر مصرع اسطرح ہو جائے تو صحیح ہو جائے گا۔ او اوښکه د ځيګر سوی د هغو نشی غماز کلام

---

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۱۴

(۲) ایضاً، ص ۲۲ (i) "سره ئے کړه پرے خوا" خوبصورت محاورہ ہے۔

اقبال کی یہ خصوصیت ہے کہ مترجم تخیل اور انداز بیان دونوں پر اس وقت تک قابو نہیں پاسکتا جب تک وہ پر جوش نہ ہو جائیں،
"دل" کا ایک مصرع :۔ جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل

کرونده چه د زړهٔ اوسوه ، نوشنه شوه د زړه دانه

مصرع اگر اس طرح ہو جائے تو صحیح ہو جائیگا۔

کرونده چه دَ ژوند اوسوه نو شنه شوه د زړهٔ دانه

"رخصت اے بزم جہاں"

ے عاشقِ عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں(i)

مین په تنهائیے دے زړهٔ ، په خپل کور زهٔ نازیږم
تخت دَ سکندر او دَ دارا پورے خندیږم(۱)

ترجمہ خوبصورت اور دلکش ہے۔"طفلِ شیر خوار"

ع تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں

ستا په شان زهٔ هم کله گویان کله خندان یم(۲)

(گویان کی جگہ گریان ہے)"تصویر درد" ایک طویل نظم ہے۔ جس پر جوانی کا رنگ غالب ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو :

صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تونے

د زړګی د صفائے د تعلق ، رنګ سره څه دی
په نکریزو د ائینے ورغوے اولړلو تا

مترجم نے "آرائش" اور ناداں کے معانی نظر انداز کر دیے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ع دکھاوہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پر نم کو

هغه حسن ښکاره سترګو ته کړه، سوزی چه عالم

(اپنی آنکھوں کو وہ حسن دکھا جس پر عالم جلتا ہے) اس مقام پر شاعر مجبور ہے کہ بحر چست رکھنے کے لیے عالم سوز یا پرنم کو نظر انداز کردے۔ اس لیے پرنم کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

ے مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاج گردشِ چرخِ کہن بھی ہے(ii)

(i) سکندر، ارسطو کا شاگرد، جو مقدونی کہلاتا ہے۔ فلپ کا بیٹا، ولادت ۳۵۶ ق م میں ہوئی، ایران اور برصغیر کو فتح کیا دارا، ایران کا بادشاہ، جس کی شکست اور موت ۳۳۱ ق م میں سکندر کے ہاتھوں ہوئی۔ حوالہ سید عابد علی عابد، تلمیحات اقبال ص ۴۰، ۲۶

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۵۹ (۲) ایضاً، ص ۶۲ (ii) گردشِ چرخِ کہن بمعنی گردشِ زمانہ، انقلاب، حادثات

تول عالم ئے مرض بولی ولے دا داسے مرض دے

چه علاج د حادثاتوئے پټ نغښتے په لمن دے(۱)

دوسرے مصرے کا مطلب ہے۔ کہ جس نے حادثات کا علاج اپنے دامن میں چھپا رکھا ہے۔) شاعر نے گردش چرخ کہن کا ترجمہ حادثات کیا ہے جو کہ لفظی سے آزاد اور بامحاورہ کی عمدہ مثال ہے۔ نظم "چاند"

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو

سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

که ته سر ترپا یه نور ئے، زهٔ ظلمت یم سر ترپایه(ii)

خوچه ځان نه خبرنه ئے تول بنائست ددے بے ځایه(۲)

دوسرے مصرع کا مطلب :۔ اگر تو (چاند) اپنے آپ سے آگہی نہیں رکھتا تو تیرا سارا حسن بے معنی ہے) اصل مطلب یہ ہے کہ اے چاند! تو ذوقِ آگہی سے سینکڑوں منزل دور ہے۔ ظاہر ہے جب ذوقِ آگہی سے دور ہو تو حسن اور روشنی بے معنی ہے۔ اصل شے احساس آگہی ہے۔ اقبال درس آگہی اور خود آگہی کی تعلیم دے رہے ہیں اور اس کے بغیر تمام وجود بے کار ہے۔ "داغ" کا نمونہ ملاحظہ ہو

اے جہان آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن!

ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن!

اے جهان آباده! پنگه ، چه د شعر او سخن تهٔ ئے

په خزان نن پا مال شوے ، تالاشوے چمن تهٔ ئے(۳)

ترجمہ اتنا خوبصورت اور دلکش ہے۔ کہ سلیس الفاظ مین اصل کی عکاسی کی گئی ہے۔ نظم "ابر"

ع عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا(iii)

عجیبه تماشه ده وی دابے غرا غرۅسکے

مترجم نے میکدہ کو تماشا کے معنوں میں لیا ہے اگر اس کے معنی شراب خانہ کے لیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ "چہ اور شمع"

ع ہے غبارِ دیدۂ بینا حجاب آگہی!

کړ دوی نرو سترګو ته حجاب د آګاهئے

"نرو ستر گو" (چھوٹی آنکھوں) کی جگہ" بینا سترګو" چاہیے حصہ غزلیات میں یہ شعر :۔

سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر

کہ عقدہ خاطر گرداب کا آبِ رواں تک ہے

له سکون د زړه پیدا کړه دکار ایستو سامان دِ

ته سامان دکار ایستو کړه پیدا له اطمینان(۵)

(i) ظلمت پشتو لفظ نہیں ہے۔ (ii) گھٹا ایسی خاموش ہے گویا شراب خانہ جس میں کوئی شور یا ہنگامہ نہیں ۔

(۱) راحت، بانگ درا، ص ۷۲ (۲) ایضاً ص ۷۸ (۳) ایضاً ۹۱ (۴) ایضاً ص ۹۲ (۵) ایضاً ص ۱۰۶

ترجمہ کے دونوں مصرے مترادف ہیں۔دوسرے مصرے کا ترجمہ مفقود ہے۔

؎ تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

که د درد د زړه ارمان وی کړه خدمت د فقیرانو
خزانو د بادشاهانو کښې دانے دی د سوندلو(۱)

دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے :۔

دشاهانو خزانو کښې گوهر نه دے د موندلو

حصہ دوم میں" پیام "

؎ صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جانگداز دے

نورانی قبا که غواړے ترهغے به ئے وانخلے
چه تر څو په ژړا نهٔ شے لکه شمع جانگداز

ترجمہ بامحاورہ اور مثالی ہے لیکن سوزو ساز، جانگداز، امتیاز، خانہ ساز اور مجاز وغیرہ اصلی قافیے استعمال ہوئے ہیں۔"چاند اور تارے" میں :۔

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

په زغلیدو دے د زمانے آس
چه کروړے خوری د طلب لس لس

(طلب کے دس دس کوڑے کھا کر زمانے کا گھوڑا دوڑتا ہے۔) تعداد کے تعین سے مصرع مشکوک ہو جاتا ہے۔اسلیے مصرع اسطرح ہونا چاہیے۔

چه کروړے خوری د لتون تس تس

"وصال" میں

نامرادی محفل گل میں مری مشہور تھی
صبح میری آئنہ دارِ شبِ دیجور تھی(i)

د سحر لمحه غمازه مے دشپے د تور کاکل وه
سپین صبا مے یوه وینزه تورے شپے ته په اردل وه (۲)

پہلے اصلی مصرے کا ترجمہ مفقود ہے اور ترجے میں دوسرا مصرع لغو ہے۔"کوشش ناتمام" کے ترجے میں بھی کوشش ناتمام کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

---

(۱) راحت زاخیلی، بانگ درا، ص ۱۰۸ (۲) ایضاً ص ۱۲۶

(i) آئینہ دار شب دیجور :۔ جس کے آئینے میں اندھیری رات کا عکس ہو۔

سوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لیے

د چینو شوق دے خوړونو ته، خوړونه زغلي سیند ته
په توپونو د موجه چه اونیسي د سپوږمئی بام(۱)

دوسرا مصرع میں بحر کا کوئی ذکر نہیں اور مزید یہ کہ مصرع لغو بے معنی اور مبہم معلوم ہو تا ہے۔ اس کو معنی خیز بنانے کے لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

د بحر داموجونه رانیسي د سپوږمیٔ بام

نوائے غم، عشرتِ امروز اور انسان کے ترجمے بھی لفظی اور عام فہم ہیں۔ "جلوۂ حسن" کا ترجمہ اصل کی طرح دلکش اور خوبصورت ہے۔ ایک شعر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں؟
خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟

خوارمان چه هغه حسن په زمین هم شته که نا
د دنیا په ګوته خدایه! دانګین هم شته که نا(۲)

نظم "فراق" میں

شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال
دعائے طفلک گفتار آزما کی مثال

سندرے په اتکو اتکو چینے وائی کمال دے
ماشوم غوندے دعا په ترتړے ژبه ئے مثال دے

پہلے مصرع میں دلبری کا ذکر نہیں، اس لیے ترجمہ نامکمل ہے۔ دوسرا مصرع پہلے کی نسبت طویل بھی ہے۔ اسلئے پہلا مصرعہ اگر اس طرح ہو جائے تو نہ صرف دونوں مصرے برابر ہو جائیں گے بلکہ مفہوم بھی درست ہو جائیگا۔

دلبری سندرے په اتکو اتکو چینے وائی کمال دے

"صقلیہ" میں:۔

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ستا په خال باندے بنائسته دِ ددریاب دغه رخسار وی
ستا په شمعو تسلي د مسافر و دِ باربار وی(۳)

(۱) راحت زاخیلی، مترجم، بانگ درا، ص ۱۳۱،
(۲) ایضاً ص ۱۳۵ (۳) ایضاً ۱۴۲

(اے سسلی میری دعا ہے۔ کہ تو سمندر کے رخسار پر تل کی طرح زیب وزینت کا سامان بنا رہے اور سمندر کا سفر کرنے والے کو تیری شمعیں تسلی دیتی رہیں)(۱)

غزل نمبر ۳ میں :۔

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا

ماوے دے خاکی بدن، خوداُمید دکوخے گرد وو
پس له مرګه شوه معلومه وم طلسم دهوا(۱)

ہوا بمعنی ہوس کے ہے خوشحال خان خٹک اور حمید ماشوال نے بھی اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے نمونہ :۔

۱۔ زه تا پیژنم هوا واره تاکرم سرهوا (۲)

۲۔ دهرچاچه شي مفتي نفس وهوا ناروا شي د جهان ورته روا(۳)

۱۔ اے ہوس میں تجھے خوب جانتا ہوں میری تمام تربیقراری تیری وجہ سے ہے۔

۲۔ جس بندے کا مفتی نفس و ہوا بن جائے اُس کے لیے پوری دنیا کے ناجائز جائز بنا دیتا ہے۔

غزل ۱۹۰۷ء کا ترجمہ دلکش اور پر مغز ہے۔ نمونہ دیکھیں :۔

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

هغه دور اوس ساقي تير شو چه پياله به څښنے شوه پټه
ټول جهان به ميخانه وي او هر څوک به باده خواروی
سلطنت چه د رومائے په بل مخ وواړولے
له قدسيانو نه زهٔ اورم هغه شير به بيا بيداروی(۴)

ترجمہ میں ساقی، میخانہ، بادہ خوار، قدسیانو اور شیر کے الفاظ اصل ہیں

حصہ سوم، "بلاد اسلامیہ" میں دلی، بغداد، قسطنطنیہ، قرطبہ، مدینہ، اور یثرب کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ کی فکر رسا میں امت مسلمہ کی عظمت و شوکت کھٹکتی ہے۔

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

---

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۱۴۵

(۲) خوشحال خان خٹک .(۳) حمید ماشوال (۴) راحت، بانگِ درا، ص ۱۴۹ (۵) غلام رسول مہر، مطالب کلامِ اقبال، ص ۲۱۴

مینه ته ئے وطن ته ئے هم ئے تهٔ ځائے د پناه ئے
پلو شو د تاثر نه د کشش نقطه هرگاه ئے (۱)

پہلا مصرع غلط ہے کیونکہ نہ تو یثرب کا ذکر ہے اور نہ ہی مسلم کا۔اس لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

آه یثربه! وطن ته ئے د مسلم ځائے د پناه ئے

"فلسفۂ غم" میں

اے کہ نظم دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم واندوہ کی منزل تجھے

اے چه پوه ته په هر شان په انتظام ددے دنیائے
نو بیا ولے د غمونو دے چپو ته وار خطائے

دوسرے مصرعے کا ترجمہ دلفریب و دلنشین ہے۔ترجمے کا مطلب :۔ تو پھر کیوں آلام کے تلاطم میں تیرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔"ملی ترانہ" چھوٹی بحروں کی دلکش نظم ہے،ترجمہ کی بحر اصل کی نسبت طویل ہے لیکن پھر بھی قاری پر بار گراں نہیں۔"شکوہ" میں۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں ، محو غم دوش رہوں

ترجمہ:۔

ولے شمه زه زیان کارے، د فائدے کار کړمه هیر
د صبا فکر دِ نهٔ کړم ډوب په غم د پرون تیر

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟

ترجمہ:۔

د بلبل فریاد دِ اورم او بس اورم دِ ډیر ډیر
اے ملگری خنگه چپ شم زه هم یم د گل په څیر؟

ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ھُو بیٹھے!

یو طرف ته لرے ناست دی، هنگامونه د گلزار
لیونی دی هم لیواله ، ناست د هُو په انتظار(۲)

---

(۱) راحت زاخیلی،بانگ درا،ص ۱۵۷
(۲) ایضاً،ص ۱۷۵

دوسرے مصرعے میں "دی" کی جگہ دِ چاہیے :۔

لیونی دِ هم لیواله ناست د هو په انتظار

"نصیحت" اور "رام" خوبصورت منظومات ہیں لیکن ترجمے میں رام کی بحریں زیادہ چست ہیں۔ "خطاب بہ جوانانِ اسلام" دلدوز نظم ہے لیکن ترجمے میں وہ جذب و مستی نہیں جو اصل کا طرۂ امتیاز ہے۔ "شمع اور شاعر" کے پہلے بند کا ترجمہ اگر چہ لفظی ہے لیکن خوبصورت ضرور ہے۔

مدتے مانندِ تو من هم نفس می سوختم

مودو راسے ستا په شانے ، ماهم دے تنر سیزلے

نفس کا "تنر" ترجمہ بڑا خوبصورت ہے۔ "شبلی و حالی" میں

مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات

کرتے ہیں چارہ ستمِ چرخ لاجورد

عاقلان گرځي اسباب د حادثاتو لټوی

د ظالم اسمان د ظلم کوی تل دارو دوا(۱)

ترجمے میں لاجورد حذف کر دیا گیا ہے۔ اگر ترجمہ اس طرز پر ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

دَ لاجورد اسمان د ظلم کوی تل دارو دوا

"صدیقؓ" میں :۔

ملک یمین و درہم و دینار و رخت و جنس

اسپِ قمر سُم و شتر و قاطر و حمار

غلامان، وینزے ، دینار، درم او رخت، سره د جنبه

اس او اوبن ،کچر اورخر، خوچه په څه ئے وو اختیار

مترجم نے "قمر سُم" (چاند جیسے حسین سُم) کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ صرف "اس" (گھوڑا) کہہ کر کام چلایا ہے۔ "کفر و اسلام"

ع ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوز کہن

ولے ستا هغه زوړ سوز ولے شو ستر کو نه فنا؟

مصرع میں (ولے) کا تکرار ہے اس لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے

ولے ستا هغه زوړ سوز شولو له ستر کو نه فنا؟

(مسلمان اور تعلیم جدید) میں :۔

---

(۱) راحت زاخیلی بانگ درا، ص ۲۳۸

ع   ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

ذ کندہ وینے دپارہ دے تعلیم لکہ شرر(۱)

یہاں شرر کی جگہ نشتر چاہیے "مذہب" کا یہ شعر ملاحظہ ہو

باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است

ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

شاعر مترجم نے اس شعر کو ہو بہو نقل کر کے ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ (جنگ یرموک کا ایک واقعہ) میں لفظی ترجمہ طوالت، اکتاہٹ اور پیچیدگی کا باعث ہے۔ نمونہ دیکھیں

یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرُنم ہوئی وہ آنکھ

جسکی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام

دغه ذوق او شوق چه ے اولیدو هغه سترگے شوے نوڑنے

چه نظر ئے لکه توره وو دبنمن ته بے نیام(۲)

(میں اور تو) :۔

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا

کہ تیرے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری!

طریقه د طواف داسے اوبنیه د حرم شمعے

چه پتنگ ته دِ بیا ورکړے شی فطرت سمندری(i)

ترجمہ قارئین کیلیے مشکل اور پیچیدہ ہے۔ شاعر نے اصل قوافی کا سہارا لیکر ترجمہ کیا۔ یہ مصرع :۔

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے

د حرم خلقو نه خومره گله من چه نن حرم دے

شاعر نے "گلۂ جفائے وفا نما" کا ترجمہ "گلہ من" (گلہ) کیا ہے۔ جو اصل کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر :۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے

وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

نه دے نوے ځائے د جنگ نه دبنمن نوے هغه رنگ دے

اسد اللّٰهی فطرت هم مرحبی هم عنتری(۳)

(۱) راحت زاخیلی، مترجم، بانگ درا، ص ۲۷۳ (۲) ایضاً ص ۲۷۸ (۳) ایضاً ص ۲۸۵۔

(i) (سمندر ایک کیڑا ہے۔ جو آگ میں رہتا ہے، یہاں آتشیں مزاج مراد ہے۔ ترجمے میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں)

حضرت علیؓ شیر خدا نے قلعہ کے محافظ کافر (مرحب) کو غزوۂ بدر میں مار ڈالا۔ بھائی کا بدلہ لینے کے لیے عنتر میدان میں آیا اس کو بھی حضرت علیؓ نے قتل کیا۔ مسلمانوں کو آج بھی طاغوتی طاقتوں کے سامنے اسی طرح سینہ سپر ہونا ہے۔ مذکورہ نظم میں اصل قافیے استعمال ہوئے ہیں۔ خضر راہ :

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

آبادئ دِواړه پریښوے اوتل گرځے په صحرا
ستا ژوندون بے ورځے شپے دے بے مهتاب اوبے آفتاب(۱)

شاعر نے "فردا و دوش" کے لیے " بے مہتاب اور بے آفتاب" کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو کہ کسی بھی لحاظ سے صحیح نہیں ہے مہتاب رات اور آفتاب دن کے لیے کنایہ ہے۔ لیکن کل (گزشتہ) اور آج کا مترادف نہیں ہو سکتے۔ اسلیے شعر میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

ع اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

او دپنګے او دمینے دازوګ شور دے په څه باب(۲)

مترجم شاعر نے محنت کو محبت کے معنوں میں لیا ہے جو کہ غلط ہے۔ مصرع اسطرح صحیح ہوگا :۔

او دپنګے اوکړاؤ دا زوګ شور دے په څه باب

ع نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش!

په دولت پسے روان نوے قامونه په شتاب (۳)

"شتاب" قافیہ پیائی کی مجبوری میں استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر نے "نوجوان" کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

ع اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں

اے په کور میشته ! هغه سیل دِ نهٔ دے کړے

(شاعر نے رہینِ خانہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے بلکہ مراد کاہل مسلمان ہے۔ اگر مصرع اس طرح ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

اے ناراسته مسلمانه ! آننداره د، نه ده کړے

یا

(د نغری په غاړه ناسته ننداره د نه ده کړے)

یہ شعر :۔

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریٔ کشت و نخیل

سودائی د محبت لټوی ګرځی نوے شاړے
اوترلے ته زنځیر کبش ئے دکر او د نخیل

---

(۱) راحت، زاخیلی، ص ۲۸۹ (۲) ایضاً، ص ۲۹۰ (۳) ایضاً

ترجمہ میں آبادی کو نظر انداز کردیا، قافیہ سے ترجمہ مبہم ہو کر رہ گیا جبکہ شاعر کا مطلب ہے کہ محبت کا جنوں ہر وقت نئے ویرانے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور تو آبادی میں بیٹھا ہوا اپنے کھیتوں اور باغوں کا قیدی بن گیا ہے۔ کسی دوسری جگہ کا خیال تیرے دل میں نہیں آسکتا خضر راہ کا جزو "زندگی" روانی بحر بے ساختگی اور شعری غنائیت سے مالامال ہے۔ لیکن ترجمہ کی سست، طویل، پیچیدہ اور مشکل بحریں اصل کے تلاطم خیز جذبات میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ

جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

تہ پہ تلہ د صبا اونن ئے چرے مہ تلہ

دے دائم پہ زغل پہ یونیب اوھر وختہ ځوان دے ژوند

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

سِرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

کہ ژوندے ئے نو ځان نہ دنیا خپلہ راپیدا کړہ

دَ آدم د فطرت روح دے ، راز دکن فکاں دے ژوند

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

لہ کوھکن لہ زړہ اوپو ښتہ چہ معنٰی څہ دہ د ژوند

د دروند کانړی د تیشے او نہر د پیو شان دے ژوند(۱)

مندرجہ بالا ترجمے سے پتہ چلتا ہے کہ کلام اقبال کا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا ہے۔

ع دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

دیو د ظلم او دزور دے جمہوری جامہ کښں گرځی(۲)

پائے کوب بمعنی ناچنے والا کا ترجمہ "گرځی" (پھرتا ہے) کیا۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے :

دیو دزور گیرځ پہ جمہوری قبا کښں رقص کړی

خضر راہ کا جزو "دنیائے اسلام" میں ع :۔

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ!

سرہ کولہ چہ وہ د ترکوشوہ رسوا پہ زمانہ کښں(۳)

---

(۱) راحت زاخیلی، بانگ درا، ص ۲۹۳

(۲) ایضاً، ص ۲۹۶ (۳) ایضاً، ص ۳۰۰

(کلاہِ لالہ رنگ سے مراد ایران ہے۔۔اسماعیل صفوی شاہ ایران نے سرخ ٹوپی اپنی فوج کے سپاہیوں کی وردی میں شامل کی تھی، لیکن مترجم نے ترک مراد لیے ہیں) مصرع اسطرح ہونا چاہیے۔

سره کوله چه د ایران وه شوه رسوا په زمانه کښې

ع ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

لکه پانړه د سرو زرو چه ذرے ذرے کړی ګاز

گاز بمعنی قینچی کے ہے لیکن مترجم شاعر نے قافیہ پیائی کی مجبوری میں اس کے معنی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ے نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی

اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر!

په مذهب د مسلمان باندے که نسل مقدم شو

د دنیا نه ورک شوے، خاوره وے، د پښنو د مسافر

دوسرے مصرع کی بحر ست، طویل اور پیچیدہ ہے۔اسلیے مصرع اس طرز کا ہونا چاہیے۔

د دنیا به والوزے، خاوره دپښنو د مسافر

یا

د نیا نه به والوزے، خاوره دلارے دسفر

ع ربود آں ترک شیرازی دلِ تبریز و کابل را

دتبریز او دکابل زړهٔ یوړو ترکے د شیراز

ترک شیرازی سے مراد مصطفیٰ کمال اور تبریز و کابل سے دنیائے اسلام مراد ہے۔ یعنی مصطفیٰ کمال نے دنیائے اسلام کے دل جیت لیے لیکن ترجمہ سے کوئی مطلب واضح نہیں ہوتا۔

تیسری غزل روانی بحر، چستی اور شعری محاسن سے مالامال ہے لیکن ترجے میں ست بحر نے ترجے کو پھیکا اور بد مزہ بنا دیا ہے۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی

اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

ستا بلبله خُلبلا نده ! فریادونه دی خام لا

وئے ساته سینه کښې لږ غونډے نورهم په ارام لا

ترجمہ اگر اس طرز پر ہو جائے تو بہتر ہو گا۔

ستا بلبله خُلبلانده ! فریادونه لادی خام

وئے ساته سینه کښې لږ نور هم لا په ارام

ترجمہ ایک پیچیدہ، سخت اور جان کنی کا کام ہے۔ اور پھر شعر کا شعر میں مترادفات تلاش کرنا اور بھی مشکل ہے۔ اس میں شاعر کی ذہانت و فطانت، فنِ عروض کی مہارت، اور محنت شاقہ ہی کام آتی ہے۔ راحت مرحوم نے کوشش کی کہ اقبال کے فکر و فن پر قابو پاتے ہوئے شعر، شعر کے سانچے میں ڈھل جائے اور کلام اقبال کا بہترین نمونہ پشتو زبان میں فراہم ہو جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مندرجہ بالا فروگزاشتوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی بانگ درا کا ترجمہ دوسرے تراجم کی نسبت دلکش، عام فہم اور موزوں ہے۔ شاعر نے حتی الوسع کوشش کی کہ اقبال کے فکر و فن اور تخیل پر گرفت حاصل کر کے اصل کا عکس فراہم کر سکے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے راحت مرحوم نے آزاد اور بامحاورہ ترجمہ کر کے کمال دکھایا ہے۔ بڑی جستجو اور تلاش کے نتیجے میں ایسی پشتو اصطلاحات وضع کی ہیں جن پر حیرت ہوتی ہے۔ آزاد تراجم کی امثلہ ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

غزلیات میں غزل نمبر ۲ کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس ناآشنا ہے اے دل!
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

دلته جرته دے ملگرے اے زړګیه ناشنا ملک دے
چه ته غواړے موندے نه شی هغه خیز په هیڅ چمن(۱)

"زیرِ چرخِ کہن"، کا ترجمہ "کسی بھی چمن" کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ترجمے کی بحر بھی چست ہے۔ اس غزل کا مقطع :۔

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جاکے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

خوک مدیر ته د مخزن وِ، د اپیغام د اقبال یوسی
کوم قومونه چه عمل کړی، نه کوی شعر و سخن(۲)

ایک دوسری غزل کا نمونہ :۔

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں؟
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

غوټئی اووے اے ګلچینه، انسان ولے دے بے درده
ما تیدو ته د پیالے سے، تانوم کیښنود د مسکا(۳)

دوسرے مصرع کا مطلب :۔ میرے پیالے کے ٹوٹنے کو تو نے مسکراہٹ کا نام دیا۔

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے، مجھ فرقت کے مارے میں

په اواز د لن ترانی اقبال چپ دے څه نۀ غواړی
طاقت کوم دے ماغوښ شوی، د هجران په کټاره کښی

---

(۱) ترجمہ بانگ درا، ص ۱۴۴ (۲) ایضاً
(۳) ایضاً، ص ۱۳۶

غزل نمبر ۶ کا ترجمہ دلکش، پر تاثیر اور مثالی ہے۔ ترجمہ گویا اصل کی شرح ہے، لیکن اس کے باوجود بھی بحریں چست اور مختصر ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہو :۔

مثالِ پرتوِ مے، طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

لکه عکس د شرابو چه طواف د جام کوی
دغه سونځ دے چه عاشق ئے په صبا ماښام کوی

نیا جہاں کوئی اے شمع! ڈھونڈیئے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ نا تمام کرتے ہیں

بل جهان لټوه شمعے ، دے جهان کښې دا دستور دے
چه نامراده نیمه خوا ترے، نه تلۀ خاص وعام کوی

جس طرح شراب کا عکس جام کا طواف کرتا ہے۔ وہی نماز ہے جو عاشق صبح وشام پڑھتا ہے۔

اے شمع دوسرا جہان تلاش کر، کیونکہ یہاں کا دستور نرالا ہے۔ یہاں سے خاص وعام سارے نامراد و محروم چلے جاتے ہیں "نمود صبح"

آسمان نے آمد خورشید کی پا کر خبر
محمل پروازِ شب باندھا سر دوشِ غبار

چه اسمان دے نه خبر شه، چه نمر راغے راروان دے
نو په خره کښې ئے رخصت کړله د شپے توره لیلا (۱)

دوسرے مصرع کا مطلب :۔ رات کی کالی لیلی کو دھندلکے میں رخصت کیا۔

ہے تہِ دامان بادِ اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس، آوازِ اذاں سے ہمکنار

د سحر باد ګډ وډ کړی، اوازونه دی خورېږی
دناقوس اواز جهان ته ، ورکړه غېږ د مشغولا

(باد صبح نے آوازوں کے اختلاط کو پھیلا دیا ہے۔ ناقوس کی آواز نے دنیا کو مصروفیت کا احساس دلایا) ترجمہ اتنا آزاد ہے۔ کہ تہِ دامان اور اذان کے الفاظ نظر انداز کر دیے گئے ہیں لیکن پھر بھی مطلب واضح ہے۔

"تضمین بر شعر انیسی شاملو" کا یہ شعر :۔

---

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۱۶۶

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے
کنشتی شاز ، معمورِ نواہائے کلیسائی

ته خبر ئے اے غافله، چه ستا ژوند په څنګه حال دے
د ګرجے بوه باجه ئے غږ وی دِ عیسا یا ن

(اے غافل! تجھے معلوم ہے کہ تیری زندگی کیا ہے؟ تو گرجے کا ایک باجا ہے جسے عیسائی بجاتے ہیں۔)"ایک حاجی مدینے کے راستے میں"کا یہ شعر:

آہ! یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے!
اور تاثر آدمی کا کس قدر بیباک ہے!

آه! دا عقل څه فکرونه کړی د زیان څومره چالاک دے!
او بیا عشق د بنیادم ګوره چه څه قدر بیباک دے!(۱)

" شکوہ" میں: ع عرب بھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراوں میں

کله وو د افریقے په ،تودو شګو به روان(۲)

صحراوں کا تعلق ریت سے ہے۔ شاعر نے تپتے ہوئے صحراوں کو تپتے ہوئے ریت سے بدل دیا ہے۔

؎ تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

په سرکشو پسے ستاه به، مونږه تورے راخستلے
تیغ لاڅه مونږ ه به توپو، ته سینے هم وے نیولے(۳)

ہم تیرے سرکشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تلواریں اٹھاتے، تیغ تو کیا ہم توپ کے سامنے سینہ سپر ہوتے تھے۔
"غرۂ شوال" میں:۔

؎ آشنا پرور ہے قوم اپنی، وفا آئین ترا
ہے محبت خیز یہ پیراہن سیمیں ترا

زمونږ قوم اشنا پرست دے او وفا ستا طریقه ده
دا قمیص د سپینوزرو دِ د مینے یو چینه ده

دوسرا مصرع:۔ تیرا سیمیں لباس محبت کا چشمہ ہے۔ مترجم نے محبت خیز کا ترجمہ (محبت کا چشمہ) کیا ہے۔
"شمع و شاعر" میں

ع یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

یا خوسر تر سر شه چغه ، یاچه سُنړ اونه کړے بیا

---

(۱) بانگِ درا، (ترجمہ) ص ۱۷۵ (۲) ایضاً ص ۱۷۸ (۳) ایضاً، ص ۱۷۹

"سنڑ اونہ کڑے بیا" پشتو کی زبردست دلکش اصطلاح ہے جو مکمل خاموش رہنے سے عبارت ہے۔
"شاعر" میں :۔

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

کہ والۂ د شعر نہ وی د دنیا پہ دے گلشن
نہ بہ گل، نہ بہ غوټئی وی، نہ شینکے او نہ چمن

شاعر نے جوئے مئے سخن کا ترجمہ شعر کی ندی (والۂ د شعر) کیا ہے اور بحر کو چست رکھنے کے لیے مئے کو نظر انداز کر دیا ہے۔"
"شعاعِ آفتاب"

تو کوئی چھوٹی سی تجلی ہے کہ جسکو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

تہ هغه وړه بجلئی ئے چه ساتی ئے اسمانونه
لویوی دے، سوزوی پرے د قامونو درمندونه

(دوسرا مصرع :۔ تجھے جوان کر کے تجھ سے خرمنِ اقوام جلاتا ہے) شاعر نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ آسمان تیری پرورش کر کے کیوں جواں بناتا ہے۔ خضرِ راہ میں حصہ "دنیائے اسلام" کا یہ شعر

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست(i)
مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر!

مومیائی په سوال غوښتو نه ښه ده دا چه ملاوی ماته
حاجتمن د سلیمان مه شه، میږیه بې وزرا!

(مومیائی مانگنے سے ٹوٹی ہوئی کمر بہتر ہے۔اے بے پر چیونٹی! سلیمانؑ کا حاجتمند نہ ہو جا)

ع زمیں جولانگہِ اطلسِ قبایانِ تتاری ہے۔

د خدائے زمکه د ترکانو ځائے د جنګ او دغیرت دے

(زمینِ خدا ترکوں کی جنگ و غیرت کی جگہ ہے) شاعر نے اطلسِ قبایانِ کا ترجمہ نظر انداز کر دیا ہے لیکن پھر بھی ترجمہ دلکش ہے۔ ذیل میں وہ تراجم دیے جارہے ہیں جن میں راحت مرحوم نے پشتو زبان وادب کے اصطلاحات و محاورات کے علاوہ فن ادب کا کمال دکھایا ہے۔

۔۔۔۔ مثالی تراجم ۔۔۔۔

"چاند اور ستارے"

(i) مومیائی ایک دوا جو موم کی طرح نرم ہوتی ہے اور زخم کے لیے مفید ہے۔

؎ کہنے لگا چاند ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو

اووے سپوږمئ چه زما ملګرو
د شپے بتی کبن ګویا لوګرو

لوګرو ایک خوبصورت اصطلاح ہے یعنی پکی کھیتی کاٹنے والے۔

؎ چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

چه څوک وو تلونکی هغوئ لاړو
او هغوئ دل شو چه څوک و لاړوو(۱)

"دل شو" خوبصورت محاورہ ہے جو کچلنے کا مترادف ہے۔"وصال" کا یہ شعر :۔

از نفس در سینہ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

خپله ساه مے په سینه کبن سور په وینو یونشتر وو
دغے چپے ورځے کبن مے دغوغانه ډک محشر وو(۲)

؎ یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
از خنک روزے کہ خاشاکِ مرا و اسوختی

اوبنودل په یو نظر دِ اد بونه د فنا
بختوره ورځ وه اسولو خاشاک چه دِ زما(۳)

" سلیمیٰ" کا ترجمہ بھی مثالی ہے۔"عاشق ہر جائی" اقبال کی ذاتی بو قلمونیوں پر مشتمل ایک دلکش نظم ہے۔ترجمہ پر تاثیر اور مثالی ہے۔ نمونہ

جانب منزل رواں بے نقش پا مانندِ موج
اور پھر افتادہ مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے

ځے منزل ته خود پبنو پل، دِ نه بنکاری لکه موج
بیا پریوتے لکه غاړه ددریاب ته یو خوا هم ئے(۴)

"ایک شام" جو ہائیڈل برگ کے کنارے دریائے نیکر کی خاموش فضا کی ترجمان ہے۔دلکش نظم ہے۔اس کا ترجمہ با محاورہ اور مثالی ہے۔

---

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۱۲۵ (۲) ایضاً، ص ۱۲۶ (۳) ایضاً، ص ۱۲۷ (۴) ایضاً، ص ۱۲۹

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے۔
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

چف شوے پہ فضاد خاموشئ داسے ستر دے
بیخی چہ پہ قلارہ قلارئ تک دنیکر دے(۱)

فضا اور قلاری زائد الفاظ ہیں لیکن ان دلکش الفاظ سے ترجے کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔"پیام عشق"

ـ نہیں ہے وابستہ ہے زیر گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

دا کمال یواځے سر د سکندر پورے خونۀ دے
ټول سامان دے ستا سینہ کښې ، ولے تۀ ہم ائینہ ساز شہ(۲)

(پہلا مصرع : یہ کمال صرف سر سکندری سے نہیں) شاعر نے بحر کو چست رکھنے کے لیے زیر گردوں کی ضرورت محسوس نہیں کی پھر بھی مزید "شان" کو "سر" سے بدل دینا دلکش ہے۔

"صقلیہ" کا یہ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تو کبھی اس قوم کی تہذیت کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

جرے جرے د تہذیب د داسے قوم وے تۀ زانگو
سوزلو چہ عالم بہ ئے بنائست د نندارو(۳)

(دوسرا مصرع :۔ جس کے حسین نظارے دنیا کو اپنی تپش سے جلا ڈالتا) غزل مارچ ۱۹۰۷ء

۱۔ سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہو گا

قافلہ دمیږو خوارو بہ کشتئی پانړہ د ګل کړی
پہ دریاب بہ پورے اوځی کہ زرموجہ پہ غړ مبار وی

۲۔ خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

عاشقان خود خدائے ډیر دی، چہ ځنګل پہ ځنګل ګرځی
زہ تابع یم د ہغۀ چہ ، د بندیانو مینہ داروی

---

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۱۳۶ (۲) ایضاً، ص ۱۳۸ (۳) ایضاً، ص ۱۴۲

یہ ترجمہ اس طرح دلکش ہو گا۔

عاشقان خو د الله دی په زرگونو چه دی سر په ځنګلونو

زه غلام د هغه چا چه د بندیانو سینه دار دی

شاعر نے الفاظ کے معانی اور قافیہ اور ردیف میں کمال دکھایا ہے۔ ناتواں کو خوارو، کشاکش کو غرمبار سے بدل دینا شاعرانہ فنکاری سے کم نہیں ۔ "گورستانِ شاہی" کا ترجمہ بامحاورہ اور سلیس ودلکش ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار

یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار

اے هوسه ژاړه ژاړه په دے ژوند نشته اتبار

ژوند مسکا ده د بڅری ، یا خسنړے په انګار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو

مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو!

تل لیکلے په غمی شی دَ دنیا نوی نومونه

تل په ګیډه وی دمور د زمانے نوی قومونه

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں

اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

زړهٔ دتیرو ختونو یاد نه، مونهٔ دے خالی کیدونکے

هم د خپلو بادشاهانو ، داقام نهٔ دے هیرونکے

"فلسفۂ غم" میں اقبال نے زندگی، ہجر اور عروجِ آدم پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ نظم دراصل فلسفۂ حیات ہے۔ اس دل دوز نظم کا ترجمہ بھی بڑا پر تاثیر ہے بعض اشعار کے مطالب پیچیدہ ہیں لیکن ترجمے میں پشتون قارئین کے لیے دلچسپی اور تجسس کے ایسے سامان موجود ہیں کہ قاری مصرعوں کی سیڑھیوں پر بام عروج تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بیقرار ہے اور یہی بیقراری اسے ہر مصرع پوری لگن سے پڑھنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی آتی ہے تو آسمان پر اڑتے ہوئے مرغانِ خوشنوا کو بھی یہی دلکش نغمہ گیت کا گر سکھا رہی ہے۔ گنگناتی ہوئی ندی کا پانی جب نشیبی چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو اسی افتاد سے تارے اور گوہر بیش بہا بن کر چمکتا ہے۔ قطرات کے اس ہجر سے ان کے لیے وصال کی تعلیم ہے۔ اور پھر دو قدم آگے یہ نہر تارِ سیم دکھاتی دیتی ہے۔ دراصل زندگی ایک نہرِ رواں کی سی ہے جو اوپر سے گری تو انسان کی صورت نمودار ہوئی۔ اس پستئ عالم میں ہماری جدائی وصال کے لیے ہے لیکن ہم اس عارضی فرقت کو دائمی جان کر روتے رہتے ہیں۔

ایک اصلیت میں ہے ہمر روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

اصلیت کښې ژوند هم یو دے لکه نهر دے روان
چه له پورته نه راخلاص شه، نو شه جوړ تړے نه انسان(۱)

پستئ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

ددے خاورو په عالم کښې، مونږ وصال ته جدا کیږو
عارضی بیلتون ګنړو مونږ ابدی، څکه ژړیږ و(۲)

شاعر نے "پستئ عالم" کو " ددے خاورو په عالم"، اور فرقت کو بیلتون ، کہہ کر کمال دکھایا ہے۔"وطنیت" سے اقبال کا ایک اہم نظریہ، "وطنیت اور قومیت" ابھر تا ہے۔انھوں نے وطنیت کو قومیت اسلام کی جڑ کٹنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ترجمہ خوبصورت اور اصل جیسی خوبیوں سے مالامال ہے۔

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھادے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملادے

نندارہ دِ پخوانئی بنکارہ کړه اسے مصطفویﷺ
دغه بُت خاوره کښې خاورے کړه چه تل به خاوره وی(۳)

"شکوہ"

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے ؟
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے ؟

دکفارو بتان وایه ریز مریز کړل کسکر چا؟
د مولو په شان کوتره کړو دکفارو لښکر چا؟

مترجم کے دونوں مصرے بڑے دلچسپ ہیں"ریز مریز کړل کسکر "(چکنا چور کرنا) پشتو کا خوبصورت محاورہ ہے۔ دوسرے مصرع میں دلفریب تشبیہ ہے"دمولو په شان کوتره" جس طرح مولی آسانی سے کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔اس طرح کفار کے ٹکڑے ٹکڑے ہونا مراد ہے۔اس لیے ترجے میں گویا نگینے جڑے ہوئے ہیں جس کی چمک دمک سے قاری متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ع کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو

یخه پخه ایره چا آتشکده کړه د ایران

---

(۱) راحت، ص ۱۷۰

(۲) ایضاً، (۳) ایضاً، ص ۱۷۳

(آتشکدہ ایران کو کس نے ٹھنڈی راکھ بنادیا) یخہ مہمل ہے جو یخہ کلمہ کے ساتھ حسن کلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ع شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے!

ھم دشپے اسویلی لاړل ، دسحر چغے سوران ھم(۱)

ع ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں

مونږ ھم ھغه لوغړن یو، ولے تاته نه دی یا دے (۲)

ترجمے میں اسویلی، چغے سوران اور لوغړن جیسے الفاظ تراشے ہوئے نگینے کی مانند ہیں "خطاب بہ جوانانِ اسلام" ایک دِلدوز اور پر تاثیر نظم ہے۔ شاعر مشرق نے نوجوانوں کو شاندار ماضی کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

خو د علم ملغرے ، کتا بونه د نیکونو
چه ئے اوگورُو یورپ کښ، زړه موشی آره آرا

(آرہ آرا سے مراد آری سے چیرے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے ہیں، جو انتہائی زخموں سے چور دل کے لیے استعارہ ہیں۔ "شمع و شاعر"

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا، رہی لیلا کے دیوانے رہے

نن ھغه میرے شوے شاړے ، مجنونان به ئے پالل چه(i)
چه لیلیٰ او لیونی ئے گډیدل به ویرانے شوے(۳)

"جواب شکوہ"

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

اے مالی د چمن رنګ بانده چه اونه کړے خفګان
سانګے نوے غوټئی نیسی دغنچک ستورو په شان(ii)

(اے مالی! چمن کے رنگ پر آزردہ نہ ہو کیونکہ شاخوں سے ستاروں کی مانند نئی کلیاں پھوٹنے والی ہیں) "غنچک" ایک خوبصورت اصطلاح ہے جو "جھرمٹ" کے لیے مستعمل ہے "شاعر" خوبصورت نظم ہے۔ مترجم نے اور بھی سحر کاری دکھائی ہے۔ نمونہ :۔

جامِ شراب کوہ کے خم کدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کا جا پلاتی ہے

(۱) بانگ درا (ترجمہ) ص ۱۸۰ (۲) ایضاً، ص ۲۰۶ (۳) ایضاً، ص ۲۳۵

(i) میرے شوے شاړے (دشت بے آب و گیاہ اور بنجر و خاموشی) ایک خوبصورت اصطلاح ہے۔ (ii) غنچک ستورو په شان خوبصورت تشبیہ

پاس د غرۀ له خمخانو نه جام راوړی، راځ کوی

ځی په لوړو په ژورو او پټی اوبه کوی(۱)

(پہاڑ کے بلند خمخانوں سے پیالے بھرتے اور لاتے ہیں۔ مدوجذر سے ہوتے ہوئے کھیتوں کو سیراب کرتی ہے)

"ارتقاء"

"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

له انګورو نه شراب چه را اوباسی شراب ګر

ذا د ستورو غنچکونه شو کوی جوړ وی نمر(۲)

"والدہ مرحومہ کی یاد میں"

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح

مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

که قانون د هستئی داوی چه دِهر مابنام صبا وی

نوقبر ددے شپے به هم آخر انجام صبا وی(۳)

دوسرا مصرع اگر اس طرح ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

نو قبر دانسان د شپے به هم ګویا انجام صباوی

شاعر نے دوسرے مصرع میں "انسان" کو حذف کیا ہے۔ اور سوالیہ کو مثبت میں بدل دیا ہے۔

خروش آموز بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے

کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

چغار او ښنیه بلبل ته د غوټئی غوټے کړه خلاصے

چه دے باغ ته لکه باد د سپرلی ستاوجود رحمت دے(۴)

بلبل کو نالے سکھا اور غنچے کی گرہیں کھول دیں کہ اس باغ کے لیے بادِ بہار کی طرح تیرا وجود رحمت ہے۔ چوتھی غزل کا ترجمہ خوبصورت ہے کیونکہ بحریں بھی چست اور دلکش ہیں نمونہ:۔

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال

کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر(i)

اے اقباله یوه ورځ به د لیلیٰ په منزل ورشے

یو څو ورځ سزلونه اوکړه نور هم په بیدیا(۵)

(i) بادیہ پیمائی: جنگل جنگل پھرنا

(۱) بانگِ درا(ترجمہ)ص ۲۳۵ (۲)ایضاً،ص ۲۴۹ (۳)ایضاً،ص ۲۶۵ (۴) ۳۱۴ (۵)ایضاً،ص ۳۱۹

چھٹی غزل بانگ درا کی سب سے زیادہ مشہور غزل ہے جو بد قسمتی سے قوالوں کو پسند آگئی اور انھوں نے پشاور سے لے کر کلکتہ تک ہر محفل میں، اور ہر درگاہ میں گانا شروع کر دیا۔ اس میں تصوف کی زبردست چاشنی موجود ہے۔ حقیقت اور مجاز، آئینہ اور آئینہ ساز، سوز و گداز، غزنوی اور ایاز، صنم آشنا، اور نماز جیسے الفاظ بڑے دلکش ہیں۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو، زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں
چه مے سر په سجده کیښنو، دا اواز راغے له زمکے
ستا زړه بت سره آشنا دے څه به اوموسی نماز کښ (۱)

ظریفانہ :۔

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے
اوتو ږلے شو لږکی سره ترکانړهم
چه تیرے دی د یورپ رندے بلا(۲)

ہر تصنیف و تالیف اور تحریر میں املا کی اغلاط لکھنے والے سے سہوا ہو جاتی ہیں اس ترجمے میں بھی اس قسم کی غلطیاں سامنے آئی ہیں جو ذیل میں رقم کی گئی ہیں۔

صفحہ	اغلاط	صحیح	صفحہ	اغلاط	صحیح
۴۱	مڑاوے گل	مړاوے گل	۱۰۴	ہکارہ	ښکاره
۵۴	زڑۂ	زړهٔ	۱۱۰	ړوند	رند
۶۲	وڑد	دړد	۱۲۱	ساحل	حاصل
۹۱	خاَلی	حالیَ	۱۲۳	غوٹئی	غوټئی
۲۹	تقاب	نقاب	۱۲۸	سوداھم دے	سودا هم ئے
۴۹	غاڑہ	غاړه	۱۳۴	برخیر	برخیز

(۱) راحت، بانگِ درا، ص ۳۲۱
(۲) ایضاً، ص ۳۳۵

صفحہ	غلط	صحیح	صفحہ	غلط	صحیح
۱۳۹	یارونو	یادونو	۲۴۰	اسمان	انسان
۱۴۲	داغ	داَغ	۲۷۱	بقا	قبا
۱۴۳	دمه	رمه	۲۹۱	په	به
۱۶۸	دا ائینه	آه ائینه	۳۳۵	اوتوکلے شو	اوتوډلے شو
۱۷۳	میر مجاز	میر حجازؒ			
۱۸۴	منزل	محفل			
۱۸۸	اوچت	او، چپ			
۱۹۴	کرخی	کرسی			

ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو کلام اقبال سے اصل نقل ہیں یا قافیوں کی صورت میں ہیں جو پشتو میں مستعمل نہیں، جس کی وجہ سے کلام کا ترجمہ پیچیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔

ذیل میں وہی الفاظ درج ہیں۔

بربط، محمل، مینا، ہفت کشور، عنابی، شمشیر، جہانگیر، صداقت، عطا، نیم شب، حلب، عنب، جفاطلب، اسیر، تنویر، پاش، انتعاش، فاش، سمندری، عنتری، ارجمند، بہرہ مند، گدائی، مومیائی (وہ کامیاب دوا جو ہڈی جڑنے کے کام آتی ہے)، اضطراب، مہتاب، شباب، حجاب، محشر، بانگ رحیل، سنگ میل، سلسبیل، نخیل، برات، نبات، مسکرات، حیات، مات، تثلیث، گاز، گداز، نیساں، مکیں آئی، جاویداں، نبوت، خانی، ارمغاں، پاسبان، فراوانی، مقصود، قہستانی، رہبانی، زندانی، زبانی، بیکراں، جاوداں، شبستاں، نوری، ناری، نگار، گوش، روپوش، روش، بندہ نواز، گداز، نیاز، آئینہ ساز، پل دیر، معاد، فلیٹ، (Fleet) سے فلیتہ، نیلی رواق (نیلا آسمان)، لایطاق (نا قابل برداشت)

ب

کتاب :- ګله جواب دګلې په پښتو

مترجم :- حکیم مولوی صاحب ګل

ناشر :- کھوئی برمول مردان

سنِ اشاعت :- ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء)

صفحات :- ۳۲

کتاب :- شکوه او جواب شکوه

مترجم :- عبدالمنان (اپیل نویس)

ناشر :- حمیدیہ پریس چارسده (پشاور)

سن اشاعت :- ۱۹۴۵ء

صفحات :- ۱۶

﴿---ګله جواب دګلے په پختو---﴾

مولوی صاحب گل نے شکوہ و جواب شکوہ کا ترجمہ اس وقت شائع کرایا جب علامہ اقبال کی وفات کے تقریباً آٹھ سال ہو چکے تھے۔ یہ چھوٹی تقطیع کی مختصر سی کتاب ہے، ترجمہ کچھ زیادہ معیاری نہیں۔ بعض مصرعوں کا وزن بھی صحیح نہیں اور رسم الخط بھی غلط ہے لیکن ان تمام تر فروگزاشتوں کے باوجود بھی اس کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ آج سے تقریباً (۱۹۴۶ء) چھپن سال پہلے سرحد کے ایک دور افتادہ اور پسماندہ علاقے کھوئی برمول کے ایک عالم پشتون کلام اقبال سے متاثر ہوئے اور انھوں نے ان کی شہرۂ آفاق نظم کو پشتو میں ڈھالنے کی ضرورت محسوس کی۔

"شکوہ" کے کل بند اکتیس (۳۱) ہیں جو کلیات اقبال کے مطابق صحیح ہیں۔ جبکہ "جواب شکوہ" کے کل اڑتیس بند ہیں جس میں دو بند اضافی ہیں۔ جب یہ نظم پہلی بار شائع ہوئی تو علامہ نے بعض بند حذف کر دیے۔ یہ نظمیں "باقیات اقبال" (سید عبدالواحد معینی کی تصنیف) میں اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔ "جواب شکوہ" کا ترجمہ کلیاتِ اقبال میں مرقوم مذکورہ نظم کے بندوں کی ترتیب پر نہیں ہے۔

کتاب :۔ شکوہ او جواب شکوہ

مصنف :۔ عبدالمنان (اپیل نویس)

ناشر :۔ حمیدیہ پریس چارسدہ (پشاور)

سنہ اشاعت :۔ ۱۹۴۵

عبدالمنان کا ترجمہ بڑی تقطیع کے ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے ترجمہ سلیس اور سادہ انداز میں کیا گیا ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ ۳۹،۳۹ بندوں پر مشتمل ہیں جبکہ کلیات اقبال میں شکوہ کے اکتیس (۳۱) اور جواب شکوہ کے چھتیس (۳۶) بند ہیں۔ اس کے علاوہ ترجمے میں اللہ تعالیٰ کا رسول کریمؐ سے اس شکوے کی شکایت اور نبی کریمؐ کا جواب سات سات بندوں پر مشتمل اس کے علاوہ ہیں رسم الخط صحیح ہے لیکن بعض غلطیاں سامنے آتی ہیں۔ بعض مصرعوں کے اوزان اور قافیے بھی صحیح نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی مترجم اقبال کے مفاہیم سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس ترجمے کی تاریخی حیثیت مسلم ہے کہ تراجم میں علامہ اقبال پر سے اوّل لکھی جانے والی کتاب ہے۔ اسلیے عبدالمنان مترجمینِ اقبال میں سرفہرست ہیں۔ ذیل میں شکوہ اور جواب شکوہ کے مذکورہ بالا دونوں تراجم کا تقابلی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ شکوہ کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

(۱) عبدالمنان

ولے نقصان وکمه نفعے ته نظر اونه کم
پرونے غم جاړم او فکر د سحر اونه کم
د بلبلانو د نالو نه زان خبر اونه کم
لکه د ګل چپ شم او سوچ په لرو بر اونه کم
د لیری رامے کړه وینا شکوه کوم د الله
خاورے په خولے دِ، وی زما ګله کوم د الله

(۲) مولوی صاحب گل

ولے زیان کارشم خپله نفع ولے بنیره کړمه
صبا مِ غم شته - دیرون په غم ورزتیره کړمه
دبلبلانو جړا خپل غوګ کے راګیر کړمه
جانه ګل نه یمه چه خاموشه موده تیره کړمه
دیر زگرور شم ده خبرو سلسله لرمه
خاورے په خولے شم زه دخپل خدایه ګله لرمه

(۱) عبدالمنان کے ترجمے میں اغلاط

غلط	صحیح
اوکھ	اوکړمه
کم	کړم
جاڑم	ژاړم
زان	ځان

(۲) مولوی صاحب کے ترجمے کی اغلاط

غلط	صحیح	غلط	صحیح
ہیره	هیره	راگیره	راګیره
کڑمه	کړمه	گل	ګل
مِ	مې	یمہ	یمه
شتہ	شته	خاموشہ	خاموشه
ده	دَ	ڈیر	ډیر
ورز	ورځ	زگر	ځیګر
جڑا	ژړا	سلسلہ	سلسله
غوگ	غوږ	خدایہ	خدایه
شم	شوم		
زه	زۀ		
گله	ګله		

مذکورہ ایک بند میں دونوں تراجم کے رسم الخط کی اغلاط سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب کے رسم الخط کا معیار کیا ہے بے شمار اغلاط کا مرقع ضرور ہے۔ لیکن زبان وبیان دلکش اور بحریں چست ہیں۔ ایک شعر :۔

ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ، تو معذور ہیں ہم

غم وفریاد نه لکه اور ډک د تنور یو مونګ
آه د فغان که کوو پریده چه معذور یو مونګ

غم وفریاد سے تندور کی آگ کی طرح بھرے ہوے ہیں آہ و فغاں اگر کرتے ہیں تو چھوڑ، کہ ہم معذور ہیں۔ لفظی ترجمہ ہے لیکن "لب" کا ذکر مفقود ہے۔

ے شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

۱۔ هوا یے راغله شولے خور په بیابان باندے
که هوا نه وے خور به نه وے په داشان باندے

۲۔ قدیمه خدایه ستا بیحده دی الطاف عنایات
بے له نسیمه بوئی ده گل نه خوریده په جهات

عبدالمنان کے ہاں پہلے مصرع کا ترجمہ مفقود ہے۔ مولوی صاحب نے "شرط انصاف ہے " کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ الطاف عنایات ،نسیمہ اور جہات، مشکل الفاظ ہیں۔

ع آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز

۱۔ په وخت د جنگ کے که به راغے چرته وقتِ نماز

۲۔ دجنگ په مینځ که به راغے چرے وقت ده نماز

اول الذکر ترجمے (عبدالمنان) میں وخت اور وقت دونوں مستعمل ہیں دوسرے میں وقت اور نماز دونوں کے پشتو الفاظ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ے دشت تو دشت ہیں صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

۱۔ دشت و جبل سیندونه مونگ نه حیرانی اوکړله
زمونگ اسونو سمندر کے جولانی اوکړله

۲۔ وچه خوسه کئے دریابونه هم کتلی دی مونږ
کالی دریا کے خپل آسونه زغلولی دی مونږ

بحر اسود (Black Sea) یعنی بحر ظلمات سے اطلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) مراد ہے جو افریقہ اور امریکہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب عقبہ بن نافع نے مراکش فتح کرنے کے بعد اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور کہا اے خدا! مجھے افسوس ہے کہ تیری زمین ختم ہو گئی ورنہ میں اسی طرح فتوحات کرتا چلا جاتا۔

ترجمہ نمبر ۱ میں "دشت و جبل اور جولانی" مشکل الفاظ ہیں۔ ترجمہ نمبر ۲ میں "کالی دریا" پیچیدہ مرکب ہے۔

ع ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں

ع سوک پکے مست دی سوک غافل بعض ہنشیار دی هم (مولوی صاحب)

اس میں مست کی جگہ سُست چاہیے۔

جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی

تک هم په لارے ده تسلیم او ده رضا نشته دے

مولوی صاحب نے تسلیم ورضا، کے ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں کی

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا

قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

۱۔ نشته مجنون د نجد نه هغه لیلٰے پاتے شوه

هغه محمل د لیلٰے نه قیس غوغا پاتے شوه

۲۔ ده نجد په مزکه بنفه شور ده زنجیر ینو نشته

مجنون زبون ده کجاوے په منظرونو نشته

عبدالمنان کے دونوں مصرعے یکساں نہیں ہیں اس لیے ترجمہ ناقص ہے مولوی صاحب کا ترجمہ لفظی ہے لیکن صحیح ہے۔ بے شک رسم الخط غلط ہے۔

ع اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پروازِ چمن

ا۔ والوتل سانګو نه کُل زمزمه پرواز د چمن ___

عبدالمنان نے زمزمہ پرواز چمن کے معانی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ع وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں

ده باغ زړے طریقے ورانے شولے ونړ یدے

مولوی صاحب کا ترجمہ غلط ہے کیونکہ روشیں بمعنی راستے کے ہیں جبکہ عبدالمنان نے صحیح استعمال کیا ہے۔ "طریقے" کی جگہ "لارے" چاہیے

ع نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

۱۔ جبه پختوده خوکباب دی حجازی پکے نن

۲۔ نغمه هندی د ه خونصاب زه حجازی لرمه

نغمه هندی سهی خوسرُ زه حجازی لرمه

عبدالمنان کا ترجمہ (ا) غلط ہے کیونکہ کلامِ اقبال کا ترجمہ مقصود ہے اسمیں پختو (پشتو) ہندی کا مترادف نہیں ہو سکتا۔

﴾۔۔۔۔جواب شکوہ۔۔۔۔۔﴿

عشق تھا فتنہ گرو سرکش وچالاک مرا
آسماں چیر گیا نالہ بیباک مرا

گله زما پورته آسمان ته په هوا لاړه
يعنی د گل خوشبوئ عرش ته رسا لاړه

عبدالمنان نے اصل سے چشم پوشی کرتے ہوئے خانہ پری کا کام انجام دیا ہے ترجمے کا مطلب ملاحظہ ہو۔
میرا گلہ اوپر آسمان تک ہوا کے دوش پر اڑا یعنی خوشبوئے گل کی طرح عرش تک پہنچ گیا

ع عالم کیف ہے اسرارِ رموز کم ہے

(منطق و فلسفہ جانتا ہے لیکن عجز وانکسار سے ناواقف ہے)

۱۔ تولو ویل چه اسرا رونه خه عالم دے
۲۔ علم ظاهری لری ناپوهنه په اسرار کم دے

عبدالمنان کا ترجمہ (۱) غلط ہے اصل سے کوئی ربط نہیں رکھتا، جبکہ مولوی صاحب مطلب پر قابو پانے میں قدرِ کامیاب ہوے ہیں۔

ع اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا

شرابِ غم نه ډکه شوے پیمانه لرے ته

عبدالمنان نے اشکِ بیتاب کا ترجمہ شراب غم کیا جو کہ صحیح نہیں ہے یہاں شراب غم کی جگہ "اوښکو دغم" چاہیے

ع فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

۱۔ فلسفه شته دے خو تعليم د غزال نشته دے

عبدالمنان کا غزالی سے غزال صحیح نہیں ہے۔ شاعر نے قافیہ پیمائی کی رو میں بہہ گئے ہیں اسکے علاوہ یہ مصرع :۔

یعنی وہ صاحب اوصافِ حجازی نہ رہے

په حجازی صفت موصوفه روزه دار سه شو

"روزہ دار" اضافی ہے

خود گدازی نم کیفیت صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

۱۔ اوس ته یریګے په سمبر باندے ختلے نشے
ته انا الحق لکه منصور غوندے وئیلے نشے

ترجمے کا اصل سے کوئی تعلق نہیں ۔

ع تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

۱۔ رومبنے نه دے داسسلم چه مسلمان دے نن

(ترجمہ کا اصل سے کوئی تعلق نہیں۔)

گلۂ جور نہ ہو ، شکوہ بیداد نہ ہو

عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

۱۔ د تحریر شوق سے په مضمون کے ویلے کیگی نن

پرده کے پټ او د حجاب بے پردے کیگی نن

ترجمے کا اصل سے کوئی تعلق نہیں۔

ع ہاں، مگر عجز کے اسرار سے نامحروم ہے

ده طریقے درازونیاز نه نا خبر هم دے

مولوی صاحب نے عجز کو نظر انداز کر دیا ہے اس لیے ترجمہ مبہم ہو کر رہ گیا ہے۔

۔۔۔راحت زاخیلی کے ترجمے کا معیار۔۔۔

راحت، اقبال کے ہم عصر تھے اور اقبال کو پشتو زبان میں متعارف کرانے کا سہرا اُن کے سر ہے۔ ایک معیاری ترجمے نے انھیں مترجمین اقبال میں ایک اعلیٰ درجے پر فائز کیا، اُس جیسے مترجم کا ملنا محال ہے۔

بعض مقامات پر بحریں سست، طویل، پیچیدہ اور مشکل ہیں جو اصل (کلام اقبال) کی روانئ بحر، بے ساختگی، اور شعری غنائیت سے مالا مال تلاطم خیز جذبات میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ جبکہ بعض مقامات پر ترجمہ ضرورت سے زائد دکھائی دیتا ہے اور بحروں کی وہ چستی اور جذب و مستی نہیں رہتی جو اصل کا طرۂ امتیاز ہے

بعض مقامات پر ترجمہ آزاد اور بامحاورہ ہے اگر چہ اقبال کے مطالب پیچیدہ ہیں لیکن مترجم نے بعض الفاظ و تراکیب کو نادر تشبیہات و محاورات اور عمدہ اصطلاحات میں پیش کر کے کمال دکھایا ہے۔ جسکی وجہ سے ترجمے میں پشتو قارئین کے لیے دلچسپی اور تجسس کے سامان موجود ہیں۔ بعض الفاظ و تراکیب اتنے عمدہ ہیں گویا لڑی میں دُرِ تاباں پروئے ہیں جن کی تابانی سے قاری متحیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ایسا ترجمہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔

بعض اشعار میں الفاظ و تراکیب یا محاورات کا دلکش اضافہ کیا گیا ہے۔ یا اصل الفاظ و تراکیب کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن مفہوم پر کوئی حرف نہیں آتا۔

شاعر نے بعض قافیے غلط استعمال کیے۔ بعض الفاظ قافیہ پیمائی کے لیے اضافی ہیں۔ بعض مصرعوں یا اشعار کا ترجمہ مفقود ہے۔ اور بعض مصرعے یا اشعار مبہم اور بے معنی سا ہو کر رہ گئے ہیں۔ جہاں اصل الفاظ و قوافی کی بھر مار ہے وہاں اگر چہ بحریں چست اور مختصر

ہیں لیکن ترجمہ پیچیدہ اور مشکل ہو کر رہ گیا ہے۔ شاعر نے ان کے پشتو مترادفات کی ضرورت محسوس نہیں کی اور قافیہ پیمائی کی رو میں بہہ گئے ہیں۔

مترجم تخیل اور انداز بیان پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا جب تک وہ پرجوش نہ ہو جائیں۔ جب وہ ان دونوں میں سے ایک پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور یہ گھڑی اس کے لیے آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔

کلام اقبال اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے۔ مترجم کے لیے مشرقی لسانیات، فلسفیانہ نظریات اور فلسفۂ اسلام کا عالم ہونا ضروری ہے۔ خاص طور پر اردو، پشتو، اور فارسی زبان پر قدرت حاصل ہو تاکہ وہ علامہ کے تخیل اور انداز بیان دونوں کو اس طرح بطریقِ احسن پیش کر سکے کہ اقبال کے بانگِ درا کی بازگشت، افغانی اقبال کے شعری پیکر میں جلوہ گر ہو۔

پیام اقبال کی گونج پشتونوں کو بیدار کرنے کے لیے تا روز مکافات سنائی دیتی رہے گی۔ شکوہ اور جواب شکوہ منظومات کے پشتو تراجم مولوی صاحب گل اور عبدالمنان کی اقبال اور افغانی ملت سے عقیدت و محبت کا نتیجہ ہیں۔ تاریخی اعتبار سے انکا درجہ اول ہے اور ہم ان کو مترجمین اقبال کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتے۔

باب چہارم

پیامِ مشرق، ضربِ کلیم

ا پیامِ مشرق (پشتو ترجمہ ۱۹۶۳ء)

از شیر محمد مینوش

مترجم کا تعارف

پیامِ مشرق پر ایک نظر

تراجم کی نوعیت

ترجمے کی تفصیل

ترجمے کا معیار

ب ضربِ کلیم (پشتو ترجمہ ۱۹۵۸ء)

از شیر محمد مینوش

ترجمے کی نوعیت

ترجمے کی تفصیل

مثالی تراجم

١

کتاب :۔ پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء)

مترجم :۔ شیر محمد مینوش

ناشر :۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سنِ اشاعت :۔ نومبر ۱۹۶۳ء

صفحات :۔ ۲۶۴

باب چہارم

مترجم کا تعارف :۔

شیر محمد مینوش ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء میں ظہور اللہ مند نٹر کے گھر پیدا ہوئے (۱) مذہبی تعلیم مولانا عبد الجلیل سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایس،وی کی سند حاصل کی۔ طالبعلمی کے زمانے سے شعر و شاعری کرنے لگے تھے۔ بسمل کے نام سے مردان کے مجلّہ "افغان" میں نظمیں شائع کرتے رہے۔ پشاور کے "افغان" مجلّہ میں بھی بہت سا کلام چھپا ہوا ہے۔ ان کا افسانہ "بہرام پکڑو" ایک ادبی انجمن" ادبی ٹولی" پشاور نے شائع کیا۔

آپ محکمہ تعلیم میں مدرس تھے اور پنشن یافتہ۔ اردو کے گہرے مطالعے کے باوجود بھی ان کے کلام پر اردو کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ شاعری میں شاعرانہ تلازمات کم ملتے ہیں۔ غزلیات میں روایتی رجحان کے باوجود شعر کہنے کی کافی استعداد موجود ہے۔ آپ نے ۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں وفات پائی

مینوش ان شعراء میں سے تھے جنہوں نے آزادی سے پہلے اور بعد میں پشتو زبان کے شعر و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے علامہ اقبال کے "پیام مشرق" کا ترجمہ دلکش انداز میں انجام دیا ہے۔ مینوش اور اقبال کے نام ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم ہو گئے ہیں اور ان کا ذکر اقبال کے ساتھ ہمیشہ کیا جائے گا پھر بھی پشتو زبان کے اس مشہور شاعر و خادم کی یاد پشتونوں اور اس زبان کے لیے ایک ضروری امر ہے۔

پیامِ مشرق کا تعارف :۔

پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے فارسی کلام کا یہ تیسرا مجموعہ ہے۔ جو مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے "پیغام مغرب" کے جواب میں منظوم و مرتب کیا گیا اور جس نے مغرب میں پہنچ کر وہاں کی علمی فضاء میں ہل چل پیدا کر دی۔

(۱) موضع ترلاندی ضلع صوابی

انہی دنوں ڈاکٹر صاحب کے عزیز و محترم دوست نواب سر ذوالفقار علی خان نے ایک انگریزی کتاب (Voice from the East or Poetry of Iqbal) شائع کر کے بڑی تعداد میں انگلستان بھجوائی اور اس طرح یورپ میں ڈاکٹر صاحب کے افکار و نظریات کے تعارف، شہرت اور اشاعت کے نئے مواقع ملے۔

پیامِ مشرق مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ یقیناً یہ ڈاکٹر اقبال کے دماغ و قلم کا شاہکار (ماسٹر پیس) ہے اور شاید اقبال بھی اس سے بہتر کبھی نہ کہہ سکیں گے۔(۱) یہ کتاب جاوید نامہ کے بعد اقبال کی مشکل ترین کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے وہ حقائق و معارف بیان کیے ہیں جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔

یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ (لالۂ طور) رباعیات ہیں۔ فلسفہ کے مشکل مسائل اور خاص طور پر وحدت الوجود کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ دوسرے حصہ (افکار) میں اقبال نے خدا، انسان اور کائنات سے متعلق علمی نکات شاعرانہ انداز میں پیش کئے ہیں۔ تیسرا حصہ (مئے باقی) میں غزلیات بڑی دلکش ہیں۔ زبان و بیان حافظ اور نظیری کا رنگ لیے ہوئے عالی مضامین میں مخصوص فلسفۂ حیات کی تبلیغ کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ (نقشِ فرنگ) حکمائے مغرب پر تنقید ہے جو کتاب کا سب سے زیادہ مشکل حصہ ہے۔ پانچواں حصہ (خردہ) چند قطعات اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے اس میں حکیمانہ نکات ظریفانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ کتاب کا آسان ترین حصہ ہے۔

علامہ اقبال نے صرف دو کتابوں ، اسرار خودی اور پیام مشرق پر خود دیباچہ لکھ کر ناظرین کو متعارف کرایا، پیام مشرق کا محرک گوئٹے کا دیوان ہے اور اس کا مقصد اُن اخلاقی، ملی اور مذہبی حقائق کو پیش کرنا ہے، جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ گوئٹے خواجہ حافظ، شیخ عطار اور شیخ سعدی سے بڑے متاثر ہوئے خاص طور پر جب ۱۸۱۲ء میں دیوان حافظ کا جرمن زبان میں ترجمہ شائع ہوا تو ادبیاتِ جرمن میں "مشرقی تہذیب" کا آغاز ہوا۔ گویا دیوان مغرب کا محرک دیوانِ حافظ ہے اس لیے اس دیوان میں حافظ کا رنگ جھلکتا ہے۔

"پیام مشرق" کا دیباچہ بہت پر مغز اور بصیرت افروز ہے اسلیے اس کو بہت غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ علامہ نے مغربی تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی بنیاد مادیت اور الحاد پر رکھی گئی ہے چنانچہ انھوں نے مشرق اور مغرب دونوں کو عشق کا پیغام دیا ہے جس کے بغیر باطنی تربیت ناممکن ہے۔ باطنی انقلات کے بغیر ظاہری انقلاب وقوع پزیر نہیں ہو سکتا۔ باطنی انقلاب بندوں سے متعلق ہے اور مقدم ہے۔ ظاہری انقلاب، خدا سے متعلق ہے اور مؤخر ہے (۲) اس حقیقت کی روشنی میں قرآن حکیم کی رو سے اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور انہی لوگوں پر رحم کرتا ہے جو اپنے آپ کو اسکا مستحق بنالیتے ہیں۔

پیام مشرق ظاہری صورت میں دیوانِ مغرب سے بہت مشابہ ہے کیونکہ دونوں میں چھوٹی چھوٹی نظمیں علیحدہ علیحدہ سرخیوں کے تحت مختلف حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں اور یہ مشابہت اس کے مقصد میں بھی ہے لیکن ان دونوں کی نوعیت مضامین میں کوئی تعلق نہیں۔ نظم جلال اور گوئٹے میں اقبال یہ تصور کرتے ہیں کہ فردوسِ بریں میں جلال الدین رومی اور گوئٹے کی ملاقات

---

(۱) اختر راہی، مرتب، اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں "پیام مشرق" × مِ لاہور، طبع اول، مارچ ۷۸، ص ۶۵

(۲) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح پیام مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، طبع دوم ۱۹۳۱ء، ص ۱۱، ۱۲

ہوتی ہے۔ مولانا گوئٹے کی زبان سے فاوسٹ(ا) کو سن کر یہ کہتے ہیں۔

گفت رومی اے سخن را جاں نگار

تو ملک صید استی و یزداں شکار

ترجمہ :۔ اے دشعر روحه ! وئیل و رته رومیؒ

چه یزدان او ملائک دِ دام کښې دی(۱)

اور پھر آخر میں فرماتے ہیں۔

"داند آں کو نیک بخت و محرم است

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است" (رومیؒ)

ترجمہ :۔ دے واقف ترے خوش قسمته او محرم

زیر کی ده ابلیسی ، عشق دے آدم

پیام مشرق کے ایک بڑے حصے کا سمجھنا مشکل ہے اور ترجمہ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل، اقبال اپنے ناظر کو خیال کی جس بلندی پر لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ وسیع مطالعے اور گہرے غور و فکر کا حامل ہو۔ جو ایسے سحر سے مسحور ہونے کا عادی ہو جو ایک دام سے دوسرے دام میں پھنستے رہنے کا متلاشی ہو۔ علامہ نے انسانی جذبات کے سارے عالم کی خاک چھانی ہے جس میں اعلیٰ ترین وجدانی کیفیات اور تاریک ترین شکوک بھی شامل ہیں۔ اقبال کی یہ اعلیٰ اور پر زور شاعری اس قابل ہے کہ اس سے واقفیت پیدا کی جائے اگرچہ سمجھنے اور لطف اندوز ہونے میں مشکلات کا سامنا ہے لیکن مشکلات جھیلنے کے بعد صلہ کافی مل جاتا ہے۔(۲)

اقبال کے نزدیک خود شعوری اور انفرادیت ہی سب کچھ ہے۔ زندگی کا مغز عمل ہے۔ زندگی کی تکمیل روحانی اور اخلاقی قوت میں ہے جو اطاعت اور تسلیم سے ترقی پاتی ہے۔ مادہ پر فتح پانے سے ہم آزاد ہو جاتے ہیں۔ رباعی ۴۶ ملاحظہ ہو :۔

---

(۱) شیر محمد مینوش، مترجم، پیام مشرق، اقبال اکیڈمی کراچی، نومبر ۱۹۶۳ء، ص ۲۴۶

(۲) ڈاکٹر تحسین فراقی، مرتب، نقد اقبال حیات اقبال میں، " تبصرہ پیام مشرق " مترجم محمد حبیب اللہ رشدی از اے آر نکلسن، ص ۴۲۴

(ا) فوسٹ مشہور و معروف ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں گوئٹے نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آسکتا۔

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور	په خواست چه دجلوے لاړلے طور لره کوم دم
کہ جانِ توز خود نا محرمے ہست	نو پوهه شوم د ځان د حقيقت نه ئے محرم
قدم در جستجوئے آدمے زن	دپاره د آدم دلټولو قدم واخله
خدا ہم در تلاش آدمے ہست	الله دے ګورے هم په جستجو کښ د آدم(۱)

اقبال سیاسیات میں کسی آسان راستہ کے قائل نہیں۔ مجلس اقوام کے متعلق ان کی نظم ان کی اس خصوصیت کو ظاہر کرتے ہیں لیکن فلاسفہ کو بھی اقبال سخت مات دیتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر ہیگل قابل ذکر ہے جس کی فلک پرواز عقل کو :

ماکیاں کز زور مستی

خایہ گیرد بے خروش

کہا گیا ہے۔ اقبال نیٹشے کے خیال، خواہش قوت، کو گرمجوشی سے قبول کرتے ہیں اور دیوانہ بکار گہ شیشہ گر کو، دہریہ ہونے کی وجہ سے نا قبول کر دیتے ہیں۔

آنکہ بر طرحِ حرم بت خانہ ساخت

قلب او مومن دماغش کافر است

په شکل د حرم باندے بنائے بتکده کړه

که زړه ئے د مومن دے نو دماغ ئے د کافر

اقبال کو زیادہ ہمدردی برگساں سے ہے۔ اقبال نے اس کی تعلیم کو اشعار میں پیش کیا ہے۔ آئن سٹائن کے متعلق لکھا ہے کہ روشنی کا مظہر جس نے موسیٰ اور ہارون کی نسل سے زردشتی مذہب کو زندہ کیا یا لینن، قیصر ولیم سے اشتراکیت کی فتح کا ذکر کرتا ہے، جس کا جواب قیصر ولیم یہ دیتا ہے کہ لوگوں نے ایک مالک کی جگہ دوسرا مالک بدل لیا۔

نماند ناز شیریں بے خریدار

اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

نه پاتے به شی ناز د شیرینئی هم بے تپوسه

که ورک هدوپرويز شه مګر شته دے چه کو هکن

منظومات "محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مرد مزدور"، "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" اور "نوائے مزدور" سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مزدور طبقہ کے طرفدار ہیں۔ نوائے مزدور سے نمونہ ملاحظہ ہو۔

---

(۱) ترجمہ پیام مشرق، ص ۴۶

زمزدِ بندہ کرپاس پوش و محنت کش
نصیب خواجہ ناکردہ کار رختِ حریر

په خون د مزدورانو ساده پوشو خواری کبنو
لباس، نادان مالک ئے دے اغوستے د حریر

زخوئے فشانی من لعل خاتم والی
زاشکِ کردکِ من گوہر ستام امیر

د والی دَ لاس غمے گنرہ زما د خولو څاڅکے
او اوښکے ہے لعلونه دی د ملونے د امیر

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا گے
زخویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا گے

طواف به ددے شمعے څو پتنگ هسے کوو
دځان نه ناخبره به ترکوسے پورے یوُ

پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے خلاف ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور پاک و ہند چونکہ شاہ ترک کو خدمت حرم کی وجہ سے خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ اسلیے انھوں نے ترکی کے ساتھ دیا۔ جنگ میں ناکامی کے بعد اتحادی چاہتے تھے کہ امت مسلمہ سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لیا جائے، لیکن اس کے باوجود بھی مغرب جانتا تھا کہ مادی ترقی کے غلبہ پر مشرق کو دیر تک مغلوب نہیں رکھا جاسکتا۔

مغرب کا روحانیت سے عاری ہونے کا احساس سب سے پہلے جرمنی کے مفکر گوئٹے کو نصیب ہوا اور انھوں نے مشرق کے روحانی سرمایے سے استفادہ کرنے کے لیے مسلم صوفیا و شعرا کا گہرا مطالعہ کیا اور خاص طور پر خواجہ حافظ شیرازی سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے پیام مشرق سے سو سال پہلے دیوان مغرب میں جس عقیدت سے خواجہ حافظ اور سعدی شیرازی کے جو تاثرات بیان کئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے مشرق سے روشنی کا تقاضا کیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی کی روح گوئٹے میں حلول کر گئی ہے۔ جنھوں نے جرمنی زبان میں زبردست صوفیانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ اقبال نے سو سال بعد پیام مشرق کی صورت میں جواب دیا ہے۔ جس کا انتساب اعلیحضرت امیر امان اللہ خان کے نام کیا گیا ہے۔

مشرق کے اندرونی جذبات و احساسات کا ایک قومی نمائندہ امان اللہ خان شاہِ افغانستان تھے۔ اس لیے علامہ نے بڑے دردناک الفاظ میں مخاطب کر کے فرمایا۔

"اے نوجوان! اٹھو، اور مشرق کی مردہ مٹی میں یہ روح زندہ کر۔ اور مغرب کو پھر صدیقؓ، فاروقؓ، علیؓ خالدؓ اور سلمانؓ کی مثال اپنے عمل سے پیش کر۔ اس مردہ مٹی میں علم و اخلاق کا وہ جذبہ پھر زندہ کر، جس کی برکت سے مسلمان نے مشعل اسلام کی ضیاء ساری دنیا میں پھیلادی۔ علم و عمل اور تلقین کا ایک نمونہ اور مغرب کو اسلام اور حضرت محمد ﷺ کے پیغام اقدس کا

نتیجہ دکھا۔"

علامہ نے امیر افغانستان کو یہ تلقین کی ہے کہ عدلِ فاروقی اور فقر حیدری ایک حاکم کو اعلیٰ مقام پر فائز کراتا ہے۔

سروری در دین ما خدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقر حیدری است

زمونږ دین کښې خادمي ده سرداري
فاروقي، عدل دے، فقر حیدري(۱)

اور پھر انہیں امارت میں فقر کا مفہوم ذہن نشین کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر میں ان سے فرماتے ہیں کہ وہ اسلام اور بانئ اسلام حضرت محمدؐ کے ساتھ عشقِ حقیقی پیدا کریں پھر دیکھیں کہ سارے عالم کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کس طرح منور کرتے ہیں۔

روح راجز عشق او آرام نیست
عشق او روزیست کو را شام نیست
خیز واندر گردشِ آور جام عشق
در قہستان تازہ کن پیغام عشق

ترجمہ:۔

دنیٔ مینه دے روح لره آرام
ددے مینې ورځ له نشته دے ماښام
پاسه دورکړه تازه د عشق د جام
کړه تازه غرکښې د عشق هغه پیغام (۲)

پیام مشرق کا پشتو ترجمہ ترلاندی (صوابی) کے معروف پشتون شاعر شیر محمد مینوش نے کیا ہے۔ مینوش مرحوم اور راحت زاخیلی کلام اقبال کے اولین مترجمین میں شمار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے بڑی محنت اور خلوص سے ترجے کا یہ کٹھن کام انجام دیا تھا۔ حافظ محمد ادریس، شعبہ عربی، پشاور یونیورسٹی نے تصحیح و نظر ثانی کے فرائض انجام دیے۔ خوب سے خوب تر کی کوئی حد نہیں اور پھر ترجے میں شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا ہر لحاظ سے مشکل ہے۔ ہر مترجم کییہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا کام مہاکاج اور ترجمہ درست اور دلچسپ ہو۔ مترجم مقید ہوتا ہے اور آزاد بھی۔ ان دونوں کے مابین ایک ہی منزل کا تعین کرنا ایک دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ مترجم اصل کلام پر بھی سمجھ بوجھ کی کافی گرفت رکھتا ہے اور اپنی زبان کے الفاظ و اصطلاحات اور مدوجزر پر بھی حاوی ہوتا ہے۔

(۱) مینوش، پیام مشرق، ص ۷

(۲) ایضاً، ص ۸

ایسے حالات میں اگر مترجم کے الفاظ کی ساخت کسی کو ایک رنگ ڈھنگ میں دکھائی دے اور دوسرے کو دوسرے رنگ میں، یا ایک لفظ یا اصطلاح کو مختلف افراد مختلف طرز پر استعمال کرتے ہوں تو اس اختلاف کو ترجمے کے ضمن میں تسلیم کرنا پڑیگا۔ مینوش صاحب نے ایک طرز پر ترجمہ کیا، حافظ صاحب نے تصحیح کر کے اس طرز کو بدل دیا، لیکن پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی ترجمہ آخری ہے، اس میں مزید تصحیح کی گنجائش نہیں۔ یہ ترجمہ پشتو اکیڈیمی اور اقبال اکیڈیمی کی مشترکہ کاوشوں میں (کلام اقبال کے منظوم تراجم) ، زبورِ عجم اور بانگ درا، کے بعد تیسری کوشش ہے۔

مینوشؔ اور اقبال کے نام آپس میں ایسے ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ اقبال کے ذکر کے ساتھ اس کا ذکر ہمیشہ کیا جائے گا۔ پشتو زبان وادب کی خدمات کے سلسلے میں اور مترجم اقبال دونوں لحاظ سے وہ پشتون کے دلوں میں زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔ مولانا عبدالقادر ان کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

"دمینوشؔ صیب ذکر به هم دغه رنګ د اقبال د ذکر سره تل ژوندے وی خو بیا هم دپښتو ژبے ددے نوموری خادم یا دګیر نه دپښتون قام او پښتو ژبے دپاره یو لازمی امر دے۔ "(۱)

ترجمہ ایک پیچیدہ، مشکل اور جان کنی کا کام ہے۔ اس لحاظ سے مینوشؔ کے ترجمے کا عمومی رنگ شعر کی بے ساختگی اور روانی کے لطیف اثر سے خالی نظر آتا ہے۔ پشتو شعر وادب کے نقاد محمد اعظم اعظم لکھتے ہیں :۔

"ددے ترجمے عموی رنګ د شعر د بے ساختګئ او روانئ د لطیف اثر نه خالی دے۔" (۲)

۔۔۔ترجمے کا تفصیلی جائزہ۔۔۔

نظمِ پیش کش :۔

عزم تو پائندہ چوں کہسارِ تو
حزم تو آساں کند دشوارِ تو

اراده دِ پائنده لکه د غر
هره ګرانه کړے په پوهه باندے سرَ(۳)

مترجم شاعر نے حزم کو استقلال کے بجائے دانائی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

تا شناسائے خودم، خود بیں نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم

میں خود بین (مغرور) نہیں، ہاں اپنے آپ کو پہچانتا ضرور ہوں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ کون تھا اور میں کیا ہوں۔

---

(۱) پیام مشرق (پشتو)، تعارف از مولانا عبدالقادر، ص ۹

(۲) محمد اعظم اعظم، "پشتو میں اقبال دوم" ماہنامہ پشتو، مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء ص ۳۸۵

(۳) مینوش، پیام مشرق، ص ۱

چه د څان نه خبر یم، نه یم خود بین

او کوه د حقیقت موته تعئین (۱)

دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ اب تم ہماری حقیقت کا تعین کرتے رہو۔ اس لیے مذکورہ مصرعے میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

مصریاں افتادہ در گردابِ نیل

سُست رگ تورانیاںِ ژندہ پیل!

(مصریان نیل کے بھنور میں ڈوب گئے۔ افلاس زدہ تورانی بھی کمزور پڑ چکے ہیں)

په غولئے کبنں دنیل پر یواته، مصریان

شو بیکاره د توران زلمی نران !(۲)

دوسرے مصرعے کا مطلب ہے کہ توران کے بہادر جوان نکتے ہو گئے۔ ترجمہ آزاد ہے۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست

جز بعلم انفس و آفاق نیست

زندگی کوشش دے نه دے د چاحق

بے د علم نه موندے نشی مطلق(۳)

دوسرے مصرعے کے ترجمے میں انفس اور آفاق کے ذکر کو یکسر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے ترجمہ ادھورا اور نامکمل ہے۔

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب

ذرۂ عشق نبیؐ از حق طلب

سوز پیدا کړه د صدیقؓ او دَ علیؓ

دالله نه غواړه مینه د نبیؐ (۴)

پہلے مصرعے میں "سوز طلب کر" کی جگہ "سوز پیدا کر" لایا گیا ہے اسلیئے ترجمہ اگر اس طرح ہو جائے تو مناسب ہو گا۔

سوز طلب کړه د صدیقؓ او د علیؓ

نظم لالۂ طور رباعی ۳ ملاحظہ ہو:۔

بباغاں بادِ فروردیں دہد عشق

براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق

شعاعِ مہر او قلزم شگاف است

بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

(۱) پیام مشرق پشتو ترجمہ، ص ۲ (۲) ایضاً ص ۴

(۳) ایضاً ص ۴ (۴) ایضاً ص ۸

ترجمہ :۔

که عشق بخښنی باغونو ته هوا د فرور دین
عطا کړی ځنګلونو ته غوټۍ لکه پروین
پلوشے د نمرد مینے چه درون په سمندر شی
په تل کښې ئے مهی وته نظر بخښنی ره بین(۱)

ترجمے میں فروردین، پروین اور رہ بین قوانی، پشتو میں عام فہم سے بالاتر ہیں جو کہ پشتو زبان و ادب کی تنگ دامنی پر بھی دال ہیں جبکہ پشتو کا دامن اتنا تنگ نہیں ہے اس لیے ترمیم کی ضرورت ہے رباعی نمبر ۹ ملاحظہ ہو :۔

سحری گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری می رسد خارِ بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

باغباں نے صبح کے وقت بلبل سے کہا، اس مٹی میں سوائے غم کے پودے کے اور کچھ نہیں اُگتا۔ کانٹا بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے مگر پھول جوانی ہی میں مرجاتا ہے۔(۲)

بلبل نے باغباں سے کہا کہ دنیا کا کارخانہ بھی عجیب ہے یہاں کی زمین کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں صرف رنج و غم کا پودا سرسبز ہوتا ہے۔(۳)

چمن کښې عندلیب هسے سحر اووے مالی ته
په خاوره د دنیا به بس دغم بوټے کرے
نظر کوه ازغی وته چه بوح عمر ته رسی
اوګل شی په ځوانئی کښې نیمه خوا ذرے ذرے(۴)

صبح کے وقت بلبل نے مالی سے کہا کہ دنیا کی خاک پر بس غم کا پودا کاشت کر۔ دیکھ! کانٹا بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے مگر پھول جوانی ہی میں مرجاتا ہے۔ رباعی نمبر ۱۵ کا ترجمہ یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پانی اور مٹی سے یہ خوبصورت کائنات تخلیق کی۔ ایسا جہاں جو بہشت سے زیادہ خوبصورت ہے مگر ساقی (رسول پاکؐ) نے اپنی آتش (عشق) سے میری خاک سے ایک نیا جہاں پیدا کر دیا۔ جبکہ پشتو منظوم ترجمہ اور مطلب درج ذیل ہیں۔

د خاورو ځنے جوړ کړلو وجود ښکلے الله
دنیا هم ذارم دښار ئے ځنے زیبا
مګر دغه ساقی د عشق دمیو په انګار
لاجوړه مے دخاورو نه کړه بل رنګے دنیا(۵)

---

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۱۲ (۴) ایضاً ص ۱۵ (۵) ایضاً، ص ۱۸

(۲) میاں عبدالرشید، مترجم، کلیات، اقبال فارسی، ص ۳۹ (۳) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح پیام مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور طبع دوم ۱۹۶۱ء، ص ۲۶

اللہ تعالیٰ نے خاک سے خوبصورت وجود بنایا۔ دنیا بھی ارم شہر سے زیادہ حسین۔ مگر ساقی کے آتشِ عشق کی وجہ سے میں نے خاک سے خوبصورت دنیا بنائی۔ اس لیے آخری مصرے کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے

لاجوړه ئے د خاورے سے کړه بل رنگے دنیا

رباعی نمبر ۲۷:۔

بہل افسانۂ آں پا چراغے
حدیثِ سوزِ اوآوازِ گوش است
من آں پروانہ را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

مطلب :۔

چراغ کے نیچے گرے پڑے پروانے کی کہانی چھوڑ۔ اس کے جلنے کی بات کانوں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ میں تو اس پروانے کو پروانہ سمجھتا ہوں جو اتنا سخت کوش ہو کہ شعلے کو کھا جائے۔ اب پشتو ترجمہ اور مطلب ملاحظہ ہو۔

دهاغے وار خطا خبرے ماته مه کوه
د سوز دغه وینائے چه غوږ ونه خوږ وی
پتنگ وئیلے نه شم زهٔ هغے پتنگ ته چرے
چه نیغ په لمبه نه ورځی او څنگ ترے نه کوی(۱)

اس اوسان خطا ہونے والے کی بات مجھ سے نہ کر۔ اس کے سوز کی بات کانوں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ میں اس پروانے کو پروانہ نہیں کہہ سکتا جو شعلے پر جھپٹنے کی بجائے کنارہ کش ہو جائے۔ مترجم شاعر نے اگرچہ علامہ کی فکر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اس لیے ترجمہ آزاد اور دلکش ہے

رعائی نمبر ۴۵ ملاحظہ ہو:۔

خرد اندر سر ہر کس نہادند
تنم چوں دیگراں از خاک و خون است
ولے ایں راز کس جز من نداند
ضمیر خاک و خونم بے چگون است

هر چاله عقل سر کبښ ایښے شوے دے درون
د نورو هسے تن دِ زما هم د خاک وخون

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۲۴

خوبې زمانه هیڅوک په دے رازنۀ دے خبر
چه دے د خاک وخون دغه ضمیر ے بے چگون (۱)

درون، خاک وخون اور بے چگون جیسے الفاظ کا استعمال پشتو قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہے لیکن قافیہ پیمائی شاعر کی ازلی مجبوری ہوتی ہے اور قافیوں کی تلاش میں اسے اکثر مطلب کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ مترجم نے اصل کو پشتو کا جامہ زیب تن کیا ہے۔ لیکن شعریت کا دامن تنگ ہونے کی بناء پر فارسی الفاظ کے پشتو مترادفات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ خوشحال خان خٹک نے بھی اسی قسم کا شعر کہا ہے۔

کاردبیچون او دې بے چگون گوره — دمزکے مرگ بیائے ژوندون گوره
په سر دپاسه داشین سیحون گوره — په کښې دستور یودماهیو یون گوره

رباعی نمبر ۵۰

دِلت می لرزد از اندیشۂ مرگ
ز بیمش زرد مانند زریری
خود باز آ، خودی را پختہ ترگیر
اگر گیری، پس از مردن نمیری

د مرگ د ویرے ریږی دغه زړۀ دِ هرزمان
او زیړئے ددے ویرے نه په شان دکورکمان
د ځان نه خبر دار شه چه محکمه دِ خودی شی
نو بیا که هډو مړ شوے، ئے ژوندے به جاودان(۲)

اگرچہ مترجم نے ہرزمان اور جاودان کے الفاظ اضافی استعمال کئے ہیں لیکن پھر بھی ترجمہ فکری وفنی خوبیوں سے مالامال ہے، اس لیے ترجمہ دلکش ہے۔ بعض اوقات شاعر کو قافیے کی تلاش میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی جیسے نشے اور چنے ہم قافیہ نہیں ہیں ۔ ملاحظہ ہو رباعی نمبر ۵۱

زپیوند تن وجانم چہ پرسی
بدامِ چند وچوں درمی نیایم
دَم آشفتہ ام ز پیچ و تابم
چواز آغوشِ نے خیزم نوایم

کوے د تن او ورح سے د پیوند څه تپوسونه
چه ما په څومره، څنگه، کښې نیولے هډو نشے

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۳۳
(۲) ایضاً ص ۳۶

مثال مے دے د ساہ چہ ھر ساعت وی ناقلارہ

چہ او خم د شپیلئی نہ نوشی جورے رانہ چغے(۱)

اسی طرح رباعی نمبر ۵۵ ملاحظہ ہو:۔

زمن باشاعر رنگیں بیاں گوے

چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی

نہ خود را ای گدازی زآتشِ خویش

نہ شام درد مندے بر فروزی

مطلب :۔شاعر رنگین نواکو میری طرف سے کہو، اگر تو گل لالہ کی طرح جلا، تو کیا جلا، نہ تو نے اپنی آگ سے اپنے آپ کو گداز کیا، اور نہ کسی درد مند کی شام روشن کی۔

زما د لوریہ دا بنکلی شاعر وتہ اووایہ

دسوز نہ د لالہ ھسے ھیچ نشتہ دے فائدہ

دِ ځان پہ حرارت دِ نشی ځان ویلی کولے

او نہ پرے بلوے شی د غمژن د شپے دیوہ(۲)

مطلب :۔

میری طرف سے خوبصورت شاعر سے کہو کہ سوزِ لالہ سے ویسے کوئی فائدہ ہی نہیں۔ یہ اپنی حرارت سے اپنے آپ کو گھلا سکتا ہے نہ کسی غمزدہ کی رات کا دیا روشن کر سکتا ہے۔

شاعر نے لفظی ترجمہ سے انحراف کر کے اقبال کے فکر و فلسفہ کو قابو کرنے کی کوشش کی ہے علامہ کے خیال کو اپنے پیرائے میں بیان کر کے شاعر نے مترجم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن لفظی معانی سے احتراز کر کے قارئین اقبال کے فارسی کلام کو نظر انداز کر کے ترجے سے خاطر خواہ مستفید نہیں ہو سکتے۔ اگر شاعر اقبال کے الفاظ کو بھی مد نظر رکھ کر ترجمہ کرتے اور محنت شاقہ کا کمال دکھاتے تو پشتون قاری فارسی زبان و ادب کی خوبیوں اور نزاکتوں سے بھی خوب واقف ہوتے اور فلسفۂ اقبال سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی۔ رباعی نمبر ۵۸ دیکھیں۔

چو تاب از خود بگیر و قطرۂ آب

میانِ صد گہر یک دانہ گردد

بہ بزم ہمنو لیاں آنچناں زی

کہ گلشن بر تو خلوت خانہ گردد

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۳۶

(۲) ایضاً ص ۳۸

ترجمہ :۔

په نور د خودئ خپلے نورانی چه شه کوم ځا ځکے
سو و نو ملغرو کښِ شی دا یوه دانه
په داسے قسم اوسه په محفل کښِ دیارانو
چه باغ شی په تاباندے د خلوت هغه ستانه (۱)

مذکورہ ترجمہ میں شاعر کا تجربہ حاوی ہو جاتا ہے اور اصل کی شیرین زبان اور رنگین پیرایۂ بیان کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ رباعی نمبر ۶۶ ملاحظہ ہو :۔

مشو اے غنچۂ نو رُستہ دیگر
ازیں بستاں سر او دیگر چہ خواہی
لبِ جو، بزمِ گل، مرغِ چمن سیر
صبا ، شبنم ، نوائے صبحگاہی

نازکے غوټئی ! ګورے چه خفګان اونه کړے نور
لا نور درله څه درکړی وایه دا دَ چمن کور
لبنتی ، بنکلے ګلونه د مارغانو ، آوازونه
صبا سره شبنم د بلبلانو سحر شور(۲)

رباعی نمبر ۷۷ میں :۔

دلِ من در طلسمِ خود اسیر است
جہان از پرتو او تاب گیر است

میرا دل اپنے طلسم میں اسیر ہے (یعنی خودی)۔ میرا جہاں اس کے پرتو سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

مپرس از صبح و شامم ز آفتابے
کہ پیشِ روزگارِ من پر است

مجھ سے اس صبح و شام کی بات نہ کر، جو آفتاب سے پیدا ہوتی ہے

دځان په طلسماتو کښِ مے زړهٔ دے ګرفتار
زما د نور د فیضه په دنیا کښِ دی انوار
تپوس د ورځو شپو چه سے دنمر ځنے اونه کړے
زما د زمانے مخکښے تول ستوری دی تارتار

ترجمے کا مطلب (آفتاب سے میرے دن رات کے بارے میں نہ پوچھ۔ میرے زمانے کے سامنے سارے ستارے تار تار ہیں) بعض اوقات قافیہ پیمائی کے دھن میں کلام اقبال کو بے معنی سا بنا دیتا ہے۔ رباعی نمبر ۷۸

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۴۰
(۲) ایضاً ص ۴۴

نوادرساز جاں اززخمۂ تو
چساں در جانی واز جاں برونی
چراغم ،باتوسوزم ،بے تومیرم
توائے بچون من بے من چگونی

د فیضه د شهباز دے زما ساز کښې ژوندون
باهر زمانے خنګ هم سے زړګی کښې اندرون
دیوے هسے ژوندے په تا، له تانه بغیر مرمه
بیچونه بے زما نه وایه ته ئے په څه ګون

پچون اور گون نے آخری مصرع کو پیچیدہ اور مہمل سا بنادیا ہے۔اس لیے ترمیم کی ضرورت ہے۔

رباعی نمبر ۹۶ :۔

دلِ بیباک راضرغام، رنگ است
دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحر است
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

که زړهٔ دِ شه بے خوفه نو زمرے دے ګورے رنګ
که دے شه یریدونکے ، نو هوسئی به شی پلنګ
که خوف د چرے نه وو نو بیدیا دے لکه بحر
که یره د پیدا شوه، دے هر سرج کښې ئے نهنګ(۱)

مترجم شاعر یہاں پر بھی شعریت کا دامن تنگ ہونے کی وجہ سے قافیہ پیمائی اور شعر کی ازلی مجبوری کی سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ شاعر نے رنگ، پلنگ اور نہنگ فارسی الفاظ استعمال کر کے پشتو الفاظ (ګډه ، پړانګ ، مګرمچھ) کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔رباعی کے تین مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوتے ہیں لیکن یہاں رباعیات کے پشتو تراجم میں اکثر رباعیات میں دو دو مصرعے ہم قافیہ ہیں گویا غزل کے ابیات ہیں۔ذیل میں رباعی نمبر ۱۱۴ ملاحظہ ہو :۔

مزاجِ لالہ خودروشناسم
بشاخ اندر گلاں راہو شناسم
ازاں دارد مرا مرغِ چمن دوست
مقامِ نغمہ ہائے او شناسم

پیژندلے مے مزاج دے د لالا غوندے خود رویه
په څانګه کښې دننه پیژنمه بوټې د ګلو(۲)

---

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۵۹ (۲) ایضاً ص ۶۶

په دے وجه مارغان د چمن واړه زما خپل دی

د راز نه د نغمو يمه واقف زهٔ د بلبلو

پہلے مصرع کا ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا :۔

فهم لرم د خود رولاله مزاج د پيژندلو

رباعی :

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت

خراجِ شہر و گنجِ کان و یم رفت

امم را از شہاں پائندہ تر داں

نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت ؟

ترجمہ :۔

فنا شو سکندر او هم ئے توره او علم

او لاړهٔ دولتونه ورسره تمامی سم

هميش د بادشاهانو نه پائيداری وی اُمتونه

نهٔ وينے چه ايران هاغسے شته دے نشته جم(۱)

دوسرے مصرعے (اصل) کا مطلب : شہروں سے وصول کیا ہوا خراج، کان سے نکالا ہوا خزانہ اور سمندر سے حاصل کئے ہوئے موتی سب گئے۔

دوسرے مصرعے (ترجمے) کا مطلب :۔ اور اس (سکندر) کے مرنے سے ساری دولت بھی فنا ہوگئی۔ مترجم نے ساری دولت کا سہارا لیکر خراج، گنج اور موتی کا ذکر ہی چھوڑ دیا ہے۔ ترجمہ کچھ اس طرح صحیح ہوگا:

سکندر لاړ هم ئے توره هم علم لاړ

هم ئے گنج هم ئے خراج هم جاه حشم لاړ

امتونه دوامی وی له شاهانو

لږ خو ځير شه ايران پاتے شه او جم لاړ

ز پیشِ من جہانِ رنگ و بو رفت

زمین و آسمان و چار سو رفت

تو رفتی اے دل از ہنگامۂ او؟

یا از خلوت آبادِ تو او رفت ؟

مطلب :۔ میرے سامنے یہ جہانِ رنگ و بو باقی نہیں۔ نہ زمین ہے، نہ آسمان، نہ چار سو، اے دل! تو اس جہان کے ہنگامے سے کنارہ کش ہو گیا ہے۔ یا جہان (خود) تیرے خلوت آباد سے نکل گیا ہے۔

---

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۷۸

جهاں د رنگ اوبوئی زماد مخے نه فنا شو

او هم زمکه آسمان او ځلور واړه طرفونه

چه لاسے ږے اے زړۀ تۀ د هغۀ دهنګامے نه

که اوغوښتۀ اشنا دِ د خلوت نه رخصتونه (۱)

چوتھے مصرعے میں اشنا کی جگہ جہان چاہیے پھر ترجمہ غیر مشکوک ہو جائیگا۔

رباعی نمبر ۱۳۸:۔ مرا از پردۂ ساز آگہی نیست

ولے دانم نوائے زندگی چیست

میں پردہ ساز (اسرار کائنات) سے تو آگاہ نہیں ہوں، مگر یہ جانتا ہوں کہ نغمۂ حیات کیا ہے۔

لرم نه د بردے خنے د ساز څه آګاهي

خو پوه په دے یم چه د ژوندون آواز څه وی(۲)

پہلے مصرعے کا ترجمہ لفظی ہے جبکہ پردۂ ساز کائنات کے لیے ہے۔اس لیے ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

ع لرم نه د اسرار خنے جهان څه آګاهي

رباعی نمبر ۱۴۱ میں مترجم شاعر نے عجم بمعنی ایران استعمال کیا ہے، حالانکہ ایران سے عجم کی ترجمانی ناممکن اور ناکافی ہے نمونہ ملاحظہ فرمائیں:۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است

صدائے من درائے کارواں است

حدی را تیز تر خوانم چو عرفیؔ

کہ رہ خوابیدہ و محمل گراں است

مطلب :۔ میرے نغمے سے عجم کے دل میں آگ بھڑک اٹھی ہے، میری آواز درائے کارواں بن گئی ہے میں عرفیؔ کی مانند حدی کی لے کو اور تیز کر رہا ہوں کیونکہ راستہ لمبا ہے اور محمل گراں۔

زما په نغمو ګرمه شوله زمکه د ایران

آواز مے روغ جرس دے په بوتلوکښې دکاروان

په شانے د عرفیؔ وایه نغمے دحدی ګرمے

چه لاره ده ناشنا، سترې بارونو کړۀ اوښان(۳)

تیسرے مصرعے میں "وایه" کی جگہ "وایم" چاہیے چوتھا مصرع شستہ بیانی کی بہترین مثال ہے۔ ترجمہ اگر اس طرح ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا:۔

عجم زما نغمو کړو په مثال آتش سوزان

جوړ غږ زما که ګورے دے جرس دکاروان

---

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۷۹ (۲) ایضاً، ص ۸۰

(۳) ایضاً، ص ۸۱

عرفی ته زمزمه د حدی بنه په جوش کښې وایه
په دے چه لاره سخته ده محمل هم دے گران(۱)

رباعی نمبر ۱۵۶:۔

مشو نومید ازیں مشتِ غبارے
پریشاں جلوہ ناپائدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را
تمامش می کند در روزگارے

اس مشت غبار (انسان) سے ناامید نہ ہو۔ کہ اس کا جلوہ ناپائیدار پریشان ہے کیونکہ فطرت جب کوئی پیکر تراشتی ہے تو اسے قرن ہا قرن میں مکمل کرتی ہے

د خپلے موتے خاورے څنے مشه نا امید
جلوه چه ده تس نس ئے اوهم نه ده پائیدار
چه هر کله کا لبوت نوے فطرت دلته کښې جوړ کړی
کمال ته رسوی په یو هنر سره خپل کار(۲)

چوتھے مصرعے میں وقت کے تعین کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ اپنے کام کو ایک ہنر مندی کے ساتھ کمال تک پہنچاتی ہے) ترجمے اور اصل میں کافی فرق ہے۔ رباعی نمبر ۱۵۵ زیر غور کریں۔

جہانِ رنگ و بو فہمیدنی ہست
دریں وادی بسے گل چیدنی ہست
ولے چشم از درونِ خود نہ بندی
کہ در جانِ تو چیزے دیدنی ہست

بے شک یہ جہانِ رنگ و بو اس قابل ہے کہ اسے سمجھا جائے، اس وادی میں بہت سے ایسے پھول ہیں جو اس قابل ہیں کہ انہیں چن لیا جائے۔ لیکن تجھے اپنے اندرون سے آنکھ بند نہیں کرنی چاہیے، تیرے اندر (اور بھی) قابلِ دید چیز موجود ہے۔(i)

جهان دے دامکان گورے یوشے د پوهیدلو
په دے مقام کښې ډیر گلونه شته د تولو لو
د ځان د حقیقت نه چه ځان نه کړے ناخبره
د اروح ډ هسے شے دے چه هم دادے د لیدلو(۳)

مترجم شاعر نے جان کی بجائے روح (چوتھے مصرع میں) استعمال کیا ہے، جو شاعر کی اپنی اختراع ہے "حصہ افکار" میں "گل نخستیں" کا شعر:

---

(۱) ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک (۲) پیام مشرق (پشتو)، ص ۸۸ (۳) ایضاً

(i) یوسف سلیم چشتی نے بجائے "دل" کہا کہ وہ قابل دید چیز دل" ہے حوالہ شرح پیام مشرق، ص ۲۳۷

شعر :۔ دِلم بدوش ونگاہم بہ عبرتِ امروز
شہید جلوۂ فردا و تازہ آئینم

میرا دل (اسلام کے) ماضی میں اٹکا ہوا ہے اور میری نگاہ دورِ حاضر کے عبرت آموز حالات دیکھ رہی ہے۔ آنے والے دورِ اسلام پر مرتا ہوں اور نیا آئین (تصورات) پیش کرتا ہوں۔

دپرون سره سے زړۂ دے سترګے نن ته
د فردا مینے سے نوے کۀ کردار

میرا دل کل میں اٹکا ہوا ہے اور آنکھیں آج کو دیکھ رہی ہیں۔ کل (مستقبل) کی محبت نے میرے کردار کو نیا اور تروتازہ بنادیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل اور ترجمے میں کافی فرق ہے اور خاص طور پر دوسرا مصرع شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش ہے اسلیے خانہ پُری کی بجائے اصل کو ترجمے میں پیش کرنا ضروری ہے۔

"تسخیر فطرت" نظم میں "انکارِ ابلیس" کا تیسرا شعر :۔

رابطۂ سالمات ، ضابطۂ اُمہات
سوزم وسازے دہم، آتشِ مینا گرم

اینٹوں کی باہمی پیوستگی ، قوموں کے قوانین، ان سب کو میں سوز و ساز دیتا ہوں۔ میں وہ آگ ہوں جو شراب کی صراحی بناتی ہے۔

که نظام د عناصرو دے که ربط د ذرو دے
ورانولے جوړولے شمه ئے، یمه اور دشیشه ګر(۱)

عناصر کا نظام ہے یا ذرات کا ربط ہے، میں اس کو توڑ سکتا اور بنا سکتا ہوں اور میں شیشہ ساز کی آگ ہوں۔ مترجم نے اقبال کے الفاظ کو قابلِ اعتنا نہ سمجھ کر مفہوم کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور اس میں بھی ناکام ہوئے۔ "صبحِ قیامت" کا آخری شعر دیکھیں :۔

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

میری عقل (ابلیس کی) فطرت چالاک کو دام میں لے آئی، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شعلہ زاد ابلیس نے (بالآخر) خاکی (آدم) کو سجدہ کیا۔

د عقل په دام نبنلی چه فطرت د چاچالاک وی
او د اور پیدا ابلیس پاتے د خارو شی غلام (۲)

جس کی فطرت چالاک ہو۔ وہ عقل کے دام میں پھنس جاتا ہے اور شعلہ زاد ابلیس خاک کا غلام رہ جاتا ہے خاک کے غلام سے وہ مطلب اخذ نہیں ہو سکتا۔ جو خاکی کو سجدہ کرنے سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ نظم "فصلِ بہار" کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

(۱) پیامِ مشرق (پشتو)، ص ۹۸
(۲) ایضاً ص ۱۰۱

ع خیز کہ درکوہ و دشت ، خیمہ زد ابربہار

خه پاسه شهٔ دیره ،غرونو د شتونو کښې بهار

ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا :۔

پاڅه د سپرلی وریځ په غره دشت خیمه زن شوه

مستِ ترنم ہزار بلبل کوی چغار

طوطی و دراج و سار (i) مرغئی قطار قطار

بر طرف جویبار په غاړه د جوئبار

کشتِ گل و لالہ زار هر خائے دے لاله زار

چشم تماشا بیار پکارئے دے دیدار (۱)

ترجمے میں "ابر" کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بلبل نغمہ خواں ہے، پرندے قطار در قطار ہیں جوئے بار کے کنارے۔ ہر جگہ لالہ زار ہے جس کا دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بادِ بہار اوزید (بادِ بہاری چلی)

عجب ښکلے باغونه (عجیب خوبصورت باغ ہیں)

ترجمہ غلط ہے۔ شاعر نے مفہوم کو مد نظر رکھ کر الفاظ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اوپر کے ترجمے میں طوطی، دراج اور تلیر کو چھوڑ کر صرف پرندے کہہ کر کام چلایا ہے۔ دیدۂ معنی کشا، اے زعیاں بے خبر

تو جو (حسن) عیاں سے بے خبر ہے۔ حقیقت بین آنکھ کھول

شه پوئے په حقیقت اے د ظاهره بے خبر !

(اے عیاں سے بے خبر، حقیقت سمجھ لو)

اسی طرح :۔ در شفق انجم نگر شفق ته کړه نظر

"انجم" کے ترجمے کو شعر کی مجبوری پر قربان کر کے نظر انداز کر دیا ہے۔ نظم "نسیم صبح "

تہ نشیمن او سیم یاسمن ریزم

میں اس کے نشیمن کے نیچے چنبیلی کی چادر بچھاتی ہوں

گلونه ورله سپین د جالے لاندے زیږوم

سفید پھول کہہ کر چنبیلی مراد لینا مشکل کنایہ ہے جو عام مستعمل نہیں ہے۔ نظم "لالہ" ملاحظہ ہو :۔

افزوں ترم زمہر و بہر ذرہ تن زنم

گردوں شرارِ خویش زتاب من آفرید

اگرچہ میں آفتاب سے بڑھ کر ہوں لیکن ہر ذرے کو برداشت کرتا ہوں۔ آسمان نے اپنے شرر (چاند ستارے) میری روشنی سے پیدا کئے ہیں۔

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۱۰۷ (i) دراج کے لیے پشتو لفظ "تنزرے" ہے

دنمر نه یمه لوئے ، هرے ذرے کښې زما نور دے

سوندلې دی اسمان زما د اور نه گرمیدهٔ(۱)

مطلب :۔ میں آسمان سے بڑھ کر ہوں، ہر ذرے میں میرا نور ہے۔ آسمان نے میری آگ سے تپش حاصل کی۔ اصل اور ترجمے میں فرق واضح ہے۔ اسلیے اصلاح کی ضرورت ہے۔

درسینۂ چمن چو نفس کردم آشیاں

یک شاخ نازک از تہ خاکم چو نم کشید

جب میں نے سینۂ چمن میں ایک لمحہ کے لیے آشیاں بنایا اور میری شاخ نے خاک کے اندر سے نمی حاصل کی۔ پشتو ترجمہ دیکھیں۔

سینے کښې د چمن لکه د ساه شوم وردننه

په نم چه سے د خاؤ رو نه یو ښاخ اوتوکیدهٔ(۲)

میں چمن کے سینے میں سانس کی طرح داخل ہوا۔ میرے نم کی وجہ سے ایک شاخ خاک سے پھوٹ کر نکل آئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل اور ترجمے میں فرق ہے۔

"نفس" کا ترجمہ لمحہ کی بجائے سانس کیا اور آشیاں کو خارج کیا۔ اسی طرح مفہوم میں فرق ترجمے کو معیوب ٹھہراتا ہے۔

نظم "محاورہ مابین خدا و انسان " کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

آپ نے رات بنائی میں نے چراغ بنایا۔ آپ نے مٹی پیدا کی، میں نے اس سے پیالہ بنایا۔

شپه دِ جوړه کړه نو ما سازکه چراغ

که راد که کنډول نو جوړ که ماترے نه اياغ

مترجم شاعر نے "سفال" بمعنی جام استعمال کیا۔ جو کہ معمولی غلطی نہیں کیونکہ پھر ایاغ کو کن معنوں میں استعمال کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایاغ کے مترادف کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس لیے دوسرا پشتو مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

تاخاوره پیداکړه ماکړهٔ جوړتر نه اياغ (i)

نظم "شبنم " کے کچھ مصرعے اور ترجمہ دیکھیں۔

زآفاق بریدم	آسمان سے نیچے اتری
جاں؟ چرہ کشائی است	جان (روح) لذتِ دیدار پر مرتی ہے

(۱) پیام مشرق (پشتو ترجمہ)، ص ۱۲۱۔

(۲) ایضاً ص ۱۲۱

(i) سفال بمعنی مٹی اور ایاغ بمعنی پیالہ یا جام

بالالۂ خورشید جہاں تاب نظرباز

دنیا کو روشن کرنے والے آفتاب کے لالہ سے نظر ملا۔ اب منظوم ترجمہ اور مطلب ملاحظہ ہو :۔

جهان نه پیژنمه — جہان کو نہیں جانتا

اوروح دلکشائیئی — اور روح دلکشا ہے

ګلونو دلاله سره کوه لیدهٔ کاتهٔ — گلِ لالہ سے ملاقات کرتے رہنا(۱)

مترجم شاعر نے مذکورہ پہلے دو مصرعوں کا ترجمہ ہی غلط کر دیا ہے فرق صاف واضح ہے۔ تیسرے مصرع میں آفتاب کا ذکر ہی نہیں کیا۔ نظم " عشق" دیکھیں :۔ پویاں بے خضر سوئے منزل

بردوشِ خیال بستہ محمل

میں بغیر خضرؑ (رہنما) کے منزل کی طرف دوڑا۔ میں نے تخیل کے دوش پر محمل باندھا۔

بے رهبره تهٔ په لوری د منزل

په اوږ ه ئے وو د خیال ایښے محمل (۲)

مترجم شاعر نے خضرؑ کا مرادی معنیٰ "رہبر" استعمال کیا ہے۔

اکثر تراجم ایسے ہیں جو اصل دیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ ترجمے کو اصل کا عکس ہونا چاہیے جو فکر و فنی خوبیوں اور شعریت سے مالامال ہو۔ نظم "بے باقی" دیکھیں :۔ چہ نقشہا کہ نہ بستم بکارگاہِ حیات

چہ رفتنی کہ نہ رفت و چہ بودنی کہ نبود

میں نے کارگاہ حیات میں کیا کیا نقوش تخلیق نہیں کئے مگر (اسکے باوجود) نشانات (جو مٹ جانے چاہیے تھے) نہیں مٹے اور کتنے کام جو ہونے چاہیے تھے نہیں ہوئے۔

د ژوند په کارګه کښې ہے کوم شے نه دے جوړ کړے

تول تلونکی وو چه لاړل همګی شولو نابود(۳)

مطلب :۔

میں نے کارگاہِ حیات میں کونسی چیز نہیں بنائی۔ ساری چیزیں فانی تھیں اور سب کچھ ختم ہوا۔ ترجمہ کے دوسرے مصرے میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ می تر شد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

بر سرِ بام آ، نقاب از چہرہ بیباکانہ کش

نیست در کوے تو چوں من آرزومندے دگر

---

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۱۳۸، ۱۳۹

(۲) ایضاً، ص ۱۴۲ (۳) ایضاً، ص ۱۶۸

بس کہ غیرت می برم از دیدہ بینائے خویش
ازنگہ بافم بہ رخسارِ تو رو بندے دگر
یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

ترجمہ :۔

مدام نوی خدایان ہے فکر ځان له جوړوی
دیوبند نه چه خلاص شي نوراگیرشي په بل بند
حجاب د مخے نه لرے که ښکاره راشه بلئی له
زما په شان دِبل ددیدن نشته آرزو مند
دخپلو روغو سترګو نه بیحده زه شرمیږم
په مخ دِ د نظر نه جوړوم ځکه روبند(i)
یو اوښکه ، یو نظر ، یوه خندا د حیا پټه
د عشق دغه وعدے له بل پکارنه دے سوګند(۱)

مندرجہ بالا بند کا ترجمہ مثالی اور دلکش ہے۔ شاعر نے اصل کا عکس پیش کرنے میں حد درجہ کمال دکھایا ہے۔ ایسے کئی مقامات ہیں جن پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو :۔

صبا بہ ! گلشنِ ویمر سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

اے صبا! گلشنِ ویمر تک ہمارا اسلام پہنچادے، اس شہر کی خاک نے نکتہ وروں کی آنکھ کو روشن کر دیا ہے۔ پشتو ترجمہ ملاحظہ کریں۔

اے نسیمه ځه ، سلام مے دویمر چمن ته یوسه
چه په فیض دعقلمند و، دغه ملک روښانه شهٔ

اے صبا! گلشن، ویمر تک ہمارا اسالم پہنچادے۔ اس لیے کہ عقلمندوں کے طفیل یہ ملک روشن ہوا۔ ترجمہ غلط ہے۔ اس میں تصحیح کی ضرورت ہے کہ مطلب کو الٹ کر دیا گیا ہے۔ دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

چه نظر د نکته دانو ددے ملک خاوړے روښان کړهٔ

عیارِ معرفت مشتری رست جنس سخن
خوشم ازانکہ متاعِ مرا کسے نخرید

شعر ایسی جنس ہے جس سے خریدار کی سمجھ کی پرکھ ہوتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ میری متاعِ سخن کا جوئی خریدار نہیں ہے۔

---

(۱) پیام مشرق (مترجمہ) ص ۱۷۰

(i) روبند بمعنی نقاب

د شعر د جنس ذوق د خریدارلره معیار دے

چه پنگه ہے خوک ناخلی خفه یمه په دے(۱)

مترجم نے خوشم کو بمعنی خفہ استعمال کر کے مطلب کو الٹ کر دیا ہے۔ مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

چه پنگه ہے خوک ناخلی خرم یمه په دے

صدنالۂ شبگیرے ، صد صبح بلاخیزے

صدآہ شرر ریزے، یک شعر دلآویزے

صدنالہ شب گیر بلند ہوتے ہیں۔ صدبلاخیز صبحیں آتی ہیں صدہاشرربار آہیں اٹھتی ہیں، تب کہیں ایک شعر دلآویز وجود میں آتا ہے۔

توله شپه دغم په شو گیرو کبنی تیرول

سوونو اسویلونه شی یوشعر دلاویز(۲)

ساری رات نالۂ شب گیر میں گزار کر سینکڑوں آہیں ایک شعر دلاویز بناتا ہے۔ ترجمے میں انتہائی اختصار ہے۔ صد بلاخیز صبحوں کا ذکر تک نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے ترجمہ میں تصحیح کی گنجائش موجود ہے۔

دشپے سل فریادونه شو رانگیز سل سحرونه

له سلوآتشی اسویلوساز دلاویز شعر شی

اسرار ازل جوئی بر خود نظرے واکن

یکتائی و بسیاری ، پنہانی وپیدائی

که اسرار د ازل غوارے لږ دِ ځان وته نظرکه

د وحدت او دکثرت ده هر طرف ته تماشا(۳)

ترجمے میں پنہاں اور ظاہر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

د وحدت او دکثرت ده ښکاره پټه تماشاه

مندرجہ ذیل شعر کا ترجمہ اصل کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔

آں چه مقصودِ تگ وتازِ خیالِ من وتست

ہست در دیدہ ومانند نظر پیدا نیست

جو میرے اور تیرے تگ و تاز کا مقصود ہے۔ (اللہ تعالیٰ) وہ ہماری نظر میں ہے مگر نظر کی طرح نظر نہیں آتا۔

ددوارو ددے خیال چه مدعا څه ده پوهیږ ے؟

نظر هسې دے ستر گو کبنې ، باهر ئې اثر نشته(۴)

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۱۸۵

(۲) ایضاً ص ۱۹۱

(۳) ایضاً ص ۲۰۰ (۴) ایضاً، ص ۲۰۳

دونوں کے اِس خیال کا مدعا جانتے ہو کیا ہے ؟ نظر کی طرح آنکھ میں ہے، باہر اس کا کوئی اثر نہیں۔ معلوم ہو تا ہے کہ ترجمہ میں کافی فرق ہے اس لیے صحیح ترجمہ اس طرح ہو گا۔

زما او ستا د خیال دتگ وتاز مدعا څه ده
نظر غونډے دے سترګو کښې بهر په نظر نشته

یا

زما او د ستا خیال د تگ و تاز مقصود هغه
چه نظر غونډے دے سترګو کښې بهر په نظر نشته

مندرجہ ذیل شعر اور اس کے ترجمہ پر غور کریں۔

بغارت می بری سرمایۂ تسبیح خواناں را
بشبخونِ دلِ زناریاں ترکانہ می آئی

کبھی آپ تسبیح خوانوں کا سرمایہ غارت کر دیتے ہیں اور کبھی زناریوں کے دل پر بیباکانہ شبخون مارتے ہیں

کوے د مونځ ګزارو تمامی پنګه تالاتۀ
په زړه د بت پرستو څه ناترسه کړے حملے (۱)

مترجم نے تسبیح خواناں کا ترجمہ نمازیوں کا کیا ہے۔ پھر بھی مطلب صحیح ادا ہوا ہے۔

بعشوہ ہائے جوانانِ ماہ سیما چیست
در آنحلقۂ پیرے کہ دلبری داند

چاند چہرہ نوجوانوں کی اداؤں میں کیا رکھا ہے۔ (مجھ جیسے) پیر کے حلقہ میں آ، جو دلبری جانتا ہے۔

د سپین مخو فریبیانو مجلسونو کښې څه نشته
شه مرید د هاغه پیر چه، شی کولے دلبری (۲)

مترجم نے "بعشوہ ہائے" کو بمعنی مجلسیں اور نوجوانان کو بمعنی "فریبیان" (فریبی) استعمال کیا ہے۔ اس لیے ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

ګوره غمزو کښې ذمه رخوزلمو هیڅ هم نشته
راځه محفل ته د پازیر چه دلبری پیژنی

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۲۰۷

(۲) ایضاً ص ۲۱۰

خدا کرے کہ سارے کا سارا عرب میرے خون ملے آنسوؤں سے لالہ زار ہو جائے اور عجم کے لیے جو اپنی خوشبو کھو چکا ہے، میری نوا بہار ثابت ہو۔

دسرو اوبنکو په دریاب مے تول عرب شئه لاله زار

او عجم خزان زېلی له شه دم زما بهار(۱)

لفظ "دریا" اضافی ہے لیکن پھر بھی ترجمے پر بار گراں نہیں بنتا۔ رمیدہ بو کا ترجمہ خزاں کے مارے ہوئے کرنا شاعر کا کمال ہے۔

؎ اے مسلمان دگر اعجاز سلیماں آموز

دیدہ بر خاتم تو اہرمنے نیست کہ نیست

اے مسلمان دوبارہ سلیمانؑ کا اعجاز سیکھ، کیونکہ کوئی ایسا اہرمن نہیں جس کی نظر تیری انگوٹھی پر نہ ہو۔

معجزے د سلیمان ؑ زده دوباره که مسلمانه

دے غمی وته دے غل یو اهرمن نهٔ دے چه نهٔ دے(۲)

مترجم شاعر نے "خاتم" کو بمعنی "نگینہ" استعمال کیا ہے جو کہ معیوب نہیں۔ "غمی" کی جگہ "انگشت" استعمال کرنا بہتر ہو گا۔

برق را ایں بجگری زند، آں رام کند

عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است

یہ برق جگر پر لیتا ہے۔ اور وہ اسے رام کرتی ہے۔ عشق، ساحر کا پیشہ عقل سے زیادہ جگر دار (حوصلہ مند) ہے۔

که دهٔ بجلی پیدا کړله هغه کړله راتینګه

د عقل جادوګرځنے دا عشق دے جګر دار(۳)

اگر اس نے بجلی پیدا کی تو اس نے تھامے رکھی، عشق، جادوگر جیسی عقل سے زیادہ جگر دار ہے۔

مترجم نے مفہوم کو گرفت میں لینے کی پوری کوشش کی ہے لیکن پھر بھی پہلا مصرع (ترجمہ) مشکوک ہے اس لیئے اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

کیمیا سازئ او ریگ رواں را زر کرد

بر دلِ سوختہ اکسیر محبت کم زد

اس (عقل) کی کیمیا سازی نے اڑتی ہوئی ریت کو سونا بنا دیا۔ مگر کسی دلِ سوختہ پر اکسیر نہ ڈالی کہ وہ کندن بن جاتا۔

په زور ئے ذکیمیا سره د شګو نه زر جوړ کړهٔ

مګر له سوی زړهٔ ئے کهٔ اکسیر د مینے سم(۴)

ترجمے میں "سم" کی جگہ "کم" ہونا چاہیے۔ تب ترجمہ صحیح ہو گا۔

---

(۱) پیام مشرق (پشتو) ص ۲۱۵ (۲) ایضاً ص ۲۱۹

(۳) ایضاً، ص ۲۲ (۴) ایضاً، ص ۲۲۷

حصہ "صحبت رفتگاں" میں نظم "نیٹشا" کا پہلا شعر :۔

گر نو اخواہی ز پیشِ او گریز

در نےِ کلکش غریو تندر است

اگر تُو نغمہ چاہتا ہے تو اس سے دور رہ، کیونکہ اس کی آواز میں بجلی کی کڑک ہے۔

غرض که دِ نوا وی نو ددهٔ د مخے تبنته

قلم کبنں دِ د تندر هسے وینه اثر [۱]

اگر تو نغمہ چاہتا ہے۔ تو اس سے دور رہ، پھر اپنے قلم میں بجلی جیسا اثر دیکھ۔

دوسرے مصرع کے اصلی اور ترجمے میں فرق ہے اسلیے تصحیح کی ضرورت ہے۔

"خرابات فرنگ" کا شعر ملاحظہ ہو۔

خوب، زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست

زشت، خوب است اگر تاب و توانِ تو فزود

اچھی چیز بری ہے اگر وہ تیری کلائی مروڑ دے، اور بری چیز اچھی ہے اگر وہ تیری تاب و تواں میں اضافہ کرے۔

که زور دِ چرے نه وو روا واړه ناروادی

او واړه بد روادی که زور دِ چرے وو

اگر تیرا بس نہیں چلتا تو سارے جائز ناجائز ہیں اور اگر تیرا بس چلتا ہے تو ناجائز بھی جائز ہے۔ مترجم نے جس مفہوم میں اصل کو لیا ہے اس کو ہم رد نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی ترجمہ اصل کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ ترجمہ اصل کا عکس پیش کرے۔ اس مقصد کے پیش نظر مذکورہ شعر کا ترجمہ صحیح کرنا ضروری ہے۔

نظم "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں مصرع :۔

باغ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو

ترجمہ :۔

اوستا د جنت باغ سره سايه شوه د طوبیٰ [۲]

مترجم نے سدرہ کا ذکر نہیں کیا۔

مترجم مینوشؔ نے پوری کوشش کی ہے کہ اس کا ترجمہ معیاری اور مثالی ہو۔ لیکن شاعر اکثر شعریت کی مجبوریوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور مفہوم ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ راقم ہر شعر کی ورق گردانی اور اصل و ترجمہ کے ایک ایک شعر کا تقابل کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مندرجہ بالا تمام خامیوں، کوتاہیوں اور مجبوریوں کے باوجود بھی مینوشؔ کی کاوشیں قابل تعریف ضرور ہیں۔ کیونکہ ایک ایک لفظ کی چھان پھٹک اور شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا کوئی معمولی کام نہیں اور بعض مثالی

(۱) پیام مشرق (پشتو) ص ۲۳۱ (۲) ایضاً ص ۲۵۶

تراجم نے شاعر کو مترجمین اقبال میں اہم مقام دلایا ہے۔ مثالی تراجم کی امثلہ ملاحظہ ہوں۔

اے صبا از تنک افشانی شبنم چہ شود
تب و تابِ از جگر لالہ ربودن نتواں

څه فائده د ه صبا وايه ددے پرخے دپونے نه
د لاله د ګلو او رکله په دے شي سر يدے

بعض اوقات شاعر بامحاورہ ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"ژرده" کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

کے تواند گفت شرح کار زار زندگی
می پرد در نگش، حبابے چوں بدریا بشکند

وہ کیسے زندگی کے کارزار کی وضاحت کر سکتا ہے۔(اس کا تو یہ حال ہے) دریا میں بلبلہ ٹوٹے تو اس کا رنگ اڑ جاتا ہے۔

دڑوند د کشمکش کله کولے شي دے شرحه
د دزنه د اګئي چه ئے زړګے کله او بوږنيږی (۱)

دوسرے (ترجمہ) مصرع کا مطلب :۔
انڈے کے ٹوٹنے سے اس کا دل خوفزدہ ہو جاتا ہے۔

نقدِ شاعر در خورِ بازار نیست
ناں بسیم نسترن نتواں خرید

شاعر کی متاع بازار میں لانے کے قابل نہیں، گل نسترن کی چاندی سے روٹی نہیں خریدی جاسکتی۔

د شاعر نقدی کره کوته بازار
کره شيے داسے بازار کبن شي تروته

شاعر کی متاع کھری ہے اور بازار کھوٹا۔ کھری شے ایسے بازار میں معیوب ہو جاتی ہے۔
پیام مشرق ترجمہ میں املا کی اغلاط بہت کم ہیں جو مندرج ذیل ہیں۔

صفحہ	غلط	صحیح
۴۰	اوسم	اوسه
۶۲	لاندے	لارے

(۱) پیام مشرق (پشتو)، ص ۲۶۲

۱۲۴	عیب	غیب
۲۴۷	قسمہ	قسمتہ

معلوم ہوتا ہے کہ مینوش کے مثالی تراجم کا شمار بہت کم اور نہ ہونے کے مترادف ہے۔ اکثر اشعار لفظی تراجم کی خانہ پری تو کر دیتے ہیں جس سے اصل تک رسائی محال ہو جاتی ہے، لیکن فکر اقبال سے محروم رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ترجمہ اصل کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر زبان کی اصطلاحات جدا و منفرد ہونے کے سبب اصل کا عکس پیش کرنا مترجم کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اصل کے فکر و فن اور مفاہیم و مطالب کو گرفت میں لینا شاعر کی اولین سعی ہونی چاہیے۔ لیکن مینوش نے انہی کو قابل اعتنا سمجھا نہیں اور محض شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا کے دھارے میں بہہ گئے، چونکہ شعر اختصار اور قافیہ طلب ہے اس لیے وہ اکثر اصل الفاظ کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ترجمہ ادھورا اور نامکمل رہ جاتا ہے۔ شعریت کا دامن تنگ ہونے کی وجہ سے وہ بعض اصل الفاظ کے پشتو مترادفات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ بعض اوقات قافیے کی تلاش میں کامیابی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ افعال اور ازمنہ کا فرق بھی اشعار کے مفہوم پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ کہیں لفظی ترجمہ کر کے فکر و فلسفہ اقبال سے پہلو تہی کی گئی ہے اور اصل پڑھے بغیر مفہوم سمجھ سے ماورا ہو جاتا ہے۔ کہیں فلسفہ اقبال کی گرفت میں شعر کے مفہوم میں بہہ جاتے ہیں اور شعر کی وہ چاشنی نہیں رہتی جو اصل کا طرۂ امتیاز ہے۔

۔۔۔ترجمے کا معیار۔۔۔

۱۔ شاعر نے کلام اقبال کے بعض الفاظ کے معنی بدل دیے ہیں یا غلط کئے ہیں۔ قافیہ پیمائی کی دھن میں بعض الفاظ و تراکیب کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کا ترجمہ ادھورا اور نامکمل ہے۔

۲۔ اصل الفاظ کا استعمال زوروں پر ہے اور انکے پشتو مترادف کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بعض الفاظ اضافی استعمال کئے اور اکثر ایسے تراجم فکری و فنی خوبیوں سے مالامال ہیں۔

۳۔ بعض مقامات پر شاعر کو قافیے کی تلاش میں کامیابی نہیں ہوتی۔

۴۔ بعض مقامات پر شاعر کا تجربہ حاوی ہو جاتا ہے۔ اور اصل کی شیریں زبان اور رنگین پیرایہ بیان سے ترجمے پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔

۵۔ بعض تراجم غلط ہیں۔ بعض کنائے مشکل ہیں۔ بعض مصرعوں کے مطالب الٹ ہیں۔ بعض الفاظ نامناسب اور ناموزوں مستعمل ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ پیچیدہ اور مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔

۶۔ جب پشتو قارئین اصل اور ترجمے کا تقابل کرتے ہیں تو لفظی معنی کو نظر انداز کئے ہوئے ترجمے سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اگر شاعر اصل الفاظ کو بھی مد نظر رکھ کر ترجمہ کرتے تو پشتون فارسی زبان و ادب اور کلام اقبال کی خوبیوں اور نزاکتوں سے آگہی کے ساتھ فلسفۂ اقبال کو بھی آسانی سے سمجھ سکتے۔

۷۔ ترجمے کا عمومی رنگ شعر کی بے ساختگی اور روانی کے لطیف اثر سے خالی ہے۔

ب

کتاب :۔ ضربِ کلیم

مترجم :۔ شیر محمد مینوش

ناشر :۔ یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور

سن اشاعت : ۱۹۵۹ء

صفحات :۔ ۱۵۲

---- ضرب کلیم ----

ترجمے کا تعارف :-

شیر محمد مینوش نے ضرب کلیم کا ترجمہ کیا۔ علامہ کے اس فلسفیانہ تصنیف کا ترجمہ ہر شاعر کے بس کی بات نہ تھی لیکن انھوں نے بڑی عرق ریزی اور باریک بینی سے اس تصنیف کا مطالعہ کیا اور مذکورہ تصنیف کو پشتو کی خالص، سلیس، شستہ اور غنائی زبان عطا کی۔ اکثر منظومات یوم اقبال کے موقع پر ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ "مسلمان" نظم کا ترجمہ اپنی غنائیت کی وجہ سے موسیقیت اور اعلیٰ زبان وبیان کا مرقع ہے۔ مینوش کے یہ تراجم پشتو پروگراموں میں ریڈیو سٹیشن سے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ سید تقویم الحق کاکاخیل نے آپ کے ترجمے کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے۔

اکثر مقامات پر ترجمہ خوبصورت اور دلکش ہے لیکن جہاں بحریں چست اور مختصر ہیں وہاں اصل قافیے اور الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جس سے ترجمہ پھیکا اور بدمزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھ پشتو قارئین کے لیے پیچیدگی اور بیزاری کا باعث بھی ہے۔ بعض صفحات پر صفحہ نمبر نہیں اور بعض صفحات غلط ہیں۔ مثلاً صفحہ نمبر ۲۹ کے بعد ایک صفحہ پر نمبر درج نہیں۔ اور اس کے بعد کے صفحے پر ۳۲ لکھا ہوا ہے۔ بعض نظمیں کلیات کی ترتیب پر نہیں۔ بعض الفاظ کی املا مثلاً وریز (وریځ)، نہ (نہ)، کہ (کہ)، ځما (زما)، ځمونږ (زمونږ)، مایوسہ (مایوسہ)، کہ (کړه)، مہ (مہ)، وَخ (وخت)، اور رسم الخط غلط ہے۔

ان تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی مے نوش کے ترجمے کی شاعرانہ ساکھ مسلم ہے۔ بعض منظومات کے تراجم ایسے مثالی اور دلچسپ ہیں۔ جن پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ ایسا خوبصورت اور دلکش ترجمہ کوئی اور شاعر پیش نہیں کر سکتا۔

ترجمے کا تفصیلی جائزہ :-

نظم "ناظرین سے" میں اصل قافیے استعمال ہوئے ہیں جس نے ترجمے کو پیچیدہ بنادیا ہے۔

ے خونِ دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل، نہ جل ترنگ

دہ پنگہ د ژوندونډ ذژوکی او خیگر وینہ !

فطرت وینہ ترنگ دے مہ گنڑہ ئے جلترنگ(i)(۱)

زندگی کا سرمایہ دل اور جگر کے خون سے پیدا ہوتا ہے یعنی زندگی میں اس کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جس میں بہادری، جوانمردی، جفاکشی اور محنت ومشقت کی خصوصیتیں موجود ہوں۔ اے غافل! فطرت جل ترنگ سے نہیں، لہوترنگ سے کام لیتی ہے۔

نظم "تمہید" میں تریاکی، خاکی، افلاکی، ناپاکی، بیباکی اصل قافیے مستعمل ہیں۔ ورنہ ترجمہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ مصرع مختصر اور بحریں دلچسپ ہیں۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمین کے ہنگامے

بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی!

تیری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن

کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی!

اسانے کہ د زمکے دغہ سختے پہ تا نۂ کہ

نو خوشے دِ مستئی دی د فکرونو افلاکی!

ممکن نہ دے خلاصے دِذ مرگی دغم نہ چرے

پہ دے چہ تہ خودئ وتہ بدن وائے خاکی(۲)

سید تقویم الحق نے جو ترجمہ کیا لفظی ضرور ہے لیکن اس میں شعریت کی وہ چاشنی نہیں جو مینوش کا ورثہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کہ ددے زمکے ھنگامے درتہ اسانے نہ شوے

بدہ دہ بدہ ، داسمان پہ اندیښنو مستیدۂ

تہ چہ خودی خپلہ کالبوت گنڑے د خاؤرو ختمو

ممکنہ نہ ښکاری دمرگ لہ غمہ ستا خلاصیدۂ

جو کو کنارے کے خوگر تھے ان غریبوں کو

تری نوانے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند!

ھغہ غریبانان چہ وو خوړونکی د قاشقاشو(ii)

اثر دِ د شعرونو کړہ جذبات ورلہ بلند(۳)

"قاشقاشو" کے معنی پوست کے دانے ہیں جس سے پوست اور افیون مراد لینا بعید از فہم ہے۔ اس لحاظ سے تقویم الحق کاکا خیل نے اس شعر کا ترجمہ صحیح کیا ہے مگر شعریت کا دامن تنگ نظر آتا ہے ملاحظہ ہو۔

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۴

(۲) ایضاً، ص ۷ (۳) ایضاً

(i) جل ترنگ: پانی کی تیزلہر، اصطلاح میں ایک باجے کا نام ہے۔ (ii) خشخاش

غریبان وو چه کوم دوه وے په پوست عادت
ستا نغمو ور اوبخښلے هسکے ولولے (۱)

نظ "صبح" کے دواشعار ہیں ایک شعر :۔ وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مگر هغه سحر چه دا وجود ترنه يريږی
د چغے د تکبیر د مومن نه هویدا شی (۲)

ترجمے میں "شبستاں" کا لفظ حذف کر کے ترجمے کو مشکوک بنادیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔ پہلا مصرع

مگر هغه سحر چه د وجود شپه تر يريږ ی

نظم "لاالہ الااللہ" میں تیغ، فساں، سود، زیاں، زنار بہار، جیسے الفاظ اپنی اصلی صورت میں موجود ہے۔

خودی کا سِر نہاں لاالہ الااللہ
خودی ہے تیغ، فساں لاالہ الااللہ

د خورئ رمز پنهان لا اله الا الله
د خودئ دتیغ فسان لا اله الا الله (۳)

نظم "معراج"

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج!

که خوند د الوتلو ورله جوش د مینے ورکه
شاید چه به ذره شمس و قمر کاندِ تارج! (۴)

"شمس و قمر" کے الفاظ بھی پشتو کے نہیں ہیں۔ اس لیے دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

ع شاید چه به ذره دا نمر سپوږ مئی کاندِتاراج!

سید محمد تقویم الحق کاکاخیل نے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا۔

چه د شوق ولولے خوند د پرواز ورکړی
هغه ذره کولے شی دا نمر سپو مئی تاراج (۵)

سید صاحب کے مصرے ہم وزن نہیں ہیں اور بحریں بھی مشکل ہیں۔

نظم "تقدیر" میں

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
براں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

(۱) تقویم الحق کاکاخیل، ضرب کلیم، ص ۳ (۵) ایضاً ص ۹
(۲) مینوش، ضرب کلیم، ص ۸ (۳) ایضاً (۴) ایضاً ص ۱۰

وو تل ئے د قومو نو په عمل باندِ نظر!

د برغے تورے شان که هرے مخے ته اشر(۱)

"وو" کی گہ "وی" چاہیے۔ کہ ماضی فعل حال میں بدل جائے۔ دوسرے مصرعے میں "اشر" خوبصورت اصطلاح ہے جو آدمیوں کی کثرت کے لیے مستعمل ہے تقدیر کی نظر ہر لحظ اور ہر آن قوموں کے عمل پر رہتی ہے۔ یہ نظر کاٹ میں ایسی تیز ہے۔ جیسے دو دھاری تلوار

نظم "علم اور دین" کا یہ شعر :۔

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی

نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

چمن کبش تربیت د غوټئ بیا کله کیدے شی

چه خاځکی ددے پرخے سره مل نه وی نسیم(۲)

ترجمہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ کلی کو شگفتہ کرنے کے لیے محض صبا کافی نہیں بلکہ شبنم کا گرنا بھی ضروری ہے۔ شبنم کلی میں ملائمت اور شادابی پیدا کرتی ہے۔ نسیم کے جھونکے اسے شگفتہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایسا علم جو نظر کی درستی اور دل کی پاکیزگی کے لیے ہو وہ عین دین ہے اور ایسے ہی علم سے دین کو تقویت ملتی ہے۔ نظم "فقر و ملوکیت" میں ؎

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم!

فقیر او خی میدان وته تل بے سازو سامانه

گذاروی بنه محکم، چه وی زړګے جړے سلیم(۳)

مذکورہ نظم کا عنوان ترجمہ میں "فقیری او بادشاهی" رکھا گیا ہے۔ فقر کو فقیر اور فقیری کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ سید صاحب نے ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

فقر د جنگ میدان ته بے سازو سامانه راځی

گدازئے غرق دے په سینه کبش که زړګے وی سلیم(۴)

نظم "تصوف" ؎

یہ ذکر نیم شبی ، یہ مراقبے، یہ سرور

تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سرور مراقبے د نیمے دغه ذکرونه

که نه شه دخودئ د نګهبان نو دے عبث (۵)

پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔ کیونکہ شبی کا مترادف نہیں دیا گیا۔ "سرور مراقبے دنیمے شپے دغه ذکرونه"

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۱۸ (۲) ایضاً ص ۲۰ (۳) ایضاً ص ۲۴ (۵) ایضاً ص ۲۸

(۴) سید تقویم الحق کاکاخیل، ضرب کلیم، ص

نظم "ہندی اسلام" ۔ ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت

وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!

ملت وی د فکرونو په وحدت سره ملت

تباه چه که وحدت هغه الهام کنړه الحاد (۱)

(ملت وحدت افکار سے ملت بنتی ہے اگر وحدت تباہ کرے وہ الہام بھی الحاد ہے)

پہلے مصرعے کے ترجمے میں فرق ہے کیوں کہ اس میں "زندہ فقط" کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

ژوندے وی د فکرونو په وحدت سره ملت

سید صاحب کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

۔ بس په یووالی د افکارو، دملت ژوندون وی

او چه یو والے کړی فنا هغه الهام دے الحاد (۲)

لیکن سید صاحب کا ترجمہ شعریت کے ترنم و موسیقت سے خالی نظر آتا ہے۔

غزل :۔ ترا بحر پُر سکوں ہے! یہ سکون ہے یا فسوں ہے

نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابئی کنارہ!

دا چه غلے دِدے بحر داسکون دے که جادو دے

نه نهنگ شته نه طوفان نه نړیدلے کناره(۳)

تیرے سمندر پر سکون اور خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ جو سمندروں پر وقتاً فوقتاً چھاجاتی ہے یا کسی نے جادو کر رکھا ہے ؟ یہ عجیب سمندر ہے کہ نہ اسمیں مگرمچھ ہے۔ نہ کبھی طوفان آتا ہے، نہ کناروں پر ٹوٹ پھوٹ کے نشان نظر آتے ہیں۔ یہ سمندر کس کام کا ؟ اس پر تو کبھی جوش کی کیفیت طاری ہونی چاہیے (۴)

۔ تو ضمیر آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے

نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ!

تهٔ دَ حالَ د اسمان ددے ضمیر لا خبر نه ئے

په تا باندِ اثر نه که لا دستوری اشاره(۵)

ترجمہ خوبصورت اور دلکش ہے لیکن بعض الفاظ کی بول چال اور تحریر میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ لیکن مینوش نے ایسے الفاظ کو یکسر نظر انداز کردیا ہے۔ مثلاً دوسرے مصرع میں (کہ) بجائے (کړه) استعمال کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۲۷ (۳) ایضاً ص ۲۹ (۵) ایضاً

(۲) سید تقویم الحق کاکاخیل، ضرب کلیم، ص ۳۰

(۴) مطالب کلامِ اقبال اردو از غلام رسول مہر، حصہ ضرب کلیم، ص ۵۲

ے تۀ لا خبر نۀ ئے د اسمان د زړه له رازه

تالا په غمزو رالړزوی نۀ ستاره

سید صاحب نے غمزہ کے مترادف کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نظم "دنیا" پہلے ہے اور "نماز" بعد میں لیکن شاعر نے "نماز" کا ترجمہ پہلے "دنیا" کا بعد میں کیا ہے۔

نظم "دنیا" ے

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا

تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

مګر حقه خبره نۀ شم هیڅکله پټولے

جهان بغیر د تانه یو سراب غوندآئین دے !(۱)

دوسرے مصرعے کا مطلب ہے کہ تیرے بغیر یہ جہان ایک سراب جیسا آئین ہے۔ لیکن یہ ترکیب پشتو یا اردو میں مستعمل نہیں اسلیے ترجمہ روزمرہ کے خلاف ہے۔

نظم "نماز" ے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

فقط خدائے وته سجده چه دومره ګرانه ده تاباندے

دابه در کړی د سجدو لورو زروګونو نه نجات(۲)

دوسرا مصرع مشکوک ہے املا کی اغلاط اس طرح صحیح ہوں گی۔

دابه درکړی د سجدو نورو زرګونو نه نجات

نظم "شکست"

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں

بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست !

اشارہ اس آیت کی طرف وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِی آدمَ مِنْ ظهور هم علیٰ انفسهم الست بربکم قالو بلیٰ شهدنا ان تقولو یوم القیامة انا کنا عن هذ ا غافلین (۳) ہے

ہمارے عہد کے صوفیوں میں وہ گرمی اور حرارت باقی نہ رہی۔ جس کی برکت سے وہ ہر لحظہ میدان حق کے مجاہد بنے رہتے تھے۔ اب وہ زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے تو الست کی شراب پی رکھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اسی اقرار میں گم ہیں جو ہم نے ازل کے دن کیا تھا۔ دراصل یہ بے عملی کا ایک بہانہ ہے ان میں حق کے لیے ایثار و قربانی کی ہمت نہیں رہی۔ وہ ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھے۔ ظاہر یہ کر رہے ہیں کہ وہ اللہ کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

که طبعه د صوفی لری ګرمی نه دغازیانو

بانه بر عمل جوړه کړه د میو د الست!(۴)

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۳۰ (۲) ایضا (۴) ایضا ص ۳۲

(۳) سورۃ الاعراف

دوسرا مصرع پیچیدہ اور بعید از فہم ہے۔ نظم" مستثنیٰ کردار "

صوفی کی طریقت میں فقط مستئی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستئی گفتار

د حال قدرے مستی دہ د صوفی په طریقه کښې
او شرعه د ملا ګنړه مستی فقط د قال(۱)

"قال" عربی لفظ ہے جو پشتونوں کے لیے مشکل قافیہ ہے۔۔۔۔ نظم "قبر"

خاموشی افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائی افلاک نہیں ہے

پکښې خو خموشي شته دے پشان داسمانونو
د دا غسے ارتوالی مګر نه لری اثر!(۲)

دوسرا مصرع مشکوک ہے مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

دا داسے ارتوالی مګر نه لری اثر!

نظم" قلندر کی پہچان" ۔ ہنگامے ہیں میرے تیری طاقت سے زیادہ
چتا ہوا بگاہِ قلندر سے گزر جا!(i)

اے زمانے! تو میرے ہنگاموں کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ تیری طاقت سے زیادہ ہیں۔ تو خیر چاہتا ہے۔ تو قلندر کی قیام گاہ سے بچتا ہوا نکل جا۔

څما دانقلاب مقابله ته کوے نه شے
څما نه اوسه بچ ګوره م تل دنظر زورته(۳)

ترجمہ آزاد ہے مگر اصل مفہوم ادا نہیں کرتا۔ زبان و بیان میں تصنّع نمایاں ہے۔ نظم "فلسفہ" کا ترجمہ خوبصورت ہے، بحریں چست اور مصرعے مختصر ہیں لیکن خفی، جلی، دانا، غواص، گوہر، صدف، اور شرر جیسے اصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے ؟

دانا چرے په دام کښې دا لفاظونه انخلی
غواص چه صدف اخلی وی غرض ئے وګوهرنه(۴)

نظم مردان خدا ۔ ازل سے فطرت احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری!

قلندر ہونا، قبا پہننا اور تاج سر پر رکھنا یعنی درویشی و سلطانی الگ الگ صفتیں سمجھی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے پاک بندوں کی فطرت

(i) نگاہ بمعنی مقام (۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۳۳
(۲) ایضاً ص ۳۴ (۳) ایضاً ص (۴) ایضاً ص ۳۵

میں روزِ ازل سے یہ صفتیں پہلو بہ پہلو چلی آتی ہیں۔ وہ درویشی کے باوجود سلطانی کرتے ہیں اور تختِ سلطنت پر پہنچ جانے کے باوجود درویش رہتے ہیں۔

په خته د آزاد کښې د ازل نه ده آخلے
قبا د فقیری سره یو ځائے شهریاری

"شہریاری" پشتو قارئین کے لیے مشکل قافیہ ہے لیکن شاعر قافیہ پیمائی کی رو میں بہہ گئے ہیں۔
نظم "کافر و مومن" میں زیادہ تر اصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نظم "بر حق مہدی" کا ترجمہ روز مرہ و محاورہ کے لحاظ سے مثالی ہے۔

ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار!

چلونه ئے تمام د سیاست هغه زاړه دی
شاعر ئے د خیالونو په نیستئی دے گرفتار(۱)

سید صاحب کا ترجمہ پیچیدہ ہے یہی شعر ان کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

هغه زوړ دے داؤ او پیچ دسیاست
او هم هغسے شاعر په خیال نادار(۲)

شاعر "تقدیر" کے پہلے شعر کا ترجمہ اس طرح کرتا ہے۔

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانی نزدیک و دور و دیر و زود

اے کائنات کے مالک خدا! مجھے (ابلیس) آدم سے کوئی دشمنی نہ تھی جس کے باعث سجدہ نہ کیا۔ وہی آدم جو زمان و مکان کی قید میں پھنسا ہوا ہے بھلا اس آدم سے دشمنی کی مجھے کیا ضرورت تھی جو نزدیک اور دور، دیر اور جلدی کی قید میں الجھا ہوا ہے۔ ابلیس سجدہ نہ کرنے کی اصل وجہ آگے بتاتا ہے لیکن اس نے آدم پر طنز کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

آدم سره څما څه د شمنی نه وه اے خدایه!
د اېروت چه نن په دام څه کښې د امکان دے تردود(۳)

شاعر نے دوسرے مصرعے (یہ جو آج امکان کے دام میں پریشان پڑا ہوا ہے)۔ کا ترجمہ آزاد کیا۔ جو اصلی کے فکر و فن سے اکتساب فیض نہیں کرتا۔ اس لیے خانہ پری کے مترادف ہے۔

نظم "روح محمدؐ" کا ترجمہ لفظی اور دلکش ہے اور اصل جیسی لذت اور موسیقیت سے مالا مال ہے۔ اسی طرح اسلامی مدنیت، امانت، اور فقر و راہبی، کا ترجمہ غنائیت کا بہترین مثال ہیں۔

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۳۷، ۳۸ (۳) ایضاً ص ۳۹
(۲) تخم الحق، ضرب کلیم، ص ۴۰

حقائق ابدی پر اساس ہے اسکی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

بنیاد ئے دے قائم پہ ابدی حقیقتونو
ژوندون دے ، گورے نه دے څه جادو د افلاطون

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

برحق امام به هاغه سړے ستا د زمانے وی
چه تاکړی د موجود او د حاضر څنې ویزار(۱)

نظم " فقیر و راھبی "کا ترجمہ "فقیر اوراھبی " کیا گیا ہے اس نظم میں اچھے اشعار ہیں لیکن اس شعر کا ترجمہ مفقود ہے۔

اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ
جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی!

اس نظم کے ترجمے میں بھی رہبانی، طوفانی، فانی، ایمانی، مسلمانی جیسے اصل قوافی مستعمل ہیں اس لیے مذکورہ شعر کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

پوښتنه ترنه اوکړه چه داهر څه چه ښکاریږی
جهان دے یا که بس د رنګ و بوئ ده طغیانی

سید صاحب کا ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے ته دده نه تپوس اوکړه چه دا وینو
ده دنیا ، که د رنګونو طغیانی؟(۲)

" غزل" میں چوتھے شعر کا پہلا مصرع اور پانچویں شعر کا دوسرا مصرع سے ایک شعر کا ترجمہ مکمل کیا ہے۔

ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور!
فیض نظر کے لیے ضبطِ سخن چاہیئے
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور

پوره زمانه اوشوه ګوره څیرے م ګریوان دے
مه وایه ګډے وډے دَ داناؤ په حضور(۳)

مندرجہ بالا دونوں اشعار کا ترجمہ اس طرح ہوگا

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۳۲ (۳) ایضاً ص ۳۴
(۲) سید تقویم الحق کاکاخیل ضرب کلیم، ص ۳۷

بوره زمانه اوشوه گوره خیرے مِ گرایون دے

تهٔ نه ئے لاپه هوش کښې ، دجنون سے څه قصور!

ذر سا نظر دپاره د خبرو تول پکار دے

اومهٔ وایه گلوے ودے د داناؤ په حضور!

نظم "مرد مسلمان" ایک دلکش اور پر تاثیر نظم ہے اس میں علامہ نے مسلمان کی لازوال صفات بیان کئے ہیں۔ مسلمان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اپنے عالی شان مقام سے شناسا ہونے کا احساس دیا گیا ہے۔ مسلمان اس نظم کی خوبیوں سے متصف ہو کر طاغوتی طاقتوں کے لیے ضرب کلیم کی حیثیت رکھنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ اس نظم کا ترجمہ بھی مثالی اور دلچسپ ہے مختصر اور پر تاثیر بحروں میں کلام اقبال کا ایسا خوبصورت عکس پیش کیا گیا ہے جس پر طبع زاد اور اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ہر شعر غنائیت اور شعریت کا بہترین نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوم اقبال کے موقع پر پشتو پروگراموں میں ریڈیو پاکستان پشاور سے بالخصوص اور پاکستان ٹی وی پشاور سے بالعموم یہی نظم (پشتو ترجمہ) نشر ہوتی رہتی ہے۔ ایسی دلدوز نظم اور مسحور کن ترجمہ کوئی اور شاعر پیش نہیں کر سکتا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی

ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

ترجمہ :۔

هر دم د زندگئی دے نوے شان د مسلمان

دلیل دے تل په علم په عمل کښې د رحمان

یوځائے چه جبر، قهر، مغفرت او تقدس شی

نو جوړ تر نه خمبیر شی د وجود دمسلمان

په زمکه باندے اوسی ولے سیال د فرښتو دے

وطن ئے دے کابل نه بخارا نه بدخشان

هر خوک د حقیقت نه د مومن کله واقف دے

په خلے خو قرآن وائی ولے خپله دے قرآن (۱)

اس نظم کے کل آٹھ اشعار ہیں۔باقی چار شعروں کا اصل اور ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ پوری نظم کا لطف ادھورا نہ رہ جائے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!
بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

پشتو ترجمہ:۔

معیار ئے ارادے دی د قدرت د مرادونو
دنیاکښں دے میزان اوهم د حشر په میدان
هم داده هاغه پرخه چه زړګے برِ دګل یخ شی
چه خوف تر سمندر که هم دے دا هغه طوفان
هم ژوند ئے د فطرت هغه سرودِ ازلی دے
ویئلو کښں یکتا لکه سورة دے د رحمن!
د فکر په کار ګاه کښں مِ ، جوړیږی مدام ستوری
معلوم که پکښں ستورے د قسمت دمسلمان!

اب ہر شعر کا الگ الگ مفہوم ملاحظہ ہو۔

۱۔ مومن کی شان اور آن ہر لحظہ نئی ہوتی ہے۔وہ بات چیت اور عمل میں اللہ تعالیٰ کا ایک نشان ہوتا ہے۔

۲۔ جس طرح یہ کائنات چار عناصر یعنی آگ، پانی مٹی اور ہوا سے بنی ہے۔ اِسی طرح مسلمان بھی چار ہی عنصروں سے بنتا ہے یعنی (ا) اس کے زورِ قوت کا یہ عالم ہو کہ دشمنوں پر لرزہ طاری ہو جائے،"ب" غلبہ حاصل کرنے کے بعد اس کا عفو در گزر ایسا ہو کہ خطاکاروں کے دل اس کی طرف بے اختیار مائل ہو جائیں۔(ج) سیرت و کردار میں وہ حد درجہ پاکیزہ ہو۔(د) عظمت و برتری میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہو۔(۲)

رسول پاکؐ کی سیرت طیبہؐ کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں فرمایا کہ مظلوی میں صبر، مقابلے میں عزم، معاملے میں راست بازی، طاقت واختیار میں در گزر، تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی کے اندر اسی طرح کبھی جمع نہ ہوئے۔(جس طرح رسول پاکؐ میں جمع ہوئے)

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۵۳

(۲) غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال اردو ضرب کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص ۹۱

۳۔ مسلمان اگرچہ خاک سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے حسنِ عمل کی وجہ سے جبریل امینؑ کا ہمسایہ بن جاتا ہے، وہ جغرافیائی وطنیت کے جال میں کبھی نہیں پھنستا۔ وطن کی خدمت ضرور کرتا ہے لیکن اہل یورپ کی طرح اسے قومیت کی بنیاد نہیں بناتا۔ اس لحاظ سے نہ بخارا کو اس کا وطن کہہ سکتے ہیں اور نہ بدخشاں کو۔

۴۔ کسی نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپؐ کے اخلاق کیسے تھے؟ جواب دیا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ جو کچھ قرآن میں ہے، آپؐ اس کا عملی نمونہ تھے۔ مومن بھی قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے اوامر و نہی کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بناتا ہے دراصل وہ خود قرآن کی عملی تفسیر ہوتا ہے۔

۵۔ اس کے ارادے قدرت کے مقاصد کی کسوٹی ہوتے ہیں یعنی قدرت جو کچھ چاہتی ہے مومن اسی کو لباس عمل پہناتا ہے۔ وہ دنیاوآخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی ترازو ہوتا ہے۔ گویا صاحب ایمان دنیا میں بھی نیکی کو بدی سے الگ کرتا ہے اور قیامت میں بھی وہی نیک وبد کا معیار ہوگا۔

۶۔ جہاں نرمی اور رواداری کی ضرورت ہو مومن وہ شبنم بنتا ہے، جس سے لالے کے جگر میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے۔ جہاں باطل قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا موقع پیش آئے وہ ایسا طوفان بن جاتا ہے جس سے دریاؤں کے دل لرز جائیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔" وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ[1] اے پیغمبرؐ جو آپ کے ساتھی ہیں کفار پر بہت سخت ہیں اور آپس میں بہت نرم ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک دوسری جگہ بھی فرمایا۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

۷۔ مسلمان کی زندگی میں فطرت کے نغموں کی دلآویزی اور سرور پایا جاتا ہے۔ ان نغموں کے سر تال میں وہی ہم آہنگی و ہم آوازی ہے جو سورۂ رحمٰن کی ممتاز خصوصیت مانی جاتی ہے۔۔۔۔۔ قرآن مجید الفاظ ومعانی کا ایک بحر ذخار اور زبان وبیان کا ایک معجزہ ہے۔ سورۂ رحمٰن کے الفاظ میں ایک خاص قسم کا ترنم ہے اس کی وجہ سے یہ سورت پڑھنے میں حد درجہ دلآویز معلوم ہوتی ہے۔ کوئی آدمی سمجھے بغیر ایسے اچھے لہجے میں پڑھے تو سننے والے پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

۸۔ میرے فکر و خیال کے کارخانے میں ستارے بن رہے ہیں تو ان میں سے اپنی قسمت کا ستارا چن لے۔ مراد یہ کہ اپنے شعروں میں زندگی کے حقائق و معارف بیان کر رہا ہوں۔ جو ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں تو بھی اپنی بساط کے موافق ان سے فائدہ اٹھا۔ نظم "پنجابی مسلمان"

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

---

(۱) قرآن کریم سورہ فتح

که لته د تاویل دغه کورکښې وته بنکاری کړی

د بناح ورله تل په یوه منډه راکوزیږ ی

مترجم شاعر کا کمال یہ ہے کہ ترنم، موسیقیت وغنائیت کا دامن کسی صورت ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے مقابلے میں سید صاحب کا ترجمہ بحروں کی طوالت کی زد میں آکر پھیکا ہو کر رہ گیا ہے۔ مذکورہ شعر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

که د تاویل لومه بنکاری کیښوه او دام ئې جوړکړه

جاله پریږدی ورته له خانګې راکوزیږ ی زرزر

نظم "لاو إلّا"

ــ فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا

سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ

فضا کښې ئې دنور کولے ګل اوپچئې نه شو

د خاورو د تیرے که وتے بار نۀ وے دانه(۱)

اگر دانہ خاک کے اندھیرے سے اٹھ کر نورانی فضا میں نہ آتا تو کبھی اس میں سے شاخیں، پتے اور پھول پھل پیدا نہ ہو سکتے۔ مراد یہ ہے کہ دانہ پہلے اپنے آپ کو زمین میں گم کر دیتا ہے۔ یہ اس کے لیے "لا" کی منزل ہے۔ پھر اگ کر روشنی میں آتا ہے اور پودا یا درخت بن جاتا ہے۔ یہ اس کے لیے "اِلّا" کی منزل ہے۔ ترجمہ میں "ګل اور پچئی" خوبصورت ترکیب ہے۔

نظم "احکام الٰہی"

ــ تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

پابند خو د تقدیر وی تمام عمر کانړی بوټی

مومن ګورے فقط د خدائے د حکم دے پابند(۲)

اس کے مقابلے میں سید صاحب کا ترجمہ پیچیدہ اور مشکل ہے۔

د تقدیر پابند جمادی او نبات دی

او مومن دخدائے د حکم وی پابند (۳)

جماد اور نبات پشتو قارئین کے لیے مشکل الفاظ ہیں۔

نظم "مقصود" میں بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود کیا ہے پہلے شعر میں علامہ نے مشہور یہودی فلاسفر سپینوزا ولندیزی(i) کا نظریہ پیش کیا ہے۔ دوسرے میں افلاطون کا اور تیسرے میں اپنا۔

(i) سپینوزا ہالینڈ کا یہودی فلاسفر ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۷۷ء میں مر گیا۔

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۵۴ (۲) ایضاً ص ۵۵

(۳) تقویم الحق، ضرب کلیم، ص ۶۲

۱۔ **سپینوزا** :۔ عقلمند انسان کی نظر ہمیشہ زندگی پر رہتی ہے۔ زندگی کیا ہے؟ یہ کہ انسان کو محبوب حقیقی کی حضوری حاصل ہو۔ وہ اس سے سرور حاصل کرے۔ اس کا باطن روشن ہو۔

۲۔ **افلاطون** :۔ عقلمند انسان کی نگاہ ہمیشہ موت پر رہتی ہے، اس لیے کہ زندگی کی مثال اس چنگاری کی ہے جو اندھیری رات میں ذرا سی دیر کے لیے چمکے یعنی اس کے نزدیک زندگی بے حقیقت ہے اور اسے موت سامنے رکھنی چاہیے۔

۳۔ **اقبال** :۔ زندگی اور موت ہرگز توجہ کے لائق نہیں۔ خودی کا اصل مقصود صرف خودی ہے، یعنی انسان کو نہ زندگی کی طرف اور نہ موت کی طرف دیکھنا چاہیے بلکہ اپنی خودی کو پختہ کرنا چاہیے۔

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود!
نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود
حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

سپینوزا :۔ نظر خود داناؤ هیمشه په ژوندګئی وی
اوژوند فقط سرور حضور نور او وجود

افلاطون :۔ هیمشه د هوښیارو به په مرګ باندِ نظر وی
ژوند دے په تیرے کښې دشرر هسے نمود

اقبال :۔ د مرګ او د ژوندون هډو پروا څه پکار نه ده
نظر دے د خودئ بس د خودئ څنې مقصود(۱)

نظم "آگاہی"

ے وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حرام و حلال سے آگاہ

وہی جان سکتا ہے کہ نظر کے لیے اچھی چیز کونسی ہے اور بری چیز کونسی؟ نیز دل کے لیے حلال کیا ہے اور حرام کیا؟ جو خودی کو فلک سے بلند تر لے جاتا ہے وہی ان چیزوں میں تمیز کر سکتا ہے۔

محرومه د نظر د بدو ښو نه هغه کس دے
د زړهٔ حرام حلال چه پیژنی نأ کوم بشر(۲)

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۵۷

(۲) ایضاً ص ۵۹

وہی شخص نظر کے خوب وناخوب سے محروم ہے جو دل کے حرام وحلال نہیں جانتا۔ شاعر نے ترجمے کو نفی میں بدل کر مشکوک بنادیا ہے، جو اصل مفہوم سے دور پڑتا ہے سید صاحب کا ترجمہ اس ضمن میں صحیح ہے۔

د نظر ښهٔ او بد پیژنی هغه

د حلال حرام د زړهٔ نه دے خبر

نظم "مصلحین مشرق" ؎ نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب ودامن میں

پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی!

چه هر کله خالی ئے د زړونه وو لستونړی

نه وی هغه وریزو څخه نوی تندرونه(۱)

پہلے مصرع کا مطلب واضح نہیں ہے۔ اس لیے پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

ع خالی د نوی تندر نه چه وو ددوی لستونړی

نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" (۲)

؎ تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!(i)

لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

که ځے د شوق په لاره نو منزل مه قبلوه

که مل شوے د دلیلٰی هډو محمل مه قبلوه (۳)

اس نظم میں ایک شعر کا ترجمہ دہرا لیا گیا ہے۔ "غزل"

؎ تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت

کہ موافقِ تدرواں نہیں دینِ شاہبازی!

تهٔ بدل شه دا ده غوره، شریعت دے بدل شوے

دتنزرو موافق چرے دین نه وی شهبازی!(۴)

شاعر مترجم نے "تدرواں" کے معنی "تنزرو" کیا ہے جبکہ سید صاحب نے اس کے معنی "زرکو" بتایا ہے ملاحظہ ہو۔

(i) رہ نورد: راستہ طے کرنے والا مسافر

(۱) شیر محمد مینوش، ضربِ کلیم، ص ۵۹ (۳) ایضاً ص ۴۰ (۴) ایضاً ص ۶۲

(۲) فتح علی خان سلطان ٹیپو ۱۷۸۲ء میں والد حیدر علی کی وفات پر میسور کا فرمانروا بنا۔ جو دکن کی سب سے بڑی، اچھی اور طاقت ور سلطنت تھی۔ والد کی میراث میں سلطنت کے ساتھ انگریز دشمنی بھی ملی۔ اس نے اپنے عہد حکومت کا ایک ایک لمحہ انگریزوں کی مخالفت میں بسر کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے اندر اور باہر، ہر قوت کو اپنے ساتھ انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ملا کر ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن کوئی بھی قوت اس جہاد میں شریک نہ ہوئی بلکہ مرہٹے اور نظام دشمنوں سے مل گئے اور سلطان نے تنہا انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔ انگریز اسے بڑی سلطنت دے کر ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹھکرا گئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ یہاں اشعار ٹیپو سلطان کی سیرت پر دال ہیں۔

ته بدل شوے نو دا بنه شوه چه بدل شو شریعت هم

چه د زرکو په مذهب کبنی روا نه ده شاهبازی

نظم "بیداری" میں اصل قافیہ مستعمل ہیں۔اس نظم کاآخری شعر ملاحظہ ہو۔

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی

وہ پاکیِ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق!(۱)

خواهش هډو په تاکبنی د ساحل د طلب نشته

پاکئی د طبیعت هغه محرم که د عماق(۱)

"اعماق" پشتو قائین کے لیے مشکل قافیہ ہے لیکن شاعر قافیہ پیمائی کی ازلی مجبوریوں کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔اسکے علاوہ براق،اشراق اورآفاق بھی استعمال ہوئے ہیں۔سید صاحب نے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

تهٔ په زړګی کبنی د ساحل هم لاطلب نه لرے

او په صفا فطرت هغه شو د تلونو آشنا(۲)

نظم "خودی کی تربیت" ۔

خودی کی پرورش وتربیت پہ ہے موقوف

کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں

ہوائے دشت وشعیب وشبانئیِ شب وروز

انسان خاک کا پتلا ہے۔اس پتلے میں سب کچھ جلد ڈالنے والی آگ اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ خودی پرورش وتربیت سے مستحکم بنائی جائے۔

کلیمی کا بھید ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ بیابان کی ہوا ہو۔حضرت شعیب جیسا خدا کا چنا ہوا بزرگ تعلیم وتربیت فرمائے اور انسان دن رات گلہ بانی کرے۔(ii)

موقوفه دا خبره د خودئ په تربیت ده

چه اُورشی ، همه سوز په موتی ، خاوره کبنی ، پیدا (۳)

---

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۶۳ (۳) ایضاً

(i) اعماق عمق کی جمع ہے گہرائی۔

(۲) سید تقویم الحق ،ضرب کلیم، ص ۴۷

(ii) سر کلیمی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایمان و عمل کی وہ شان پیدا کرے جو حضرت موسیٰ میں تھی اور جو فرعون جیسے جابر بادشاہ کے خلاف لگاتار جہاد کی شکل میں نمایاں ہوئی۔جابر بادشاہوں سے آزادی حاصل کرنا سہل نہیں۔حضرت موسیٰ مصر میں آرام وآسائش کی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے۔جو شاہی گھرانے میں انھیں ہروقت میسر تھی۔اس کے برعکس مدین میں رہنا قبول کر لیا۔جس کی حیثیت صحرا کی سی تھی۔وہاں انھیں شعیبؑ جیسے بزرگ رہنمائی کے لیے مل گئے۔انھوں نے موسیٰ سے سالہا سال بھیڑ بکریاں چرائیں۔آرام وراحت کی زندگی چھوڑ کر جب تک انسان حد درجہ جفاکش نہ بن جائے اور صبر واستقلال کا مظاہرہ نہ کرے۔اس وقت تک نہ سرداری سے اور نہ انسانوں کی حقیقی خدمت سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔نری جفاکشی کافی نہیں،ایسی تربیت بھی ضروری ہے جس کی بنیاد روحانی فیض پر ہو۔اقبال کہتے ہیں کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے یہ بنیادی چیزیں اپنی جگہ قائم ہیں۔حضرت شعیبؑ ، حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی کے بیٹے تھے اور مصر اور عرب کے درمیان مدین قبیلے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

په هره زمانه کښې دغه راز د کليمي دے

شعيبؑ هسے استاذ، شړول ګلې په بيديا (۱)

(ہر زمانے میں یہی کلیمہ کا راز ہے کہ شعیبؑ جیسے استاد، صحرا میں گلہ بانی۔

شاعر مترجم شعریت کا دامن تھامے رکھنے کے لیے اختصار پر مجبور ہے۔شبانی بمنعی گلہ بانی اور گڈریا کے ہے۔ حضرت موسیٰؑ ، حضرت شعیبؑ کی خدمت میں اس کے لیے بھیڑ بکریاں چراتے تھے۔۔۔۔ نظم "حکومت" کا ترجمہ بعنوان" حکمت" کر دیا گیا ہے۔

نظم "مدرسہ" میں اصل قافیے استعمال ہوئے ہیں۔ جس نے ترجمے کو پیچیدہ بنادیا ہے مثلاً

؎ فیض فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا

جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش (i)

د فیضَ د فطرت دِ نظر مونده دشاهين وو

بدل که غلامیٔ هغه په سترګو د خفاش (۲)

نظم (حکیم نطشہ) میں :۔

؎ حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم

نگاہ چاہیے اسرارِ لاالٰہ کے لیے

د راز نه د توحيد دغه سبب دے خير نه شه

چه غواړي بيل نظر دلااله دغه اسرار (۳)

حکیم نیٹشے جرمنی کا مشہور فلسفی خدا کا منکر تھا۔ اقبال کے مرد مومن اور نطشے کے فوق البشر میں بعض اصولی فرق ہیں۔ تاہم اقبال کی رائے ہے کہ نیٹشے کا "دل مومن" اور "دماغ کافر" ۔ کبھی وہ اسے فرنگستاں کا مجذوب قرار دیتے ہیں۔ اگر مجدد الف ثانی جیسا مرشد اسے مل جاتا تو نیٹشے کی تمام مشکلات حل ہو جاتیں۔ ایک جگہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ میرے زمانے میں ہوتا تو اُسے مقام کبریا کی حقیقت کھول کر بتا دیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نطشے نے بھی اقبال کی طرح انسان کی عملی قوتوں میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش عمر بھر جاری رکھی۔

"غزل"

؎ ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

بلی کی طرح چیتے کی آنکھ بھی اندھیری رات میں روشن ہوتی ہے۔ دور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ چراغ جل رہا ہے۔ چیتا موذی جانور ہے۔ اس کی آنکھ کو چراغ راہ بنانے کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ انسان مشکلات سے نہ گھبرائے بلکہ ان سے فائدہ اٹھائے۔

(۱) شیر محمد بے نوش، ضرب کلیم ص ۶۳،

(۲) ایضاً ص ۷۰ (۳) ایضاً ص ۷۱ (i) خفاش بمعنی چمگادڑ

هغه به ده منزل د روګودر موسی سراغ

چه سترګه ئے زمری هسے تیرے له وه چراغ(۱)

شاعر نے "زمری" (شیر) کا لفظ چیتے کے لیے استعمال کیا ہے جبکہ اصل لفظ "پړانګ" ہے سید صاحب کا ترجمہ دیکھیں :

هغه موسی د منزل ، مقصد سراغ

چه په شپه ئے وی د پړانګ سترګے چراغ

نظم "دین و تعلیم" سے

مجھ کو معلوم ہے پیرانِ حرم کے انداز

ہو نہ اخلاص تو دعویٔ نظر لاف و گزاف(i)

اسلامی پیشواؤں کے انداز عجیب اور عمل واخلاص سے خالی ہیں۔ صرف بلند بانگ دعوؤں سے مقاصدِ ملت کا حصول ممکن نہیں۔ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔

آګاه په لارو د پیرانو د حرم یم

دعوه بے د خلوص دنظر کول وی لاف(۲)

شاعر مترجم نے "لاف" استعمال کر کے ترجمے کو مشکل بنا دیا ہے۔ نظم "جاوید سے"

غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست

وقتِ ہنر است و کار سازی ست

اے جاوید! اے نوجوان! غافل نہ بیٹھ۔ یہ کھیل کود کا وقت نہیں۔ خدا نے انسان کو زندگی بیکار ضائع کرنے کے لیے عطا نہیں کی۔ ضروری ہے کہ علم و ہنر سیکھا جائے اور کچھ کر کے دکھایا جائے۔

مهٔ بیکاره تیروه وخت په بازئ!

دادِ وخت دے د هنر او کارسازئ(۳)

(۲) میں فرماتے ہیں کہ

جائے کہ بزرگ بایدت بود سے

فرزندیٔ من ندارد ت سود!

حضرت نظامی گنجوی اپنے فرزند کو فرماتے ہیں کہ جہاں تجھے بزرگی کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ وہاں و میری فرزندی سے تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یعنی بزرگی ہر انسان کے اپنے عمل و کردار پر موقوف ہے۔ یہ دوسرے کی نسبت سے حاصل نہیں ہوتی۔

که مقام دِ جرے راغے د بهبود

پلارولی ځما به هیڅ درنه که سود!(۴)

(i) لاف و گزاف بمعنی شیخی، بڑائی، تعلی

(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۷۲

(۲) ایضاً ص ۷۳ (۳) ایضاً ص ۷۴ (۴) ایضاً ص ۷۴

ترجمہ خوبصورت، صحیح اور دلکش ہے اس کے مقابلے میں سید صاحب کا ترجمہ مشکوک اور پیچیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔

چه لوټي موسے کوم خائے کبنې

څه زما په زوی ولئي کبنې

حصہ "عورت" کا ترجمہ دلکش ہے لیکن بعض اصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ "تخلیق" نظم

ے ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے

عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

هوا کبنې د صحرا د رفاقت د هوا بوئ دے

عجبه نه ده دا، که د اشنا راشي خبرونه(۱)

ترجمہ کی بحریں چست اور پُر ترنم ہیں لیکن بعض الفاظ کا رسم الخط صحیح نہیں ہے۔ پہلے مصرع میں ھوا کی تکرار ہے جو شعر کے لیے مناسب نہیں ہے۔ نظم "شعاع امید "کا ترجمہ بعنوان " د امید پیاشه "دیا گیا ہے۔ نظم "صبح چمن" کا یہ شعر۔

ے ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش ولیکن

ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

دَغر او بیابان سره تل غاړه غړئ اوسه

خوجنت دِ په لمنے د اسمان لره لاسونه(۲)

شاعر مترجم کا دوسرا مصرع آزاد ترجمے کی خوبصورت مثال ہے (اگرچہ جنت تیرے دامن پر ہے لیکن ہاتھ اسمان پر رکھتے رہو۔)

نظم "خاقانی" :۔ ے وہ صاحبِ تحفۃ العراقین(i)

ارباب نظر کا قرۃ العین

دالیکونکے د تحفه عِراقَین

د نظر د خاوندانو نور عین

نظم "مرد بزرگ" کے قافیے اصل ہیں۔ عمیق، شفیق، تخلیق، رفیق، دقیق، طریق، جس نے ترجمے کو مشکل بنا دیا ہے۔

نظم "ضبط" :۔ یہ نکتہ پیر دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا

کہ ہے ضبط فغاں شیری ، فغاں روباہی و میشی (ii)

و.ئیلے د ه یو پو هه راته پته د ا خبره

چه شور د شغالئی نخښنه ده ، زغم ده د شیرئ (۳)

(i) خاقانی کی مشہور مثنوی جس میں اس نے اپنے سفر حج کے حالات لکھے ہیں۔ چونکہ یہ سفر عراق عجم اور عراق عرب میں سے ہوا تھا۔ اس لیے مثنوی کا نام تحفۃ العراقین رکھا۔

(ii) روباہی :۔ لومڑی کی خصلت یعنی مکاری، میشی، بھیڑپن، بزدلی (۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۷۳ (۲) ایضاً ص ۸۴ (۳) ایضاً ص ۱۰۰

"شغالئی" لفظ مشکوک ہے اس کی جگہ مناسب لفظ جور وباہی وبیشی کا مترادف ہو، استعمال کرنا چاہیے۔
نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کا نام"

ے وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!

او دغه روژتی چه دا د مرگ نه نهٔ ویریږی
دا روح د محمدؐ ئې د بدن نه اوباسئی!(۱)

پہلے مصرع میں فاقہ کش کا ترجمہ روژتی (روزہ دار) کیا گیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ سید صاحب کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ع دا اوږے تږی چه د مرگ له سختونهٔ ویریږی

نظم "یورپ اور سوریا" (i)

ے صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری

بدل ئې دے یورپ دغه سوریا لره ورکړے
کنجرئ او جواری هم شرابونه پلیتان(۲)

سید صاحب نے "ہجوم زنان بازاری" کا ترجمہ "کنجرئ" کی بجائے "رنګ رنګ ډمے" کیا ہے۔
نظم "انتداب"

ے جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتائے ہیں شغل مے خواری

چه چرته جواری نشته ، آزا دے بنځې نشته
حرامه چه گنړلے چرته شی شراب خوری(۳)

زن تنک لباس(ii) کا ترجمہ سید صاحب نے "آزاد ے بنځې" کی بجائے "بربنډے بنځې" کیا ہے۔

مینوش کا ترجمہ بحیثیت مجموعی پشتو زبان میں اقبال کے ضرب کلیم کا ایک حسین عکس پیش کرتا ہے۔ ترجمے کو پُر جوش، دلکش اور دلچسپ بنانے کے لیے انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا برملا اظہار کیا ہے جب مترجم شاعر، فکر و فن اور قافیہ پر اپنی گرفت حاصل کرنے کے لیے کشمکش سے دوچار ہو جاتا ہے تو اس تذبذب کی کیفیت میں اُسے اُمید کی ایک ہی کرن نظر آتی ہے اور وہ اصل الفاظ و قوافی کے استعمال کی۔ جس سے دونوں مقاصد کی بارآوری کافی حدت تک ممکن ہو جاتی ہے۔

(i) سوریا سے مراد سابقہ شام ہے، وہ ملک شام جس کی سرحدیں بہت وسیع تھیں۔ موجودہ فلسطین، اردن کا بڑا حصہ اور موجودہ لبنان اس میں شامل تھے۔
(ii) تنک لباس معنی کم لباس، نیم عریاں
(۱) شیر محمد مینوش، ضرب کلیم، ص ۱۲۳ (۲) ایضاً ص ۱۲۵ (۳) ایضاً ص ۱۲۸

مینوش بھی پر ترنم اور غنائیت سے بھر پور شاعری میں اس قسم کی کیفیات سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ اور وہ اکثر اوقات اصل الفاظ وقوافی کے نعم البدل تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ بدیں سبب شاعرانہ انداز اور قافیہ پیائی کی یکجائی نے انہیں بے بس کر دیا ہے۔

مینوش نے بعض الفاظ نظر انداز کر دیے ہیں اور ان کے پشتو الفاظ کی ضرورت محسوس نہیں کی، جس سے ترجمہ ادھورا ہو کر رہ گیا ہے بعض الفاظ کا رسم الخط بھی مروج طریقہ پر نہیں ہے۔ جس طرح املا کی اغلاط ہر تصنیف میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ضرب کلیم کے اس ترجمے میں بھی مندرجہ ذیل اغلاط سامنے آتی ہیں۔

صفحہ نمبر	غلط	صحیح
۲۷	نسته	نشته
۲۹	تپه	پته
۳۷	ستار	سیاّر
۵۸	پیاشے	پلوشے
۶۲	هلہ	هلہو
۷۱	اوحت	اوچت
۷۷	غوارِ	غوارہ
۱۰۰	نمر	غر
۱۰۳	زرگے	زڑگے

صفحات کے نمروں میں غلطی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی بعض منظومات کی بے ترتیبی کو کوتاہیوں کی فہرست سے نکال سکتے ہیں لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود بھی ان کی شاعری شاعرانہ تلازمات سے مالا مال ہے۔

مترجمین اقبال میں آپ ایسے پر کیف شاعر ہیں۔ جنہون نے الفاظ کی ساخت، تراکیب کی بناوٹ میں بڑی کاوشیں کیں۔ اسلوبوں میں وزن کی کھپاوٹ اور قافیوں کے تناسب میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ اس کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال صفائی اور بے تکلفی سے کیا گیا ہے۔ شاعرانہ انداز فطری اور خالص ہے۔ اس کے مقابلے میں سید تقویم الحق کاکا خیل نے جو ترجمہ کیا لفظی ضرور ہے اور اُس میں اقبال کے فکر کو بھی شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن شعریت کی اس چاشنی اور سرور سے خالی ہے جو مینوش کا طرۂ امتیاز ہے۔ سید صاحب کے شاعرانہ ساخت میں خامیاں ضرور ہیں اور شعریت کا دامن تنگ ہونے کی وجہ سے اکثر بحریں متزلزل اور اوزاں بے قاعدہ دکھائی دیتے ہیں۔

مینوش نے اقبال کی شاعری کو اپنے رنگ میں پیش کرنے کی جسارت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھوں نے معیاری ترجمہ کرنے میں محنت اٹھائی ہے اور حتی الوسع اقبال کے فکر و فن کو پشتو زبان میں ڈھالنے کا ایک اہم فریضہ انجام دیا۔

بابِ پنجم

ارمغانِ حجاز ، جاویدنامہ

(ا) ارمغانِ حجاز (پشتو ترجمہ ۱۹۶۴ء)

ازامیر حمزہ شنواری

مترجم کا تعارف | ترجمے کی نوعیت

ارمغانِ حجاز پر ایک نظر | ترجمے کا تفصیلی جائزہ

(ب) جاویدنامہ (پشتو ترجمہ ۱۹۶۷ء)

از حمزہ شنواری

جاویدنامہ پر ایک نظر | ترجمے کا تفصیلی جائزہ

ترجمے کی نوعیت | ترجمے کا معیار

۱

کتاب :۔ **ارمغانِ حجاز**

مترجم :۔ امیر حمزہ خان شنواری

ناشر :۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سن اشاعت :۔ نومبر ۱۹۶۴ء

ضخامت :۔ ۲۸۰ صفحات

باب پنجم

مترجم کا تعارف :۔

امیر حمزہ شنواری لنڈی کوتل (خیبر ایجنسی) میں ملک باز میر خان کے گھر ستمبر ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے سے حاصل کی۔ اسلامیہ کالجیٹ ہائی سکول پشاور میں دسویں تک تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے بعد منقطع کیا۔ سرکاری وغیر سرکاری ملازمت بھی اختیار کی لیکن آپ کی شاعرانہ طبیعت ملازمت کے لیے موزوں نہیں تھی۔ وہ ہر وقت ایک فلسفی کی طرح اپنے فلسفیانہ خیالات کی دنیا میں گم رہتے۔

حمزہ شنواری ۱۹۳۰ء میں والد کی وفات کے بعد سید عبدالستار صاحب پشاور کی مجلس میں شریک ہونے لگے۔ اس نے آپ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اسی وقت تک آپ اردو میں شاعری کرتے رہے لیکن اپنے مرشد کے کہنے پر پشتو زبان وادب کی طرف متوجہ ہوئے اور پشتو میں شاعری کرنے لگے۔ پشاور میں "بزمِ ادب" انجمن بنائی گئی جس میں راحت زاخیلی صدر اور حمزہ نائب صدر منتخب ہوئے۔ یہ پہلا پشتو جرگہ تھا جس نے رحمان بابا (صوفی شاعر) کے مزار پر کئی مشاعرے کئے۔ ۱۹۵۰ء میں یہ انجمن "اولسی ادبی جرگہ" میں ضم ہو گئی اور حمزہ اس کے صدر بنا دیے گئے۔

۱۹۴۱ء میں آپ نے رفیق غزنوی کے کہنے پر "لیلی مجنون" کا قصہ رقم کیا جو رفیق نے فلم کیا، یہ پشتو کی پہلی فلم تھی جس نے پشتو غزل کے تقاضے ایک حد تک پورے کئے۔ اس کے ساتھ پشتو صوفیانہ شاعری کے ارتقا میں بھی اضافہ کیا۔ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ اقبال بھی اسی عقیدے کے قائل تھے۔ آپ پشتو غزل کے بادشاہ ہیں اور بابائے غزل کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا یہ مصرع

تہ شوے د پښتو غزلہ څوان زۀ دِ باباکړم

زبان زدِ عام ہے۔ آپ تخلیقی فطرت اور خداداد فطانت کے مالک تھے، تاریخ، فلسفہ، ادب اور اخلاقیات پر قدرت رکھتے تھے۔ تصوف کے عارفانہ رموز اور علم موسیقی سے واقف تھے۔ شاعری میں قدما کی پختگی، متانت، اور متأخرین کی خیال افرینی اور نزاکتِ مضمون پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعرانہ تلازمات کی خوبصورتی، تصوف اور تغزل کا رنگ غالب ہے۔ غزل قومی احساس، ننگ، وفا، غیرت اور پشتونولی کا مرقع ہیں۔ فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری کے لیے رباعی اور غزل کو پسند کیا۔ آپ نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ آپ نے ۱۸ فروری ۱۹۹۴ء میں وفات پائی۔

تصانیف :۔

"د زړه اواز (منظوم نعتیہ کلام)، سفرنامہ (سیاحت کابل منظوم)، نوے پښتون (ناول)، غزونے (غزلیات و منظومات)، د کارل مارکس اصول د عقل په نظر کښې، سوانح (حمزه)، تجلیات (نثر)، اسویلی (رباعیات اور قطعات)، د رحمان بابا د کلام منظومہ ترجمہ، تلے پرونے، سپرلے په آئینه کښے، انسانی انا او پوهه، تسخیر کائنات، ڈرامے وغیرہ تذکرۃ الستاریہ (نثر)، خطوط، د خوشحال بابا یو شعر، اور تراجم ارمغان حجاز، جاوید نامہ۔(۱)"

تصنیف کا تعارف :۔

ارمغان حجاز علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کی جوان کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ حصہ اول فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم میں اردو منظومات درج ہیں، لیکن سوائے تین شعروں کے ایک قطعہ کے جو فارسی میں ہے۔ پہلا حصہ پانچ موضوعات :۔ حضور حق، حضور رسالت، حضور ملت، حضور عالم انسانی، اور بہ یاران طریق پر مشتمل ہے۔ نمبر ۱ اور نمبر ۲ بصورت رباعیات مسلسل مضامین ہیں۔ خدا اور سولؐ کے حضور احوال والتجائیں معروضات کی شکل میں نمایاں ہیں۔ نمبر ۳ اور نمبر ۴ ملت اسلامیہ اور عالم انسانی کے مباحث پر حاوی ہیں۔ ان میں متعدد ضمنی عنوانات بھی ہیں۔ حق دل، ہند وراہ مصطفی رو، خودی، انا الحق، صوفی و ملا، رومی، پیام فاروقؓ، شعرائے عرب، فرزند صحرا، تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد، خلافت و ملوکت، ترکِ عثمانی، دختران ملت، عصر حاضر، تعلیم، تلاش رزق، ننگ باچۂ خویش، خاتمہ، حضور ملت کے عنوانات ہیں" حضور عالم انسان میں" تمہید، دل، خودی،، جبر واختیار، موت، بگو ابلیس را، ابلیس خاکی وابلیس ناری، پھر نمبر ۵ بعنوان "بہ یاران طریق" مسلسل خطاب ہے۔ حصہ دوم ۱۳ اردو منظومات پر مشتمل ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ (یہ ایک طویل نظم ہے)، بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو، تصویر و مصور، عالم برزخ، معزول شہنشاہ، دوزخی کی مناجات، مسعود مرحوم، آوازِ غیب، رباعیات، ملازادہ ضیغم لالابی کشمیری کا بیاض، سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدآباد دکن، حسین احمد (تین شعر فارسی میں ہیں) حضرت انسان (یہ ڈاکٹر صاحب کی سب سے آخری اردو نظم ہے)۔

ایک اعلیٰ پایہ کا مفکر و شاعر جہاں پیرانہ سالی میں علم و فکر کی وسعتوں اور تجربات و مشاہدات کی کثرت کی وجہ سے اپنی پختگئی فکر اور پرواز تخیل میں منتہا پر پہنچ جاتا ہے وہاں قوت حافظہ اور دیگر قوائے ذہنی انحطاط پزیر ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں شعرا اکثر آخری عمر میں لمبی نظم لکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور رباعیات و قطعات پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے آخری دور کا کلام پیام مشرق اور ارمغان حجاز میں یہی کیفیت نمایاں ہے۔

ارمغان حجاز (اول حصہ) کی ہر رباعی یا ہر قطعہ گویا چار مصرعوں کی ایک اکائی ہے جو تسلسل فکر اور ارتقائے معنی کو بھی ساتھ لیے ہوئے ہیں۔ اقبال کے معانی کا تحمل دو مصرعوں کا شعر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کو چار مصرے درکار تھے اور جب ان چار مصرعوں میں مخصوص معنی سما گئے تو زائد اور ربط کے اشعار کی ضرورت ہی نہ رہی۔ دیار و روضۂ حبیبؐ کی زیارت کا شوق برسوں سے روحِ اقبال کو

---

(۱) ہمیش خلیل، پښتانہ لیکوال، ص ۱۳۶

جذب کئے ہوئے تھا۔ عشقِ رسول آپ کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس عمر میں فلسفۂ وخرد سب عشق رسولؐ کے تابع ہو چکے تھے۔ آپ رسول اللہ صلعم کی خاکِ پا کو سرمہ چشم بصیرت اور اکسیر دکیمیا سمجھتے تھے ان کا دل گداز اور ضمیر بیدار تھا۔ وہ ایک بڑے فلسفی ہوتے ہوئے بھی سیرت رسولؐ کو خرد کی کسوٹی پر جانچنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

اقبال کی شاعری کا خلاصہ ، جوہر اور لُبِ لباب عشق رسولؐ اور اطاعت رسولؐ ہے۔ ذاتِ رسالت مآبؐ کے ساتھ انھیں جو والہانہ عقیدت تھی، اس کا اظہار اُن کی چشم نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ حجازِ مقدس کی ارض مقدس پر خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ ان کے لیے خاک مدینہ و نجف سرمۂ چشم ہے۔ وہ ہندوستان سے اڑ کر غبارِ رہ حجاز بننے کے متمنی تھے۔ ؎ ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال

اڑا کے مجھ کو غبارِ رہ حجاز کرے

کلام اقبال گاہ گاہ اس آرزو کی جھلک دکھاتا ہے، خاص طور پر ارمغانِ حجاز اس کیفیت کا موثر و دلکش عکس پیش کرتا ہے۔ علامہ کی آرزو تھی کہ خانہ کعبہ اور روضۂ اقدس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ لیکن دیدار کی یہ دیرینہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ وہ یہ درس ضرور دیتے ہیں وہ درس جو ارمغان حجاز کا منبع اور نچوڑ ہے۔

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

رسہ مصطفٰی وته چه دین خو بس هغه دے

او که نۀ وی دا ، نو ده همه بو لهبی (۱)

چونکہ اقبال کو رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر معروضات پیش کرنی تھیں اور ملت کی نمائندگی بھی کرنی تھی اور مدینہ جانے سے پہلے مکہ یعنی خدا کے گھر بھی جانا تھا، اسلیے دونوں گھروں سے تحفے بھی قوم وملت کے لیے لانے تھے۔ بدیں سبب تصنیف نے یہ صورت اختیاری کی کہ پہلے حضور حق گزارشات پیش ہوں اور اس کے بعد حضور رسالت اور پھر حضور ملت۔

ارمغانِ حجاز علامہ کے فکر و فلسفہ اور تعلیمات کا مرقع اور خلاصہ ہے۔ تصوف اور فلسفہ کی اتنی آمیزش ہے کہ کلام ابن عربی، جامی اور رومی کا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عبدالقادر جو پشتو زبان وادب کے نقاد ہیں لکھتے ہیں کہ اقبال آخری دور میں وحدت الوجود کے قائل ہو گئے تھے اور مذکورہ تصنیف کی سترہ رباعیات سے یہ نظریہ بخوبی واضح ہے۔ یہ اقبال کا اہم نظریہ ہے، اس سے چشم پوشی کرنا اقبال سے زیادتی کے مترادف ہے۔ (۲)

بعض اقبال شناس یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اقبال وحدت شہود کی منزل سے گزر کر پھر واپس وحدت وجود والی پوزیشن پر آگئے تھے لیکن پیام مشرق، زبور عجم، گلشن راز جدید، اور ارمغانِ حجاز میں بظاہر وجودی تصورات کے اشارے موجود ہیں جو سب محض سطحی مشابہتیں ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں۔

---

(۱) امیر حمزہ خان شنواری، ارمغان حجاز، اقبال اکیڈمی کراچی، نومبر ۱۹۶۳ء طبع اول، ص ۲۷۸

(۲) امیر حمزہ خان شنواری، ارمغان حجاز، تعارف از مولانا عبدالقادر، ص خ ط

"حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے وحدت وجود کو رد کرنے کے بعد نہ تو وحدت شہود کے مسلک کو اپنایا اور نہ وحدت وجود کے مسلک کی طرف واپس لوٹے۔ وحدت وجود میں تو قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے اور وحدت شہود میں خدا تک رسائی کا امکان ہی نہیں۔ مگر اقبال کے ہاں خودی مطلق اور خودی مقید میں من و تو کا امتیاز استغراقی کیفیت کے باوجود قائم رہتا ہے، جیسے آفتاب کی ضیا میں موم بتی کی روشنی یا سمندر کے پانی میں موتی۔ گو اس سے سطحی مشابہت رکھتی ہے" (۱)

ترجمے کا تعارف :۔

ارمغان حجاز کا پشتو ترجمہ بابائے پشتو غزل امیر حمزہ خان شنواری نے کیا ہے۔ مذکورہ ترجمہ اقبال اکیڈیمی اور پشتو اکیڈیمی کی مشترکہ کاوشوں سے شائع کرنے کی چوتھی کاوش ہے۔

حمزہ بابا خودی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خودی انسانی زندگی کے ہر پہلو کی روح ہے۔ اس کے بغیر حقیقی مسلمان ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے نہ ہی حیاتِ اجتماعی کا سرور دامن گیر ہونا ممکن ہے۔ انسانی وجود مادہ اور روح سے عبارت ہے۔ مادی ہونے کے ناطے قانونِ فطرت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہے کیونکہ جزو سے کل کی مخالف نہیں ہو سکتی۔ (۲)

علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی روح ایسی ہے کہ مسلمان اپنے روحانی وجود کی تربیت کرے۔ خودی کو مادیت سے نجات دلائے۔ تسلط و محکوی میں عالم بشریت کے لیے کچھ کیا جا سکتا ہے نہ ہی تسخیر کائنات کا فریضہ بطریق احسن انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فطرت مادی کا محکوم بننے کے بجائے اس کا حاکم بننا چاہیے (۳)

ارمغانِ حجاز کا پشتو ترجمہ حمزہ بابا کی شاعرانہ صلاحیتوں کا دلکش عکس ہے۔ پشتو زبان و ادب کے نقاد محمد اعظم اعظم ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ بلند فکر، وسیع النظری اور طاقتور قلم یکجان ہو کر ترجمے کو حسین و کامیاب تجربے کا روپ دے دیتے ہیں۔ شعری محاسن اور پشتو الفاظ کی چھان پھٹک میں حتی الوسع کوشش ترجمے میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ (۴)

اقبالؒ عمر بھر حجاز کے سفر میں منہمک رہے اور تصوراتی طور پر مسافرِ مدینہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشق مصطفیٰ اس کے دل کا مستقل سوز ہے، جو ان کو سوز و سازِ حیات کی لازوال دولت سے مالامال کرتے ہیں۔ عشق رسولؐ ان کی زندگی کے خاموش ساز میں بے شمار نغمے بھر کر ان کے دل کو تڑپاتا ہے۔ وہ اسی معشوق کے آئینہ سے اپنے پیکر کی تخلیق اور انہی کے آفتابِ سینہ سے اپنی صبح زندگی تابناک بنانے کے متمنی ہیں۔

آپؐ کے ہجر میں اقبالؒ کی روح نغماتِ درد سے مسلسل بے چین ہو رہی ہے۔ یہ عشق شدید تر ہوتا جاتا ہے اور وہ بہلاوے دل کے لیے صحرا کا رخ کرتے ہیں، مگر ان کی افسردگی میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے وہ آبجو کے کنارے بیٹھ کر زار و قطار رونے لگتے ہیں۔

---

(۱) جاوید اقبال، زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، حصہ سوم، اشاعت دوم، ۱۹۸۷ء، ص ۶۶۸

(۲) عبدالرحمن بیتاب، علامہ اقبال، تعارف از حمزہ شنواری، نوشہرہ سٹی تجارت پبلیکیشنز، ۱۹۶۷ء، ص ۷ (۳) ایضاً ص ۱۰

(۴) محمد اعظم اعظم، پشتو میں اقبال، حصہ دوم، ماہنامہ پشتو، ص ۳۸۹

ندانم دل شہید جلوۂ کیست
نصیب او قرارِ یک نفس نیست
بصحرا بُردمش افسردہ تر گشت
کنارِ آبجوئے زار بگریست

خدائے خبر د چا جلوے شهید کړلو داخوار
نه مے شته د زړه نصیب کښې یو لحظه قرار
بومے تلو صحرا ته هلته لازیاتی غمژن شو
لاړو د چینے په خوا کښې اوژړیدو زار(۱)

پھر وہ یثرب کے لیے رختِ سفر باندھتے ہوئے سرور و عشق مستی میں نغمے الاپنے لگتا ہے۔ سفر جاری رہتا ہے۔ کارواں سوئے منزل بڑھتا رہتا ہے۔ ہر شخص کیا قافلہ کے اونٹ بھی یثرب کے ذوق و شوق سے معمور نظر آتے ہیں۔ اقبال ضعیف، بیمار اور تھکے ہوئے ہیں لیکن اونٹنی تیز قدم بڑھاتی ہے۔ وہ اُسے آہستہ چلنے کے لیے کہتے ہیں لیکن اُس کے قدم اور بھی مستانہ وار اٹھنے لگتے ہیں گویا صحرا کی ریت ریشم و پرنیاں کی طرح نرم ہو گئی ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپایش ریگ ایں صحرا حریر است!

اوبنے ته مے وے سحر چه رو رو قدم واخله
سور دے خوار خسته دے اوکمزوردے اوبوډا
داسے مستانه قدم ئے واخست ته به وائے
چاور ته ریښم دی غوروَلی په صحرا(۲)

اس بات پر ساربان اونٹنی کو مہار دینا چاہتا ہے۔ لیکن اُسے منع کرتا ہے کہ اس کی روح بھی ہماری طرح دیدار محبوب کر رہی ہے اور ہماری طرح دل کے طلسم میں اسیر ہے۔ اونٹنی کی چشمِ سیاہ میں آنسوؤں کی نمی موجود ہے، اس کی آہ صبحگاہی سے اس کا دل جل رہا ہے۔ وہی شراب عشق جس سے اس کا ضمیر روشن ہو گیا ہے۔ اس کی موج نگاہ سے پے بہ پے ٹپک رہی ہے۔

نم اشک است در چشمِ سیاہش
دِلم سوزد ز آہ صبح گاہش!

---

(۱) امیر حمزہ شنواری، ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۲۸
(۲) ایضاً ص ۳۱

ہماں ے کو ضمیرم رابرا فروخت
پیاپے ریزد از موج نگاہش!
تورے سترگے ئے دکے دی د اوبنکو له قطرو
زړه مے سوزوی د نیمے شپے په اسویلو
هغه سره شراب چه زما زړه ئے سره لمبه کړو
دا را وروی د نظر و نو له چپو(۱)

عرب کا خشک صحرا بھی مبارک ہے کہ جس کی ہر ساعت دلنواز اور فرحت انگیز ہے۔ اس کی راتیں چھوٹی دن بڑے اور شام صبح خند ہے۔ اس کا ہر ذرہ درمند ہے، اس لیے اقبال اپنے ہمسفر سے کہتے ہیں کہ ان مقدس ذروں کا لحاظ رکھیں اور اپنے قدم ان پر آہستہ رکھیں۔ کارواں جھومتا ہوا عشق محمدیؐ سے سرشار ہے۔ اقبال حالت، وجد میں ہیں وہ محبوبؐ کی شان میں عاشقانہ کلام کے رنگ میں ہیں۔ لوگ امیر کارواں سے پوچھتے ہیں کہ یہ عجمی (اقبال) کون ہیں کہ اس خشک صحرا میں بھی اس کے نغموں سے دلوں کی آبیاری ہو رہی ہے۔

امیر کاروں! آں اعجمی کیست
سرودِ او بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابئ او
خنک دل در بیابانے تواں زیست
دا عجمی څوک دے چه امیر دے د کاروان
نه لری آهنګ ئے دسُرود، عربی شان
داسے نغمه کاندی چه د هغے له سربنته
یخ نتر به اوپائی انسان په بیابان(۲)

اقبال کو اس سفر کا سوز و ساز پسند آتا ہے غم جدائی کے شعلوں میں انھیں لطف آنے لگتا ہے۔ اس لیے وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ مجھے دریار تک کسی طویل راستہ سے لے چل۔ میرے سوزِ جدائی اور میری آہ و فغاں کو تیز اور جنوں انگیز بنادے۔ اپنے محبوبؐ کی یاد سے ان کا دل بھر آتا ہے۔ جگر میں تیر سا لگتا ہے۔ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ آہم دونوں مل کر آنسو بہائیں کیونکہ ہم دونوں محبوبؐ کے جمال کے شہید ہیں۔ ہم اپنے محبوبؐ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے دردِ جگر کا اظہار کریں اور آپؐ کے پاؤں مبارک پر اپنی آنکھیں ملیں۔

---

(۱) ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۳۲
(۲) ایضاً ص ۳۳

بیااے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتہ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

راشه باره مونږ چه سره اوژاړوزار زار
دواړه یُو وژلی یو جلوے ، دیوهٔ یار
راشه چه دوه دوه د زړه خبرے سره اوکړو
او مبنو بیا سترګے په پښنو باندے د بادار(۱)

سچا عشق اپنا اثر دکھاتا ہے۔اس کی فغاں سلطانِ مدینہ کے دل پر اثر کرتی ہے پھر دربارِ محمدیؐ کے دروازے ایک درویش کے لیے کھول دیے جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے داناؤں کی پیش نہیں جاتی۔جہاں بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ لرزہ براندام ہوتے ہیں اور جہاں جنید وبایزید نفس گم کردہ داخل ہوتے ہیں۔یہاں بقائے دوام ہے۔مسند نشین کی نگاہوں کا فیض ہر شخص کے لیے جاری ہے۔دیدار کی اجازت حکیم و کلیم سب کے لیے ہے۔

دریں وادی زمانی جاودانی
زخاکش بے صور رُوید معانی
حکیماں باکلیماں دوش بردوش
کہ ایں جاکس نگوید "لن ترانی!"

ښنکاری دے کښئی کبښ زمانی جاودانی
خیژی ئے له خاورو بے صورته معانی
دلته خوا په خوادی حکیمان او کلیمان
ځکه چه څوک نه وائی بیخی لن ترانی(۲)

مجلس نبویؐ میں پہنچ کر اس کا شعلۂ عشق بھڑک اٹھتا ہے اور وہ زار و قطار رونے لگتے ہیں۔پوچھنے پر اقبال فرماتے ہیں کہ یہ صورتِ حال آپؐ ہی کے غم عشق کا نتیجہ ہے۔اس سے میرے دل کی حرارت، نوا میں اثر اور ضمیر میں روشنی ہے۔میں اس لیے روتا ہوں کہ ہند میں ایک شخص بھی آپ کا محرم نہیں۔

بنالم زانکہ اندر کشور ہند
ندیدم بندۂ کو محرم تُست

---

(۱) ارمغان حجاز (پشتو) ص ۳۶
(۲) ایضاً ص ۳۸

ژارمه په دے چه په وطن دهندوستان کښ
ووسے نه لید داسے بنده ستا چه وی محرمه(۱)

آپؐ میری زندگی کا واحد سہارا ہیں اور آپؐ ہی کے آفتاب کے فیض سے میرے ارتقا کا عمل جاری ہے اور میری اس بے نیازی اور خود داری کے باعث میری نگاہ ماہ و پرویں سے بلند تر ہو گئی ہے۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں مکہ کا راستہ میں انے اختیار کیا، اس لیے مجھے اپنے دربار سے نہ نکال دیجئے کہ میں آپؐ کے دیدار کا مشتاق ہوں۔ درد عشق کے باعث ناصبور ہوں۔ آپؐ صبر کے علاوہ مجھے ہر حکم دے سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہجر میں صبر میرے بس کی بات نہیں ہے۔

مراں ازدر کہ مشتاقِ حضوریم
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفرما ہرچہ می خواہی بجز صبر
کہ ما ازوے دو صد فرسنگ دُوریم

مه شړه له دره سے، مشتاق ستا د حضوریم،
ستا راکړے درد دے ستا له دره ناصبوریم
او فرمایه ماته ، څه چه وائے بے له صبره
ځکه چه زۀ دوه سوه فرسنګه له دے دور یم(۲)

میں آپ کو چھوڑ کر کہاں چلا جاؤں کہ ساری دنیا تو عشق سے پیدا ہوئی ہے لیکن نور عشق کی تخلیق آپؐ کے سینہ سے ہوئی ہے اور خود جبرئیل بھی آپؐ ہی کے آئینہ کا ایک جوہر ہے۔ حضورؐ! میں نے علمِ حاضر کے طلسم کو توڑا ہے۔ اس کے دام کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ اس علم کے شعلے بھڑکتے رہے ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ میں ان شعلوں پر حضرت ابراہیمؑ کی طرح بے پروا بیٹھا ہوں (۲)۔ میں آپؐ کے نور سے مستفید ہو رہا ہوں۔ میں نے آپؐ کے نور سے اپنے مقام کو دیکھا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کیا ہے بدیں سبب دنیا کے اس بتخانہ میں اپنی نوائے صبحگاہی سے میں نے ایک جہانِ عشق و مستی تعمیر کر لیا ہے۔

چو خود را در کنارِ خود کشیدم
بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم!
دریں دیر از نوائے صبحگاہی
جہانِ عشق و مستی آفریدم!

---

(۱) ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۳۹
(۲) ایضاً ص ۶۲

خپله چه ما او کړو د خپل ځان سره قربت
ستا په نور سے اولید ، خپل مقام هغه ساعت
جوړے د نوانه، د سحر کړو په دے دیر که
څه هکلے جهان ، یو د مستئ او محبت(۱)

میری روح کی تپش، فکر کا پیچ، دل کی بے قراری' موجِ شراب، آپؐ ہی کے دم کا فیض اور آپؐ کے زمزم کا نتیجہ ہے۔ میرا دل آپ کا راز دار ہے، اس لیے تمام مادی قدریں میری نظر میں بدل کر ملکِ جمشیدی میری درویشی سے شرمندہ ہونے لگا۔ میں تلاش محبوب میں ساری دنیا کی خاک چھانتا رہا ہوں۔ اپنے دل کو ہتھیلی پر رکھ کر صحرانوردی کرتے ہوئے موجوں کے تھپیڑے کے کھاتا رہا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی دلبر نصیب نہ ہوسکا۔ سینہ سوزاں لیے ہوئے آپؐ کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ میرے سینہ میں آیئے اور قیام کیجئے۔ بے چین دل کو سکون عطا کیجئے۔ میری تنہائی پر رحم کیجئے کیونکہ دنیا میں کوئی مسلمان مجھ سے زیادہ تنہا نہیں ہے۔

دلے برکف نہادم دلبرے نیست
متاعے داشتم ، غارتگرے نیست
درونِ سینہ من منزلے گیر
مسلمانے زمن تنہاترے نیست!

زړه لرم ورغوی که، دلبر او جانان نیشته
ډیر لرم سامان خوچرته غل د سامان نشته
اونیسه مقام سے په سینه که راشه راشه
ماغوندے دنیا که یك تنها مسلمان نشته(۲)

محبت کی کیفیت اور عشق کی داستان سنانے کے بعد اقبال اپنے محبوبؐ کا بارگاہ میں اپنی نذر پیش کرتے ہیں۔ دلِ بیقرار میری زندگی کی متاع، میری کاوشوں کا حاصل اور میری محبت کا جوہر ہے۔ خدارا اسے قبول کیجئے اور اس غلام کو سرفراز کیجئے۔ اس کے پاس متاع دل کے سوا اور کچھ بھی موجود نہیں۔

اقبال کی نذر کو شرف قبولیت بخشا جاتا ہے۔ اقبال کے دل میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے۔ اے میرے آقا! آپؐ کا ظہور حیات کا شباب ہے اور آپؐ کو جلوہ خوابِ زندگی کی نئی تعبیر ہے۔ آپ کا وجود کائنات کا قیمتی سرمایہ ہے، جس سے اس کا مرتبہ بلند تر ہو گیا ہے۔ اقبال عرض کرتے ہیں کہ میری خاک میں شرر پنہاں ہے۔ میری آہ سحر گاہی کا سلسلہ جاری ہے۔ میں ایک نگاہِ برق انداز کا آرزومند ہوں۔ اس لیے مجھے آزمایئے، میری آنکھوں پر اپنی تجلی مرکوز فرمایئے اور دیکھے کہ اس ضعیفی کے باوجود مجھے تاب نظر حاصل ہے۔

(۱) ارمغان حجاز پشتو ص ۷۱
(۲) ایضاً ص ۷۶

اقبال عرض کرتے ہیں کہ اے ساقی! محبت کی شراب مجھے دیجئے۔ جامِ شراب کو گردش میں لا کر سوزِ نے میں اضافہ کیجئے اور میرے سینہ میں ایسا دل رکھ، جس کی بدولت میں کیکاؤس اور کیقباد کا پنجہ موڑ سکوں۔

بیا ساقی بگرداں جامِ مے را
زِ مے سوزندہ تر کن سوزِ نے را
دگر آں دل بنہ در سینۂ من
کہ پیچم پنجۂ کاؤس و کے را!

جام کړه ساقي پورته راشه زړه کړه زما شاد
سوز د مېږ زيات کړه د شپېلئ د سوز په داد
بيا ہے په سينه کښې هغه زړه کېده، راپاخه
تاؤ چه کړم پنجه زهٔ د کاؤس او کيقباد (۱)

نورِ مصطفیٰ کے فیضان سے اقبال کے قلب و نظر منور ہو جاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں اے میرے آقا! میری آنکھوں کو آپؐ ہی نے نگاہ عطا کی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی تابناکی آپ کی ہے اور شبِ زندگی میں چاند کی روشنی بھی آپ کی لائی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کا رخِ زیبا دل بھر کر دیکھ لینے دیجئے کیونکہ آپ کو دیکھنا خدا کو دیکھنے کے مترادف ہے۔
لاالٰہ کی عملی مشکلات بے شمار ہیں۔ اسی سبب سے جب میں خود کو مسلمان کہتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ تاہم آپؐ ہی کے نور سے اپنی نگاہ کو روشن کرتا ہوں جس کی بدولت میں لا الٰہ کی حقیقت تک بھی پہنچ سکتا ہوں اور رموز کائنات کو بھی سمجھ سکتا ہوں۔ اور رموز کائنات کو بھی سمجھ سکتا ہوں۔

بنورِ تو برافروزم نگہ را
کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو میگویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را

ستا په نور چه ځلنده زهٔ دا خپله نګاه کړم
خير چه بيا پرے زه دننه ده د مهروماه کړم
کله مسلمان چه ځان ته وايم، اورېږ م
زهٔ چه ګرانے چارے راپه زړه د لاالٰه کړم (۲)

---

(۱) ارمغانِ حجاز پشتو، ص، ۷۳
(۲) ایضاً، ص ۸۱

عشق و مستی کے باوجود ملت کا درد اقبال کے دل میں موجود رہتا ہے اور جس بے تابی سے وہ اپنی محبت اور وار فتگی کا اظہار کرتے ہیں اسی بے تابی سے وہ قوم کی حالت زار کو بھی حضورِ رسالت پناہ میں پیش کر کے اس کی اصلاح کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کا سینہ سوز سے خالی ہو گیا۔ اس کا دل تو روتا ہے لیکن وہ اس آہ و زاری کے سبب سے ناوقف اور اپنے مقصد حیات سے ناشنا ہو گیا ہے، اسلیے آپ کی ایک نگاہ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کا کارواں منزل سے دور ہو گیا ہے۔ ان کا نظام حیات بگڑ چکا ہے۔ ان خونِ حرارت اور ضمیر اثر آفرینی سے محروم ہو گیا ہے۔ اقتصادی حالت تباہ، عسکریت کا جوہر زائل ہو چکا ہے اور قرآن کو جس کے فیض سے وہ ایک عالم کی پادشاہی کرتے رہے ہیں انہوں نے طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا ہے۔

نما ند آں تاب و تب در خونِ نابش

نر وید لالہ از کشتِ خرابش

نیامِ او تہی چون کیسۂ او

بطاقِ خانۂ ویراں کتابش(۱)

مسلمان دل کی دنیا سے ناآشنا اور خودی کے جوہر سے عاری ہے۔ نعرہ تکبیر کی برکتوں سے محروم اور نصب العین اس کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اے آقائے مدینہ !اس کے جوہر کو پاکی عطا کر۔ اس کے دل میں ایک دنیا آباد کیجئے اور اس کے چراغ زندگی کی حفاظت فرمایئے۔ جو اس کے دامنِ چاک میں زمانہ کی تیز آندھیوں کے سبب سے بھڑک رہا ہے۔ اس کی زندگی فکرِ غیر کی تابع ہے۔ وہ موت سے خائف اور اسرار مرگ سے ناواقف ہے۔ اس کا شیخ علم الاساطیر (Mythology) کو اپنی متاع سمجھتا ہے۔ وہ تخمین و ظن میں الجھا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا ایمان مردہ اور ان کی بصیرت زائل ہو گئی ہے۔ حضور حق سے جواب ملا کہ ذلت و خواری کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنا نصب العین کھو چکے ہیں، وہ اپنے سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس دل کے لیے کوئی معشوق تو نہیں رکھتے۔

ندا آمد ، نمیدانی کہ ایں قوم

دِلے دارند و محبوبے ندارند(۲)

اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان کو اس کا مقام دکھایا جائے۔ اسے رموز کائنات سے واقف اور اسرار مرگ و حیات سے روشناس کرایا جائے۔ اس لیے سید المرسلینؐ !اس فقیر کے سوز سے مسلمان کو آتشِ ضمیر عطا کر۔ اس کے دل کو ایمان و ایقان کی طاقت اور امید

---

(۱) کلیات اقبال، فارسی، ص ۱۸۰۰

(۲) ایضاً، ص ۱۸۱۸

کی روشنی عطا کیجئے جس سے اس کے قلب و نظر کے استحکام نصیب ہو سکے۔ مسلمان کو میں نے خودی سے روشناس کر دیا ہے، اس لیے اے محمدؐ! میرے نالوں کو ایسی تپش دے کہ بجز غمِ دین کے ہر غم جلا کر راکھ کر دے۔ ملت اسلامیہ جوانانِ پاک باز سے خالی اور سرودِ عشق و مستی سے محروم ہوگئی ہے۔ وہ کمزور، معذور اور غیر کی نگاہِ کرم کی محتاج ہوگئی ہے۔ یہی صورت حال اس کے زوال و پستی کا باعث ہے۔ اسلیے اے پیغمبرؐ! اس ملت کو جوانانِ پاکباز اور اپنی خانہ ساز شراب کے سرور سے انھیں سرفراز کر کے دل بے نیاز اور بازوئے حیدر بخش دیجئے۔

بده اورا جوانِ پاکبازے!

سروش از شرابِ خانه سازے

قوی بازوے اومانندِ حیدرؓ

دلِ اوازدوگیتی بے نیازے

داسے یو ځلمے ورله ورکړه چه پاکبازوی

مست په هغو سیؤ وی چه کوم ئے خانه ساز وی

متے ئے مضبوطے وی په شانے د حیدرؓ

زړۀ ئے له دے دوارو جهانونو بے نیازوی(۱)

اقبال کی اس گفتگو سے ساقی کوثر کا دل بھر آیا۔ ان کی محبت کا اعتراف کیا گیا اور مقام بلند سے سرفراز فرمایا۔ وہ اپنے دلی آرزو کا ذکر کرتے ہیں کہ یہی مردوں یہیں دفن ہو جاؤں اور میرے مرقد کی تعمیر آپ ہی کی دیوار کے سایہ میں ہو کہ میرے بیتاب دل کو سکون میسر ہو سکے۔

"حضور رسالتؐ" کے حصے کا بیان اس لیے رقم کیا تا کہ وہ مقصد عیاں ہو سکے جس کے اقبال بڑی بے تابی سے آرزو مند تھے۔ حمزہ شنواری کا ترجمہ بھی بعض موقع پر پیش کیا گیا تا کہ ساتھ ساتھ ترجمے کا معیار بھی قائم ہو تا رہے۔ ذیل میں ارمغان حجاز کے پشتو ترجمے کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

---

(۱) ارمغانِ حجاز (پشتو)، ص ۷۲

---مثالی تراجم---

امیر حمزہ خان شنواری نے ارمغان حجاز کا ترجمہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ مثالی تراجم کی فہرست لمبی اور طویل ہے لیکن چیدہ چیدہ تراجم کی امثلہ پیش کی جارہی ہیں۔

"حضور حق" کی رباعی نمبر ۴ میں :۔

سرودرفتہ باز آید کہ ناید ؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید ؟
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید ؟

اب گزشتہ سرود واپس آئے یا نہ آئے ؟ حجاز کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلے یا نہ چلے ؟ اس فقیر (اقبال) کی زندگی تو ختم ہوئی۔ اب کوئی اور رازِ آشنا آئے یا نہ آئے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

هغه تیر سرور به بیا راځي که نه؟
چه نسیم به د بطحا راځي که نه؟
بس تر سره شو ژوندون ددے فقیر
چه به بل دراز دانا راځي که نه؟(۱)

"حضور رسالت" کی رباعی نمبر ۸

جہانِ چارسو اندر برِ من
ہوائے لامکاں اندر سرِ من
چو بگزشتم ازیں بام بلندے
چو گرد افتاد پرواز از پرِ من

ساری کائنات میرے پہلو میں سما چکی ہے اور لامکان "عالم قدس" تک رسائی کی خواہش میرے سر میں ہے۔ جب میں بام بلند سے گزر گیا تو پرواز میرے پروں سے دھول کی طرح جھڑ گئی (طاقت پرواز سلب ہو گئی)

اشارہ اس طرف ہے کہ حضور اکرمؐ لامکاں سے بھی اوپر تشریف لے گئے تھے

دا همه جهان سے دے د تن په لر او بر کښې
شته دے هم هوا د لامکان زما په سر کښې (۲)

---

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۱۴ (۲) ایضاً، ص ۳۷

زهٔ چه کوم ساعت د دغه لوړه بامه تیر شوم
پریوت لکه ګرد، چه ے الوت وو چه وزر کېښ

مسلمانم غریب ہر دیارم
کہ باایں خاکداں کارے ندارم
بایں بے طاقتی در پیچ و تابم
کہ من دیگر بغیر اللہ دُچارم

مسلمان ہوں، ہر دیار میں مسافر ہوں کیونکہ میں اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ اپنی بے طاقتی کے سبب سخت پیچ و تاب میں ہوں، کیونکہ ایک بار پھر غیر اللہ سے میرا مقابلہ ہے۔ پشتو ترجمہ ملاحظہ ہو :۔

زهٔ په هر وطن کښ مساف یم مسلمان یم
کار ے د دے خاورو په دنیا نشته روان یم
یم په پیچ و تاب کښ که هر څو یم بے طاقته
ځکه چه مخ شوے غیر الله سره په ځان یم(۱)

"حضور رسالت" کی یہ رباعی ملاحظہ ہو :۔

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم
بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم
مسلمانے کہ مرگ ازوے بلرزد
جہاں گردیدم واورا ندیدیم!

آپؐ نے مجھے بال و پر عطا فرمائے ہیں، انکی مدد سے اڑا ہوں، اپنے نغموں کے سوز میں بہت تڑپا ہوں۔ ساری دنیا پھرا ہوں، مگر مجھے وہ مسلمان کہیں نظر نہ آیا، جسے دیکھ کر موت سہم جائے، پشتو ترجمہ دیکھیں۔

ستا راکړی پر چه وڅ په هغے الوتمه
زه خپلو نغموکښ سوزیدمه پرپیدمه
هغه مسلمان چه مرګ ترے ویره کړی رپیږ ی
چرته ے اونه لید، په جهان اوګرزیدمه(۲)

رباعی :۔

مجلوت نے نوازی ہائے من بین
مخلوت خود گزاری ہائے من بین

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۱۴ (۲) ایضاً، ص ۳۷

گرفتم نکتہ فقر از نیا گاں

زسلطاں بے نیازی ہائے من بین!

جلوت میں میری نغمہ سرائی ملاحظہ فرمایئے! خلوت میں میرا اپنے آپ کو غم میں گھلا دینا دیکھیے۔ میں نے بزرگوں سے فقر کا نکتہ پایا ہے۔ سلطان سے میری بے نیازی دیکھیے۔

اوګوره جلوت ته مے شبیلئی چه غږ ومه

ګوره په خلوت کښې چه خپل زړه ویلے کومه

ما خپلو نیکونونه ، نکته د فقر زده کړه

ګوره له سلطانه څومره زه بے پرواشومه(۱)

ترجمہ ایسا دلکش اور خوبصورت ہے کہ لفظی ہونے کے باوجود بھی طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔

تو سلطانِ حجازی من فقیرم

ولے در کشورِ معنی امیرم

جہانے کوز تخم لاالٰہ رُست

بیا ، بنگر بآغوشِ ضمیرم

(اے عبدالعزیز ابن سعود!) تو حجاز کا سلطان ہے اور میں ایک فقیر ہوں، (ہوں فقیر) مگر ولایتِ معنی کا امیر ہوں۔ آ، میرے آغوش ضمیر میں وہ جہان دیکھ، جو لاالٰہ کے بیج سے پیدا ہوا ہے۔

شاه ئے تهٔ سلطان ئے حجازی او زه فقیر

یم به ،خو په ملک دمعانی کښې یم امیر

ګوم جهان زرغون چه شو دلاالٰه له تخمه

راشه که ئے ګورے زما غیږ کښې د ضمیر(۲)

ترجمہ آسان اور بحریں چست ہیں، اس لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ حصہ "حضور ملت" کا نمونہ دیکھیں۔

ز رازی حکمت قرآں بیاموز

چراغے از چراغِ او برافروز

ولے ایں نکتہ را از من فراگیر

کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

(بے شک) رازی سے قرآنِ پاک کی حکمت سیکھ، اس کے چراغ سے اپنا چراغ جلا، لیکن مجھ سے یہ نکتہ سمجھ لے، کہ مستی و سوز (عشق) کے بغیر زندہ نہیں رہا جاسکتا۔

---

(۱) ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۷۹

(۲) ایضاً، ص ۸۴

زده کړه دراڼی ځنې حکمت چه د قرآن دے
خپل چراغ ئے ، بل کړه له چراغه چه روښان دے
بیا سره د دے یو نکته واوره زمانه
ژوند، چه پکښې سوز اومستی نه وی ، هغه ګران دے(۱)

مترجم نے لفظی ترجمہ کر کے بھی شعریت کا کمال دکھایا ہے۔ حصہ "حضور عالم انسانی" میں رباعی :۔

سحرہا در گریبانِ شب اوست
دو گیتی را فروغ از کوکب اوست
نشانِ مرد حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

مرد حق کی شب کے گریبان میں کئی صبحیں پوشیدہ ہیں، اس (کی تقدیر) کے ستارہ سے دونوں جہان روشن ہیں۔ مرد حق کی پہچان اور کیا بتاؤں، موت کے وقت اس کے لبوں پر تبسم ہوتا ہے۔

ډیر ئے دی د شپے په ګریبان کښې سحرونه
ځلند ئے د مخ له ستوری دواړه جهانونه
مړ د چه وی د حق، نوره ئے څه نخښنه اوښایم
شونډو کښې مو سیز ی د مرګی په چپاوونه

ترجمے کا مطلب :۔ اس کی گریبان شب میں بہت سی صبحیں پوشیدہ ہیں، اس کے ستارے جیسے چہرے سے جہانِ دو روشن ہیں، مرد حق کی اور کیا نشانی بتاؤں، موت سے اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔

﴿۔۔۔بامحاورہ تراجم۔۔۔﴾

مترجم شاعر نے حتی الوسع اصل الفاظ کے متبادل تلاس کئے ہیں اور پشتو کے دامن شعریت کے بے کنار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ترجمے میں بہت کم اصلی قافیے مستعمل ہیں جو درج ذیل ہیں افسون، بتولؓ (فاطمہؓ)، بہزادی، ناصبور، بے حضور، بے کلاہ، خانقاہ، رعشہ دار، پائیدار، رہ نشین، آتشین، دوام، ارغوانی، نہانی، نامحرم، زمزم، گلیم، نسیم، غارت گری، آب، بہا، اندرون، خرد پرور جنون۔ ذیل میں وہ امثلہ پیش کی جارہی ہیں جو بامحاورہ ترجمہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ شاعر نے بامحاورہ ترجمہ کر کے نہ صرف کمال دکھایا ہے بلکہ بعض دلکش اضافے بھی کئے ہیں۔

نگویم از فرو فالے کہ بگزشت
چہ شود از شرح احوالے کہ بگزشت

(۱) ارمغانِ حجاز پشتو، ص ۹۵

چراغے داشتم در سینہ خویش

فرداندر دو صد سالے کہ بگزشت

میں اپنی عظمت رفتہ کی بات نہیں کرتا، جو حالات گزر چکے، انہیں بیان کرنے سے کیا حاصل (مگر دکھ اس بات کا ہے کہ) میں اپنے سینے کے اندر جو (عشقِ رسول پاک ؐ) چراغ رکھتا تھا، گزشتہ دو صدیوں میں وہ بھی بجھ گیا ہے۔

نه وایم زما هغه د بدب جلال چه تیر شو

سودئے شرح اوس نه لری هغه حال چه تیر شو

مړه شوه دوه صدئی کښې ، وه ډیوه چه مے سینه کښې

وار د تیرو راغلو خود ، هغه جمال چه تیر شو(1)

چوتھا مصرعہ "جب جمال کا دور گزر گیا تو خود خود ظلمت کی باری آگئی " اضافی ہے، لیکن یہ اضافت وضاحت کا درجہ رکھتی ہے جو اصل پر بار گراں نہیں۔

بآں رازے کہ گفتم ، پے نبردند

ز شاخِ نخل من خرما نخوردند

من اے میر امم داد از تو خواہم

مرا یاراں غز لخوانے شمردند

میں نے اپنے کلام میں جو راز بیان کیا، لوگوں نے اس تک رسائی نہ پائی، انھوں نے میرے نخل (کلام) کی شاخ سے پھل نہ کھائے، اے شاہِ اممؐ! میں آپ سے انصاف طلب ہوں، کہ دوستوں نے مجھے غزل خواں جانا۔

هیچا مے غوږ کښینهٔ بنو په راز او په بیان

نه مے چا په شاخ کړه ، خرما خوبنه، نه په خوان

اے د امتونو مشره ! داد د تانه غواړم

دے یارانو او شمیر لم زه یو غزلخوان

دوسرے مصرعے میں مترجم نے خوان کا لفظ زائد استعمال کیا ہے اور داو کے پشتو لفظ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

زند آں نغمہ کز سیرابئی او

خنک دل در بیابانے تواں زیست

اس نے ایسا نغمہ گایا ہے جس کی سیرابی سے، صحرا میں بھی دل کی ٹھنڈک سے زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔

---

(1) ارمغان حجاز پشتو ص ۵۴

داسے نغمه کاندی چه دهغے له مرِ بنته

یخ تتر به او پائی انسان په بیا بان (۱)

ترجمہ بامحاورہ ہے، "یخ تتر" نے ترجمے کو دلفریب بنادیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

من وملا ز کیش دین دو تیریم

بفرما بر ہدف او خوردیا من؟

میں اور ملا ترکش دین کے دو تیر ہیں۔ آپ ہی فرمائیں کہ نشانہ پر وہ لگا ہے یا میں

مونږ یو دوه غشی په ترکش ددین کښی دواړه

سینځ دګل زیړئ اووایه، ده، که ماویشتلے (۲)

" سینځ دګل زیړئ ویشتل" دوسرے مصرعے میں پشتو محاورہ ہے، جس نے ترجمے کو معیاری اور دلکش بنادیا ہے۔ "صوفی وملا" میں

ع قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

اور پھر سے (دوراول کی سی) قیامتیں برپا کردے۔

بیا دِ هغه تیر قیامتونه جوړ کړه ځوانه (۳)

ترجمے میں (ځوانه) اے جوان! اضافی ہے "پیام فاروق" کا شعر ملاحظہ ہو :۔

درخشِ اوتہِ ایں نیلگوں چرخ

چوتیغے از میاں بیروں کشیده

اس نیلگوں آسمان کے نیچے، اس کی چمک یوں ہے۔ جیسے میان سے کھینچی ہوئی تلوار۔

وی ئے د آسمان لاندے بریښنا لکه د تندر

داسے لکه تیغ چه وی له میانه راوتلے (۴)

ترجمے میں تندر (کڑک) اگرچہ اضافی ہے لیکن پھر بھی ترجمہ دلکش اور دلفریب ہے۔

"شعرائے عرب" :۔

بجا نہا آفریدم ہائے وہورا

کفِ خاکے شرر دم کاخ وکورا

شود روزے حریف بحرِ پُر شور

ز آشوبے کہ دا دم آبجورا!

---

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۳۳ (۲) ایضاً ص ۶۶

(۳) ایضاً ص ۱۰۳

(۴) ایضاً، ص ۱۱۱

میں نے مسلمانوں کی زندگی میں شور عشق بپا کر دیا ہے، میں نے دنیوی مال و متاع کو مٹھی بھر خاک (کی مانند بے وقعت) قرار دیا ہے۔ میں نے (ہندی مسلمان کی) اس چھوٹی سی ندی کو جو طوفان عطا کیا ہے، اس سے یہ ایک روز بحر پُر شور کی حریف بن جائے گی۔

زړونو کښې د خلقو هائے وهوئے راپیدا ماکړو
غر محل مے شمیر د موټے خاورو په بها کړو(ا)
بحر ډک د شور سره حریف په یوه ورځ شي
هغه شورو شر چه په سینه کښې مے پیدا کړو(۱)

میں نے لوگوں کے دلوں میں ہائے وہو پیدا کر دیا۔ میں نے پہاڑ محل کو مٹھی بھر خاک کی مانند قرار دیا۔ وہ شور و شر جو میں نے سینہ میں بپا کر دیا، ایک دن بحر پر آشوب کا حریف بن جائے گا۔

"کو" بمعنی کوچہ، گلی، محلہ ہے۔ مترجم نے "کوہ" کے معنی میں استعمال کر کے غلط فہمی پیدا کر دی۔ اس کے علاوہ لفظی ترجمہ کر کے مطلب مبہم پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ ذیل میں ایسے لفظی تراجم کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

---لفظی تراجم---

"ترک عثمانی" کی آخری رباعی :

بہ ترکاں آرزوے تازہ دادند
بنائے کار شاں دیگر نہادند
ولیکن کو مسلمانے کہ بیند
نقاب از روئے تقدیرے کشادند

ترکوں کو (مغربیت کی) نئی آرزو دی گئی ہے۔ ان کے کام کی مختلف بنیاد رکھی گئی ہے۔ لیکن (ان میں) ایسا مسلمان کہاں ہے، جو یہ دیکھے کہ (اسلام کے دورِ نو) کی تقدیر سے پردہ ہٹا دیا گیا ہے۔

ورئے کړۀ ترکانو ته څه نوی ارمانونه
جوړ ئے خپل کردار سره کړۀ نوی بنیادونه
هوا خوولے کوم داسے ستم دے چه اووائی
لرے ئے د مخ نه د تقدیر کړۀ نقابونه(۲)

ترجمے میں "ستم" کی جگہ "مسلم" چاہیے، اس کے علاوہ ترجمہ مبہم اور پیچیدہ ہے۔ حصہ "حضور عالم انسانی"

---

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۱۱۴
(۲) ایضاً، ص ۱۲۹
(ا) غر بمعنی پہاڑ جو شاعر نے "کو" کا متبادل لایا ہے جو کہ غلط ہے۔

برون کن کینہ را از سینہ خویش

کہ دودِ خانہ از روزن بروں بہ

اپنے سینے سے کینہ باہر نکال دے، گھر کا دھواں روزن سے باہر نکال دینا ہی بہتر ہے۔

اوباسه کینه دِ له سینے ، چه دود د خونے

ښه وی بلا ښه ، د دریچے په لار وتلے(۱)

شاعر نے "دود" استعمال کر کے ترجمے کو مشکل بنادیا ہے۔ "حضور حق" کی آخری رباعی ملاحظہ ہو۔

بدن واماند و جانم در تگ و پوست

سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز

کہ من دارم ہوائے منزل دوست

بدن تھک چکا ہے، مگر جان ابھی تک اس شہر (مدینہ منورہ) کی جانب رواں دواں ہے، بطحا (مکہ مکرمہ) جس کی راہ میں ہے۔ آپ یہاں (حرم شریف) میں اپنے خاص بندوں سے صحبت رکھیں، میں تو اپنے محبوبؐ کے شہر کی خواہش رکھتا ہوں۔

تن ضعیف خوروح زما دے په رفتار

هغه ښار ته، چه بطحائے ده په لار

ته هم دلته د خاصانو سره عیش کړ

زهٔ روان یم تر سنزل د ښکلی یار(۲)

یہاں "کړ" کی جگہ "کړه" چاہیے۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ خواص اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور عامی میرے لیے ہیں۔ جب تک اس حدیث شریف کی طرف توجہ نہیں جاتی ترجمہ مبہم ہے اور عام فہم نہیں۔

"حضور رسالت" میں :۔

بصدقِ فطرتِ رندانۂ من

بسوزِ آہِ بیتابانۂ من

بدہ آں خاک را ابرِ بہارے

کہ در آغوش گیرد دانۂ من

میری فطرتِ رندانہ کے صدقہ میں، میری آہِ بے تاب کے سوز کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اس خاک کو جو اپنے اندر میرے افکار کی روح سمولے، ابر بہار عطا فرمائے!

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۱۶۵

(۲) ایضاً، ص ۲۳

ستا قسم درندو پہ سپیخلی طبیعت
ستا قسم زما پہ اسویلو د محبت
راولہ وریځ د پسرلی پہ هغو خاورو
غیږ ه کښې زما دانہ رانیسی پہ الفت(۱)

تجھے روشن فطرت رندانہ کی قسم، تجھے میری آہ محبت کی قسم۔ اس خاک پر ابر بہار بھیج، جو میری آغوش میں محبت سے دانہ پکڑے ---ترجمہ لفظی ہے اور محبت کا لفظ بھی زاید ہے۔ جس نے مطلب کو پیچیدہ بنادیا ہے۔ حصہ "حضور عالم انسانی" کی امثلہ ملاحظہ ہوں۔

الا اے کشتۂ نامحرمے چند
خریدی از پئے یک دل غمے چند
زتا و یلاتِ ملایاں نکوتر
نشستن باخود آگاہے دمے چند

سن! اے چند نامحرموں کے مارے ہوئے (فرنگی پروفیسروں کو اسرار جان سے نامحرم کہا ہے) تو نے (مغربی تعلیم کے ذریعہ) اپنے ایک دل کے لیے سینکڑوں تفکرات خرید لیے ہیں۔ کسی اللہ والے کے پاس چند لمحے بیٹھنا، ظاہر علوم کے ماہرین کی نکتہ آفرینیاں سننے سے کہیں بہتر ہے۔

اے هغہ چہ تہ نامحرمانوئے وژلے
یو زړہ لہ کړے دِ د غمونو دے پیرلے
ډیر ښہ ئے صحبت دے د ملا لہ تاویلونو
حو لحظے د هغو، چہ ئے ځان دے پیژندلے(۲)

لفظی ترجمے نے فلسفہ اقبال کو مشکل بنادیا ہے حصہ "بہ یارانِ طریق"

دوصد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگ سمن گفت!
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت!

اس محفل (دنیا) میں سینکڑوں داناؤں نے، برگ سمن سے نازک تر باتیں کہی ہیں۔ لیکن مجھے بتا کہ وہ صاحب نظر کون ہے، جس نے کانٹے دیکھے اور چمن اسلام میں آنے والی بہار کی خبر دی۔ (اپنے متعلق کہہ رہے ہیں)۔

دوۀ سوۀ هوښیارو دے محفل کښې سخن اووے
لائق تر ے نازک، لکہ چہ برگ دسمن، اووے

(۱) ارمغان حجاز پشتو ص ۱۷۶ (۲) ایضاً، ص ۱۵۸

اووایه لیکن ماته ، هغه سترګه ورخوګ دے ؟

وڼے کتل اغزی ته، حال ئے تول د چمن اووے (۱)

لفظی ترجمے سے پہلا اور آخری مصرع مشکوک ہو کر رہ گئے ہیں۔ دو سو داناؤں نے اسی محفل میں باتیں کہی ہیں۔ کانٹے کو دیکھ کر چمن کا سارا حال بتادیا۔ اس لیے ترجمہ میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

دو صد بو حامد و رازی نیمر زد

بنادانے کہ چشمش راہ بین است!

اس ان پڑھ کے سامنے سینکڑوں غزالیؒ اور رازیؒ ہیچ ہیں، جس کی آنکھ سیدھی راہ دیکھتی ہے۔

دوه سوه رازی او بوحامد ئے سیالان نه دی

هغه یو ناپوهه چه لیدے شی خپله لار (۲)

اس نادان کی جو اپنی راہ دیکھتا ہے دو سو رازی اور بو حامد ہم سری نہیں کر سکتے۔ ترجمہ لفظی ہے۔ مگر اس سے غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔

مئے من گرچہ ناصاف است درکش

کہ ایں تہ جرعۂ خمہائے دوش است!(i)

اگرچہ میری شراب اتنی صاف نہیں مگر اسے پی جا، کیونکہ یہ قدیم (دور اسلام) کے خموں کی بچی ہوئی شراب کا آخری گھونٹ ہے۔

ډیر هم که خیرنه ناصفا ده ته ئے اوڅښنه

خته د پرون د خم ، لری دغه صهبا

اگرچہ بہت ناصاف ہے لیکن اسے پی جا، کہ یہ شراب کل کی صراحی کی مٹی رکھتی ہے۔ شاعر نے تہِ جرعہ کا مطلب مٹی لیا ہے۔ جس سے شعر کا مطلب واضح نہیں ہو سکتا۔ ذیل میں مشکل تراجم کا نمونہ دیکھیں۔

---مشکل تراجم---

بسوزد مومن از سوزِ وجودش

کشودِ ہر چہ بستند از کشودش

مومن اپنے وجود کے سوز سے جلتا ہے، ہر سربستہ راز اسی کے ہاتھوں کھلتا ہے۔

سوزی پرے مومن چه ئے خپل تاو دے په وجود کښ

دے کشود د هرے غوټے هم د ده کشود کښ (۳)

دوسرے مصرعے کا ترجمہ کشود نے ترجمہ کو بعید از فہم اور مشکل بنادیا ہے۔ نظم "حضور رسالت" پہلی رباعی

خرد از راندنِ محمل فروماند

زمامِ خویش دادم در کفِ دل!

(۱) ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۱۹۲ (۲) ایضاً، ص ۱۹۶ (۳) ایضاً، ص ۲۰۷ (i) جرعہ (عربی لفظ) گھونٹ

عقل، محمل کو ہانکنے سے عاجز آچکی ہے، اب میں نے اپنی مہار دل کے ہاتھ میں دے دی ہے۔

عقل کجاوه په مخکښ نه بوزی عاجز شو
اوس مې قيزې خپلې کړې دزړه پهلاس کښې ورا(۱)

"قیزے" نے ترجمے کو مشکل بنادیا ہے، اس لیے اس کے مترادف کی ضرورت ہے۔

مرا در عصرِ بے سوز آفریدند
بخاکم جانِ پر شورے دمیدند
چونخ در گردنِ من زندگانی
توگوئی بر سردارم کشیدند!

مجھے اس بے سوز دور میں پیدا کیا، پھر میری خاک (بدن) میں پُر شور جان پھونک دی، میری گردان میں زندگی پھندے کی مانند پھنسی ہوئی ہے۔ گویا مجھے تختہ دار پر چڑھادیا گیا ہے۔

زهٔ ئې په بې سوزه زمانه کښې آفريده کړم
دک له شوره روح ئې، زهٔ له خاورو دميده کړم
ژوند ئې هسې راکړو لکه بيا سته مې په خټ کښې
ته به داسې وائې چه په دار ئې کشيده کړم(۲)

آفریدہ، دمیدہ اور کشیدہ قوافی نے ترجمے کو مشکل بنادیا ہے۔ حصہ "حضور ملت" میں یہ مصرع :۔

نسازد جز بہ بوہائے رمیدہ

انہی خوشبوؤں کو سینے سے لگائے رکھتی ہے جو ختم ہو چکے ہوں۔

دهٔ سره جوړيږی الوتلی نکهتونه (نکھتونہ قارئین کے لیے مشکل ہے)۔

حصہ "بہ یاران طریق" میں یہ شعر

ترا باخرقہ و عمامہ کارے
من از خود یافتم بوے نگارے

تو گدڑی (پیروں) اور دستار (عالموں) پیچھے بھاگتا ہے، مگر میں نے اپنے آپ سے محبوب کی خوشبو پائی ہے۔ پشتو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ستا که د چپنې د منډو سره کار دے
ماته له خپل ځان راغلې بوئ ديو نګار دے (۳)

ترجمے کو چپنے، منډو سہ اور نگار نے مشکل بنادیا ہے۔ "حضور رسالت" میں یہ شعر :۔

نگاہے داشتم بر جوہر دل
تپیدم آرمیدم در برِ دل

---

(۱) ارمغان حجاز پشتو ص ۲۷ (۲) ایضاً ص ۲۹ (۳) ایضاً ص ۱۹۸

میں اپنے دل کے جوہر پر نگاہ رکھتا تھا، میں تڑپا تو دل کے پہلو میں اور آرام پایا تو دل کے پہلو میں۔

مابه نظرونو کښې ساته جوهر د زړه

سومه یشیدم پرقیدم لروبر د زړه(۱)

میں جوہر دل پر نگاہیں رکھتا تھا، میں دل کے ارد گرد جلتا، جوش کھاتا اور بیقرار ہوتا۔

ترجمے میں "پرقیدم" (بیقرار ہونا) آرمیدم کا مترادف نہیں بلکہ متضاد ہے۔ اس لیے ترمیم کی ضرورت ہے۔

ے بصحرا بُردمش، افسردہ ترگشت

کنارِ آبجوئے زار بگریست

میں اسے (دل) صحرا میں لے گیا، مگر وہاں وہ زیادہ افسردہ ہو گیا، ندی کے کنارے وہ زارو قطار رویا۔

بوسے تلو صحرا ته هلته لازیاتی غمژن شو

لاړو د چینې په خوا کښې اوژړیدو زار(۲)

لفظی ترجمے نے ترجمے کو مشکل بنادیا ہے۔ جس سے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ "حضور ملت" کے جزو "رومی"

ع مئے روشن ز تاکِ من فرو ریخت

(میرے انگور سے روشن شراب ٹپک رہی ہے)

تاک نه نے زما ځلند شراب اوبیاوۀ

" تاک" نے ترجمے کو مشکل بنادیا ہے۔ مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔ کورخه ئے زما۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ مشکوک تراجم ۔۔۔

ذیل میں ایسے تراجم پیش کئے جارہے ہیں۔ جو مشکوک اور مبہم ہیں جن کی تصحیح لازمی ہے۔

ع دلم سوز دآہ صبحگاہی

زړه مے سوزوی دنیمې شپې په اسویلو(۳)

مترجم نے آہ صبحگاہی کو بمعنی آہیں آدھی رات کی، استعمال کیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

زړه مے سوزوی د صبائی په اسویلو

تواں اسرار جاں را فاش ترگفت

بدہ نطقِ عرب این اعجمی را

جان کے اسرار اور زیادہ کھول کر بیان کئے جاسکتے ہیں، اگر آپؐ اس عجمی اقبال کو اہل عرب جیسی قوت گویائی فرمادیں۔

---

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۲۸

(۲) ایضاً، ص ۲۸

(۳) ایضاً، ص ۳۲

ویلے شی د روح اسرار ددے نہ زیات پہ سپینہ

دے عجم تہ ورکړے کہ تۀ نطقِ عربی(۱)

عجم کی جگہ عجمی چاہیے، اس کے علاوہ "نطقِ عربی"، مشکل ترکیب ہے۔ اس لیے پشتون جو فارسی عربی زبان سے ناواقف ہیں اس قسم کے ترجمے سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند

گریبانِ شہنشا ہاں دریدند

چوں آتش درونِ سینہ افسرد

مسلماناں بدرگاہاں خزیدند!

جب تک فقرا مساجد میں صف آرا رہے، انکے ہاتھ شہنشاہوں کے گریبانوں تک پہنچتے رہے۔ مگر جب دلوں کے اندر کی آگ بجھ گئی، تو مسلمان خانقاہوں میں جا کر بیٹھ گئے۔

کلہ پہ مسجد کښې صف پہ صف چہ فقیران شول

تول شہنشاھان د دوئ لہ لاس خیرے گریوان شول

مرچہ ھغہ اورشو چہ ئے بل وو پہ سینو کښې

بیا پہ دربارونو کښې راښکے مسلمانان شول(۲)

مسجد کی جگہ "جمات" چاہیے۔ چوتھا مصرعہ (پھر دربارونو) میں مسلمان بے عزت ہوتے رہے) غلط ہے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

بیا پہ درگاھونو کښې پراتۀ مسلمانان شول

من اندر مشرق و مغرب غریبم

کہ از یارانِ محرم بے نصیبم

میں مشرق و مغرب میں اجنبی ہوں کیونکہ یارانِ رازدان سے محروم ہوں۔

دخاتۀ ترپریوتۀ زۀ خوار اوغریب یمہ

ځکہ بے نصیبہ چہ لہ ھغو یارانو یمہ(۳)

میں مشرق سے مغرب تک خوار وزار اور مفلس ہوں۔ شاعر نے غریبم (اجنبی) کو مفلس کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو کہ غلط ہے۔

دریں عالم بہشتِ خرمے ہست

بشاخِ او زاشکِ من نمے ہست

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۴۸

(۲) ایضاً، ص ۵۰ (۳) ایضاً، ص ۷۰

اسی دنیا میں ایک سرسبز وشاداب بہشت موجود ہے، جس کی شاخون پر میرے آنسوؤں کی نمی ہے۔

شته په دے دنیا کښې یو جنت چه بنهٔ خرم دے

ګرځي په هر ښاخ کښې ئے، زما د وینو نم دے(۱)

مترجم نے اشک بمعنی خون (وینو) استعمال کیا ہے جو کہ غلط ہے، اس لیے دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

ګرځي په هر ښاخ کښې ئے، زما د اوښکو نم دے

بہر حالے کہ بودم خوش سرودم

نقاب ازروئے ہر معنی کشودم

میں جس حال میں بھی تھا خوب نغمہ سرائی کی، میں نے ہر راز حیات کے چہرے سے پردہ ہٹایا

ووم چه په هر حال کښې خوخوشحال ؤمه ډیر ښهٔ ووم

وړو مے چه نقاب د هر معنٰی له مخه زه ؤم(۲)

مترجم نے "خوش سرودم" کے معنی "میں خوشحال اور بہت اچھا تھا"، کیے ہیں جو کہ غلط ہیں۔ اس لیے اس طرح ہونا چاہیے۔

وم چه په هر حال کښې خوخوشحاله نغمه زن ؤم

حصہ (شعرائے عرب):۔

بگو از من نواخوانِ عرب را

بہائے کم نہادم لعلِ لب را

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم

سحر کردم صدوسی سالہ شب را

عرب کے شعرا کو میری طرف سے کہہ دو، میں نے لب لعلین (روایتی محبوب) کو بہت کم اہمیت دی ہے۔ البتہ اس نور سے جو میں نے قرآن پاک سے حاصل کیا ہے، میں نے (ہندی مسلمان کی) ایک سو تیس سالہ لمبی رات کو صبح میں تبدیل کر دیا ہے۔

پوئے زما د خوا کړه سندر غاړی د عرب

مائے بها کمه کړله لعل چه وو دلب

ما په هغه نور چه مے حاصل کړو له قرآنه

سپین سحر کړو جوړ د سل اتیاؤ کالو شب(۳)

دوسرا مصرع "لعل چه وو دلب" پیچیدہ ترکیب ہے۔ اسکے علاوہ "صدوسی" کا ترجمہ سواسی کر دیا ہے جو کہ غلط ہے۔

حصہ "بہ یاران طریق"

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۷۲

(۲) ایضاً، ص ۸۰ (۳) ایضاً، ص ۱۱۴

نگاہے آفریں، جاں در بدر بیں
بشاخاں نا دمیدہ یاسمن بیں
وگرنہ مثل تیرے در کمانے
ہدف را با نگاہ تیر زن بیں

اپنے اندر ایسی نگاہ پیدا کر، جو بدن میں موجود جان کو دیکھ لے، جو ان اُن کھلے پھولوں کو دیکھ سکے، جو ابھی شاخ کے اندر ہیں، یا پھر کمان پر چڑھے ہوئے تیر کی مانند، تیر زن کی نظر سے ہدف دیکھ۔

اوزیگو نظر په تن کښې اُووینه خپل ځان
هغه ګل چه نه دے لا د شاخه نمایان
اوکه نه، په شانے د یو غشی په لینده کښې
راشه په نظر د تیر انداز، اوله نشان(۱)

پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

پیدا که دِ نظر په تن کښې اووینه خپل ځان

"حضورِ ملت" میں

ع کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

(جس کا دہقاں دوسروں کے لیے کھیتی بو تا ہے)

خپل ملک ئے دهقان چه بل دپاره اوکرلو(۲)

مترجم شاعر نے کشت کو بمعنی ملک استعمال کیا ہے۔ مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

خپل پټے دهقان چه بل دپاره اوکرلو

---ارمغانِ حجاز (اردو)---

نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں مترجم شاعر نے لفظی ترجمہ کا سہارا لیکر فلسفۂ اقبال واضح نہیں کیا۔ زیادہ تر اصل قوافی اور الفاظ کو استعمال کر کے پشتو الفاظ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ دنیائے دوں، خون، کاف و نون، افسون، جنون، درون، سرنگون، قیام خام، غلام، علم الکلام، بے نیام، خود نگر، اضطراب، طناب، بے حجاب، روزگار، شرمسار، آشفتہ، غبار، کوہسار، مدار، جیسے قوافی و الفاظ اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں۔

نظم تصویر و مصور، میں دیدہ ور، جہاں بینی، خرد، جاویدانی، تنگ و تاز، سوز، تب و تاب، جیسے اصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نظم "عالم برزخ" میں :۔

---

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۱۹۳ (۲) ایضاً، ص ۹۳

الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر

اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک!

لرے د غلام له مړی، سل کرته لرے!

لرے مے اسرافیله! جبرائیله ! خدایه پاکه(۱)

الحذر کے معنی خوف کے ہیں لیکن مترجم نے "دور رکھ"، کے معنوں میں استعمال کیا لیکن یہ بھی مفہوم میں خلل انداز نہیں۔ مگر جبرائیل، اضافی ہے جو مترجم کی اپنی اختراع ہے۔ اسی طرح ایک مصرع :۔

کیوں نہیں ہوئی سحر حضرتِ انساں کی رات

شپه د انسان ولے صباکیزی نه هیهات

(اس ترجمے میں هیهات کا لفظ اضافی ہے لیکن شاعر نے ترجمے کے قوافی کو مد نظر رکھنے کے لیے خانہ پری سے کام لیا ہے۔ نظم "مسعود مرحوم" میں :۔

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمر گریزپا کیا ہے؟

کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے؟

میں انسانی زندگی کی حقیقت سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمیں تو انسانی زندگی بالکل دھوکہ یا شعبدہ نظر آتی ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

مه پښته چه عمر، تېښتېدونکی بلا، څه ده

حوک له دے خبر چه دانیرنگ وسیمیا څه ده(۲)

شاعر نے نیرنگ وسیمیا کے ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جس نے ترجمے کو پیچیدہ اور مشکل بنادیا ہے۔ اس طرح ایک دوسرا شعر :۔

نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم

دو صد ہزار تجلی تلافیٔ مافات

چرے که نظر د یو بریښنانه هم محروم وی

دوه لکه جلوے ئے تلافی شی دمافات (۳)

مترجم نے تلافی اور مافات کے پشتو الفاظ کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لیے ترجمہ عام فہم نہیں ہے شعر کی تشریح کچھ اس طرح ہے۔ اے مسلمانو! یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا فیض بند ہو چکا ہے اور آئندہ کوئی سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی پیدا نہیں ہوگا۔ نہیں تمہارا یہ قیاس بالکل غلط ہے اگر تم نے اپنی غفلت کی بنا پر اپنے آپ کو ایک تجلی سے محروم کر دیا تو افسردہ یا آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی تجلیات تو ہر لحظہ بارش کی طرح دنیا اور دنیا والوں پر نازل

(۱) ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۲۳۷ (۲) ایضاً، ص ۲۴۴ (۳) ایضاً، ص ۲۴۶

ہوتی رہتی ہیں، تم اولین فرصت میں ان سے استفادہ کی کوشش کرو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سرکارِ دوعالمؐ سے رابطہ محبت استوا رکھو۔ تلافیٔ مافات کے معنی کسی نقصان کا بدل ہونا یا معاوضہ دینا۔ "رباعیات " میں :۔

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری!

چارے چہ د گل پہ حفاظت بہ بریالی شی
ھغہ شو اغزی ،کہ چرے خوی ئے د حریر وی (۱)

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر!

کلہ تہ د سیند پہ نم راپورتہ شہ ښکارہ شہ
کلہ ددریاب پہ زړہ کښے ورک لکہ چپہ شہ
تیر شہ د ساحل نہ د دریاب ھم کلہ کلہ
لا دِ دَ خودئ مقام ښکارہ کړہ یو پہ دوہ شہ (۲)

پہلے اور آخری مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی تم نم دریا کی طرح ابھر کر ظاہر ہو جا۔ خودی کا مقام آشکار اکر کے دوگنا ہو جا۔ ترجمے میں "نم "اور " دوگنا" مشتبہ ہیں۔ شاعر نے نم یا تو رنگ یا طرح کے معنوی میں استعمال کیا۔ دوگنا استعمال کر کے شاعر نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ نظم "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" میں مترجم شاعر نے کلام اقبال کے اصل الفاظ و قوافی استعمال کیئے ہیں۔ سیماب، بیتاب، فراست، مئے ناب، مضمحل، ھمہ اوست، مفاجات، دیگری، ارجمند، اندرابی، بے حجابی نیم خوابی، آفتابی، تاک (انگور)، طربناک، نم ناک، میخانہ، کلیسانہ، یکدانہ، غمازی، راہبانہ محرمانہ، ساحرانہ، آستانہ، بے کرانہ، آشیانہ، دوشالہ، غزالہ۔ جہاں پر اصل الفاظ و قوافی مستعمل ہیں وہاں ترجمہ خوبصورت اور دلکش تو ضرور ہے لیکن پیچیدہ اور بعید از فہم ضرور ہو جاتا ہے۔

نظم "حسین احمد" :۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است!

---

(۱) ارمغان حجاز (پشتو)، ص ۲۵۳

(۲) ایضاً، ص ۲۵۵

لا خو په رموز د دین، عرب څه خبر نه دی
څه چه د دیو بند حسین احمد، بوالعجبی(۱)

شعر اس طرح ہونا چاہیے۔

لا خو په رموز ددین، عجم څه خبر نه دی
څه چه د دیو بند حسین احمد، بو العجبی

۔۔۔مثالی تراجم۔۔۔

"بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو":۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
ستا دشی روزی خپله هوا د بیابان
بنه ترے بخاراده، نه ډیلے د هندوستان(۲)
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
لا س کبنں د افرادو تل تقدیر وی د قامونو
فرد وی د ملت د نصیب ستوری، درخشان(۳)
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است
رسه مصطفیٰؐ وته چه دین خو بس هغه دے
او که نه وی دا، نو ده همه بولهبی(۴)

(۱) ارمغان حجاز پشتو، ص ۲۸۷
(۲) ایضاً، ص ۲۲۹
(۳) ایضاً، ۲۳۰
(۴) ایضاً، ص ۲۷۸

۔۔۔ذیل میں املا کی اغلاط ملاحظہ ہوں۔۔۔۔

صفحہ	غلط	صحیح	صفحہ	غلط	صحیح
۳۲	راووری	راوٗروی	۲۰۳	شَل	سل
۶۳	بے سوزہ	بے سودہ	۲۴۲	تا	تاؤ
۹۸	لے	لبے	۲۶۳	غہ	دغہ
۱۰۸	ګډا	ګدا	۲۸۰	ګل	ګُل
۱۱۱	تہریدے	تړپیدے			
۱۷۱	اڑ تاو	ار تاؤ			

اکثر مثالی تراجم اصل قوافی والفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن حمزہ بابا نے اصل قوافی سے قطع نظر کر کے پشتو شعریت کی وسیع النظری کا ثبوت بہم فراہم کیا ہے۔ لفظی ترجمہ ہونے کے باوجود بھی ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ فکری بلندی، شعر و نظر میں وسعت اور فارسی زبان وادب پر دسترس نے مترجم کے قلم میں وہ روانی پیدا کی جس نے انہیں فہرست مترجمین اقبال میں اہم مقام دلایا ہے۔ بلکہ یوں کہنا بے جانہ ہوگا کہ وہ انہیں میں سر فہرست ہیں۔

بعض مقامات ایسے ہیں جن میں بامحاورہ ترجمہ اور اضافیات کر کے ترجمے کو بے حد خوبصورت اور دلنشین بنادیا گیا ہے۔ روزمرہ و محاورہ زبان وادب کی زیبائش اور شعر کا زیور ہے۔ مترجم نے پشتو اشعار کو اس زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے کلام اقبال کو دلکش رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی مترجم بعض اوقات تزلزل کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ قافیہ پیمائی کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور بعض الفاظ کے پشتو ترجمہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح ترجمہ پیچیدہ، مشکل اور مبہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاعر بعض الفاظ میں غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ترجمے کا مفہوم ہی غلط ہو گیا ہے۔ ایک لفظ کے غلط ترجمے سے شعر پر برا اثر پڑتا ہے اور ترجمہ پھیکا اور مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاعر نے اگر بعض اشعار یا الفاظ کے ترجمے غلط کئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زبان وبیان پر قدرت ہی نہیں رکھتے۔ زبان ایک بحر بیکراں کی سی ہے جس میں مدوجزر بھی ہیں اور سینکڑوں بھنور و گرداب بھی۔ ماہی و نہنگ کا مسکن اور گوہر بیش بہا کے سربستہ خزانے۔ جوانی میں جہد پیہم کا مظاہرہ کرے اپنی منزل سے شناسا ہو جائے۔ مترجم نے الفاظ کی چھان پھٹک میں حتی الوسع کوشش کی لیکن انسان کا کلام مولانا حالی کے بقول غلطیوں اور کوتاہیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہی ہر عیب سے مبرا ہے۔ بایں سبب حمزہ شنواری کا ترجمہ غلطیوں سے کیسے مبرا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی ترجیے فن میں انہیں جو کمال حاصل ہے وہ کسی اور مترجم کے نصیب میں نہیں آیا۔ اس لحاظ ان کا ترجمہ کلام اقبال کے دوسرے مترجمین کی نسبت معیاری، بہر سرود سرور اور دلکش ہے۔

ترجمے میں زیادہ تر مشکلات اصل الفاظ و قوافی نے پیدا کئے ہیں۔ مترجم اور نظر ثانی کرنے والے تقویم الحق کاکاخیل نے بڑے خلوص و محبت سے کام کیا ہے۔ اس ترجمے میں قارئین اصل جیسی لذت پائیں گے۔ ترجمہ اصل کے اس قدر قریب ہے کہ ترجمہ ہی دکھائی نہیں دیتا۔

حمزہ کی بصیرت، فکری بلندی اور فنکاری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان خوبیوں نے ارمغانِ حجاز کے ترجمے کا معیار بلند کر کے اصل کے برابر لایا ہے۔

ب

کتاب :۔ جاوید نامہ ۱۹۳۲ء

مترجم :۔ امیر حمزہ شنواری

ناشر :۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سن اشاعت :۔ نومبر ۱۹۶۷ء

ضخامت :۔ ۲۴۶ صفحات

---جاوید نامہ---

جاوید نامہ علامہ اقبال کے اسلامی تصوف اور حقائق و معارف کی بزبان فارسی وہ کلام ہے، جو فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ یہ بلاشبہ فارسی ادبیات میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور اگر ادبیات عالم میں اس کی نظیر مل سکتی ہے تو وہ دانتے کی "طربیہ ایزدی" ہے (Divine Comedy)۔ یہ علامہ کی وہ لازوال تصنیف ہے جو ان کے شاعرانہ کمالات، فلسفیانہ خیالات کا بہترین نمونہ اور ان کی زندگی کا حاصل ہے۔ اس کا رنگ ساری تصانیف کے رنگ سے جدا ہے، یہ ایک طویل تمثیلی نظم ہے، جس میں شاعر نے (جہان دیگر) افلاک اور آں سوئے افلاف دونوں کی سیر کی ہے، بلکہ خدا سے بھی ملاقات کی ہے۔ فلسفیانہ نظم ہونے کے باوجود بھی ادبی لطافتوں سے معمور ہے، کلام میں پختگی، شیرینی، روانی اور سوز و گداز بھرا ہوا ہے۔ فلسفیانہ مباحث میں غزلیات کی چاشنی بھی موجود ہے اور سارا کلام رجائیت کی روح سے معمور ہے۔ اقبال کا مطمح نظر یہ ہے کہ حیات و کائنات کے ان لاتعداد مظاہر کی حقیقت صرف ایک ذات ہے جو واجب الوجود ہے۔

علامہ فراق میں حیات دوام دیکھتے ہیں، پیام مشرق اور زبور عجم کے علاوہ جاوید نامہ میں پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ عشق اور جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین ہے۔ نوجوان ہی کسی انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں اسلیے نوجوانوں کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ اقبال پیرانِ کہن سے متاثر ہیں۔ وہ سنائی، عطار، رومی، جامی اور عراقی کے کلام سے جس قدر مستفید ہوئے، اس کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کیا، اس لیے شاعری اور پیغبری کی سرحدیں اس کتاب میں مل گئی ہیں۔ نوجوانوں میں جذبۂ طلب پیدا کرنے کے لیے کتاب کا آخری حصہ وقف ہے۔ زمان و مکان پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اقبال نے "رمز دین مصطفےٰ" کا نسخہ پیش کیا ہے۔

جاوید نامہ دراصل معراج نامہ ہے۔ اسرار و حقائق معراج محمدیہؐ پر کتاب معراج نامہ کی بجائے جاوید نامہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اسلامی روایت معراج کے دنیا میں مشہور ہونے سے چھ سو سال بعد ڈینٹے (دانتے) نے اپنی تخیلی معراج کے مشاہدات کی صورت میں اُس زمانہ کے علوم وفنون پر تبصرہ کیا۔ ڈینٹے کی موت سے چھ سو سال کے بعد اقبال کا جاوید نامہ شائع ہوا جاوید نامہ کو ہم روایتِ معراج کا تیسرا ادبی نمونہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ "فتوحات مکیہ" (ابن عربی کا) پہلا اور ڈیوائن کامیڈی دوسرا نمونہ ہے۔

جاوید نامہ کا آغاز مناجات سے ہوا ہے۔ حقائقِ حیات کے متعلق متفسرانہ انداز میں ذات باری تعالیٰ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ہر مصرع اور ہر شعر تعلق ولایت پر دال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اپنے مقاصد کو حاصل نہ کرلے گا خدا کا پلہ نہ چھوڑے گا۔ پرانی نسل سے قطعاً ناامیدی ہے۔ آئندہ نسلوں کو آغوش میں لینے کی تمنا ہے۔

"تمہید آسمانی" میں آسمان کی زبان سے زمین کو طعنہ دیا گیا جسے سن کر زمین خجل ہو گئی اور اس نے اپنے دردِ بے نوری کا شکوہ خدا سے کیا۔ "تمہید زمینی" میں سیاحت ساوی کا آغاز ہوتا ہے اس کے آخر میں مولانا رومؒ کی زبان سے معراج کی تشریح کی گئی ہے۔ زمان و مکان کے موجودہ تخیلات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فلک قمر سے سیاحت شروع ہوتی ہے۔ غار قمر میں عارف ہندی سے ملاقات ہوتی ہے۔ رومی اقبال کا تعارف کراتے ہیں اور اقبال کا امتحان لینے کے بعد عارف ہندی انہیں حقائق و معارف سمجھاتا ہے۔ اس کے بعد وادئ یرغمید میں رومی اقبال کو شعر، شاعری، شاعر اور پیغمبر ی کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں۔ "فلک عطارد" میں روس کے نام افغانی کا پیغام سن کر رومی نے ایک جگر دوز آہ کھینچی۔ رومی نے سعید حلیم پاشا اور جمال الدین افغانی کی زبان سے جو کچھ سنا، اس پر ہر سچے مسلمان کا دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے رومی کے کہنے پر سوزناک غزل سنائی۔ فلک زہرہ پر خدایان کہن کی مجلس ہے۔ ان قدیم خداؤں میں سے ہر ایک اپنے از سر نو زندہ ہونے کے امکان پر ثبوت لا رہا ہے اور اس بات سے کہ یہ عہد پھر بے خلیل اور بے بت شکن ہو چکا ہے۔ بعل ایک نغمہ جو نوحۂ روح ابو جہل کا جواب ہے گاتا ہے۔ یہ نغمہ امید کا نغمہ ہے۔ اس نے جہاں بالواسطہ بت پرستوں کو تسلی دی وہاں اعلان کیا ہے کہ اٹھو اور پھر دنیا کو اپنا پرستار بنالو۔ فرعون، کچنر سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس باب کا اہم حصہ وہ پیغام ہے جو مہدی سوڈانی نے اقوام عرب و افریقہ کے نام دیا ہے۔

فلک مریخ پر اقبال اور حکیم مریخی میں تقدیر و تدبیر کا مکالمہ ہوتا ہے اور اقبال اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا ہے۔ اس میں تذکرہ نبیہ مریخ بھی ہے۔ یہ فرنگی لڑکی اپنی سحر پرور تقریر میں مردوں سے باغی ہو جانے کی تلقین کرتی ہے پھر شادی سے بچنے اور ماں بننے کی مصیبت سے بچنے کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔

فلکِ مشتری پر منصور حلاج، غالب اور ایران کی مشہور شاعرہ قرۃ العین کی ارواح جلیلہ ملتی ہیں۔ زندہ رود نے اپنی بعض مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے، انا الحق، غالب کے ایک شعر، مقام عبدہٗ اور رحمۃ للعالمینؐ کی بحث کے بعد ابلیس نمودار ہوتا ہے۔ نالۂ ابلیس میں ابلیسیت کو جو صدمہ آدمیت نے پہنچایا ہے اس کا گلہ ہے۔

فلک زحل میں بعض گزشتہ اور موجودہ ہندوستان کی سیاست زیر بحث آئی ہے۔ اس فلک کو شاعر نے بنگالی کے جعفر اور دکن کے صادق (جنہوں نے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سے غداری کی) کی ارواحِ رذیلہ کا مسکن بتایا ہے۔ اس کے بعد آنسوئے افلاک، پر ایک جہان دکھایا گیا ہے۔ جس کی سرحد پر حکیم المانوی نیٹشا نظر آتا ہے۔ اقبال نے اس کو مجذوب قرار دیا ہے اگر وہ مجدد الف ثانی کے زمانے میں پیدا ہوتا تو اپنے مقصود کو پالیتا۔ اس کے لبوں پر صدائے درد مند جاری ہے۔ وہ مقام عبدہٗ سے بیگانہ ہے۔

حرکت لجنت الفردوس :۔ مسافر کائنات کی حدود سے باہر جہان بے جہات میں قدم رکھتے ہیں۔ زمان و مکان اور دوزخ

وجنت سے متعلق نشیں کی گئی ہیں۔ قصر شرف النساء سب سے پہلے جنت میں نظر آیا۔ یہ نواب خالق بہادر خان کی بیٹی اور نواب عبدالصمد خان کی پوتی تھیں۔ جو صوبہ پنجاب کے یکےبعد دیگرے گورنر رہے ہیں۔ شرف النساء نے قرآن اور تلوار کو زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ اس کا جنت میں قصر، لعلِ ناب کا بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے مکالمات میں خطۂ کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل پر گراں بہا خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شاعر بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس منظر سے گزر کر نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور سلطان ٹیپو شہید سے ملاقات ہوتی ہے۔ ایرانیوں کے موجودہ رجحانات، ملت افغانیہ اور دریائے کاویری کے نام پیغامات شامل ہیں۔ اس کے بعد عین "حضور" میں حاضری ہے، تجلیٔ ذات کے مباحث ہیں۔ علم و عشق کے حقائق نئے الفاظ اور نئے انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ لذتِ دیدار سے بہرہ یاب ہو کر بارگاہِ سرمدی میں کچھ التجائیں کی ہیں مگر "ندائے جمال" نے جمالی انداز میں متنبہ کیا۔ ناگہاں تجلیٔ جلال نمودار ہوتی ہے اور شاعر کلیم اللہ کی طرح جلوہ مست ہو کر گر پڑتا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ "خطاب بہ جاوید" پر مشتمل ہے۔ نوجوانوں کے لیے حالات حاضرہ کی روشنی میں نصائح کا گراں بہا سرمایہ موجود ہے۔ (۱)

۔۔۔ترجمے کا تعارف۔۔۔

امیر حمزہ خان شنواری نے جاوید نامہ کو پشتو زبان کا منظوم، خوبصورت اور دلکش لباس زیب تن کیا۔ وہ عالم فاضل شخصیت تھے۔ تخلیقی فطرت اور خداداد فطانت کے سبب پشتو شاعری میں بلند مقام حاصل کیا۔ غزل کی دنیا میں پشتون ملت کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ تصوف، فلسفہ پر عبور رکھنے کے علاوہ اس کے عارفانہ رموز سے باخبر تھے۔ اس لیے جاوید نامہ میں چونکہ شاعری اور فلسفے کا امتزاج ہے آپ سے بہتر کوئی ترجمہ نہیں کر سکتا۔ چونکہ یہ ایک طویل تمثیلی نظم ہے اور جہان دیگر سے متعلق ہے اس لیے عامی کے لیے سمجھنا آسان نہ تھا۔ خواص ہی سمجھ سکتے تھے۔ پھر فارسی زبان کے ادب و فن اور شعر و سخن پر عبور رکھنا ضروری تھا۔ مزید برآں اقبال کی زبان جو رمز و کنایہ، تشبیہ واستعارہ اور فلسفے کی زبان ہے، کے سمجھنے کے لیے ادب، تاریخ، فلسفہ، تصوف، دینیات، اخلاقیات اور شاعرانہ تلازمات سے آگہی ضروری تھی۔ حمزہ صاحب ایسے تجربات میں کما حقہ کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے رمز و کنایہ، تشبیہ واستعارہ اور محاورے کی زبان استعمال کرنے کی بجائے سلیس وآسان زبان وبیان کو اختیار کیا اور لفظی ترجمے کو ترجیح دی۔ یہی ترجمہ آپ کی ذاتی قابلیت وذہانت پر دال ہے۔ جاوید نامہ جیسی مشکل وپیچیدہ کتاب جو قارئین کے لیے ایک لحاظ سے بیزاری کا باعث ہے، ترجمے میں پشتو قارئین کے لیے دلچسپی کے بے پناہ سامان رکھتی ہے۔

---

(۱) یوسف سلیم چشتی، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ص ۶۲

---تفصیلی جائزہ---

"مناجات" :-

ے آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ
ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ!

بنیادم په دے ووړ ، رنګه جهان کښې
تل اخته دے په فریاد او په فغان کښې(۱)

شاعر نے "مانند چنگ" کے معنی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔(i)

ع بحر و دشت و کوہ و کہ خاموش و کر

غاړے ، غرونه ، دریابونه کانړهٔ غلی(۲)

"غاړے" بمعنی کنارے کے ہے جو شاعر نے کہ اور دشت کی جگہ استعمال کر کے کام چلایا ہے۔

ع کارواں برگِ سفر ناکردہ ساز!

(یہ قافلہ رختِ سفر کے بغیر ہے)

کارواں نه کړی د سفر لا ارادے(۳)

(کارواں سفر کا ارادہ نہیں رکھتا) ترجمے اور اصل میں تضاد ہے۔

ے ایں جہاں صید است و صیادیم ما؟
یا اسیر رفتہ از یادیم ما؟

دا دنیا ده زموږ ښکار، او موږ ښکاریان یو
که د چاله یادو اوتی اسیر ا ن یو(۴)

دونوں مصرعوں کے آخر میں سوالیہ نشان کا ہونا ضروری ہے۔

ے بے تجلی مردِ دانا رہ نبرد
از لکد کوبِ خیالِ خویش مرد

بے جلوے هوښیار په لاره نه شی تلے
د خپل خیال په غلبو کښې مری په ځائے(۵)

---

(۱) امیر حمزہ خان شنواری، مترجم، جاوید نامہ، پشتو اکیڈیمی پشاور، ص ۱

(۲) ایضاً، (۳) ایضاً،

(۴) ایضاً، (۵) ایضاً ص ۷

(i) چنگ بمعنی ستار کی قسم کا ایک باجا

ترجمے میں ترمیم کی ضرورت ہے کیونکہ قافیے (تلے۔خائے) صحیح نہیں ہیں۔اسی طرح صفحہ نمبر ۸ پرورکړو ، لیدو۔

ے چوں تو در پہنائے من کورے کجا
جز بقندیلم ترا نورے کجا

(میری فضا کی وسعتوں میں تیرے جیسا اندھا کہاں ہے، میری قندیل کے بغیر تیرے لیے کوئی روشنی نہیں)

په سترګه ورو کبنں په شان ړوند
سوالی رڼرا غواړے زما له ډيوو(۱)

بناؤں میں اندھوں کی طرح تو میرے چراغاں سے روشنی مستعار چاہتا ہے۔اصل اور ترجمے میں فرق ہے اسلیے ترجمے میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

خاک اگر الوند شد جز خاک نیست
روشن و پائندہ چوں افلاک نیست

خاک اگر الوند پہاڑ بن جائے پھر بھی وہ خاک ہی رہتی ہے۔وہ کبھی افلاک کی مانند روشن و پائندہ نہیں ہو سکتی۔

خاوره خو خاوره ده روښنانه نه ده
غر که شي سياله له آسمانه نه ده

ترجمہ اصل مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ترجمہ اگر اس طرح ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

خاوره که الوند شي خوهم خاوره ده
نه افلاک غونډے روښنانه دغه خاوره ده

ع نور صبح از آفتابِ داغدار
نورِ جاں پاک از غبارِ روزگار

صبح کی روشنی آفتابِ داغدار سے ہے۔جبکہ روح کا نور زمانے کے گرد و غبار سے پاک ہے۔

د سحر نُور پيداکړی نور د اغدار
نور د روح پاک د زمانے له غبار(۲)

پہلا مصرع مشکوک ہے اس لیے کہ نور کے تکرار نے غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔پہلا نُور ہے اور دوسرا نور (نمر)۔اگر پہلا مصرع اس طرح ہو جائے تو صحیح ہوگا۔ د سحر نور پيدا دے له نمر دا غدار

غزل صفحہ ۳۲ پر

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب
شیبِ او فرخندہ چوں عہدِ شباب

---

(۱) جاوید نامہ، پشتو، ص ۸ (۲) ایضاً، ص ۹

ان (رومیؒ) کا چہرہ آفتاب کی مانند روشن تھا۔ ان کی پیری جوانی کی سی آب وتاب رکھتی تھی۔

مخ ئے روښانه وو په شان د آفتاب

وه زړه بوډاے لکه وخت د شباب(۱)

دوسرا مصرع مبہم ہے اس لیے اس طرح ہونا چاہیے :۔

ووبوډا والی کښې ئے د ځوانئی آب وتاب

صفحہ نمبر ۱۳ پر قافیہ "روښانه ، سره" صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح "کړو اور غوښتو" صفحہ نمبر ۱۵ پر "شوے ، راغلے" اور 'دا، صفا" صفحہ نمبر ۷ا پر" ښائی ،کوی" جیسے قوافی غلط ہیں یہ شعر :۔

در گلو داری نواہا خوب و نغز

چند اندر گل بنالی مثلِ چغز

تیرے گلے میں خوب اور عمدہ نغمے موجود ہیں۔ تو کب تک مٹی کے اندر مینڈک کی مانند روتا رہے گا۔

شته په سینه کښې دِ خوږ ے سندرے

خټو کښې نښتیه ! داسې ژاړے ولے (۲)

ترجمے میں "مثلِ چغز" کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ شعر :۔

"جملہ تن را در گداز اندر بصر

در نظر رو در نظر رو در نظر" (رومی)

اپنے سارے بدن کو پگھلا کر نگاہ بنالے۔ نگاہ حاصل کر، نگاہ حاصل کر، نگاہ حاصل کر۔

تن دِ تمام سترګو کښې ویلی کړه

بیا دِ نظر سره، نظر کښې لاړ شه

ترجمہ مبہم ہو کر رہ گیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے

دوسرا مصرع :۔

بیا دِنظر سره نظر او نظر حاصل کړه

یا نظر ، نظر سره نظر حاصل کړه

"زمزمۂ انجم" کا یہ شعر :۔

عقل تو حاصلِ حیات، عشق تو سرِّ کائنات

پیکرِ خاک! خوش بیا ایں سوے عالم جہات

---

(۱) جاوید نامہ (ترجمہ)، ص ۱۳

(۲) ایضاً، ص ۱۸

تیری عقل حیات کا حاصل ہے۔ تیرا عشق کائنات کا سر ہے۔اے خاکی انسان! تیرا عالم چار سو سے اسطرف آنا مبارک ہو۔

ژوندون حاصل له عقله، عشق دے رازدکائنات

په خیر راغلے آدمه دے عالم ته د جهات[1]

زندگی عقل کا حاصل ہے، عشق ہر کائنات ہے۔اے آدم اس عالم جہات کو تیرا آنا مبارک ہو۔ پہلا مصرع غلط ہے اس طرح ہونا چاہیے۔

عقل حاصل له ژوندون ، عشق دے راز دکائنات

ع زہرہ وماہ و مشتری از تو رقیب یک دگر

زهره او مشتری په کشمکش کښی ستا دپاره

ترجمہ میں (ماہ) کو نظر انداز کر دیا ہے۔"نہ تا سخن از عارف ہندی" کا یہ شعر:۔

مرد مومن زندہ وباخود بجنگ

بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

مرد مومن ژوندے ، د ځان سره په جنګ وی

په خپل ځان ئے تل دپړانګ غوندے غور زنګ وی[2]

دوسرے مصرع کا مطلب :۔اپنے آپ پر چیتے کی طرح جھپٹتا ہے۔(آہو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے) مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

په هوسئی تل دپړانګ غوندے غورزنګ وی

"حرکت به وادئ یر غمید که ملائکه ا و راوادئ طواسین می نامند" کا یہ شعر:۔

کندہ بر دیوارے از سنگِ قمر

چار طاسین نبوت را نگر

سنگِ قمر سے بنائی ہوئی دیوار پر چار طواسین[i] نبوت دیکھ۔

دسپوږمئے په دیوال لیک وو دا رنګین

ګوره ته د نبوت څلور طا سین[3]

چاند کی دیوار پر یہ رنگین تحریر کندہ تھی کہ تو نبوت کے چار طواسین دیکھ۔۔۔۔ پہلا مصرع غلط ہے اس لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

د ګټے د سپوږمئی په دیوال لیک وو دارنګین

یا سنګِ قمر په دیوال لیک وو دا رنګین

یا په سپین کاڼری جوړ شوی دیوال لیک وو دا رنګین

---

(۱) ترجمہ جاوید نامہ، ص ۲۳

(۲) ایضاً، ص (۳) ایضاً، ص ۴۷ (i) چار طاسین سے مراد گوتم بدھ، زرتشت، مسیح، اور نبی کریم۔

"رویائے حکیم طالسطائی" :۔

تابِ مہ ازدود گردِ او چو قیر
آفتاب اندر فضائش تشنہ میر!

اس کے دھوئیں سے چاند کی چمک تارکول کی طرح ہوگئی ہے۔اس کی فضا میں سورج بھی (روشنی کے لیے) پیاسا مر جاتا ہے۔

چہ لہ گردہ ئے نن زړہ غونډے قمر وو
نمر ئے تږے پہ فضا کښې کورو کړوو[1]

ترجمہ مبہم اور پیچیدہ اس لیے اس طرح ہونا چاہیے۔

چہ لہ گرد ئے تارکول غونډے قمر وو
نمر ئے تږے د رڼا پہ کورو کړوو

"سعید حلیم پاشا" :۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

دانش عشق سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتی ہے اور عشق کے کام کی بنیاد دانش سے مستحکم ہوتی ہے۔

زیرکی د عشق نہ موبی حق شناسی
او کارِ عشق د زیرکئ محکم اساسی

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست
چشمِ شاں صاحب نظر، دل مردہ ایست!

مندرجہ بالا اشعار کا ترجمہ بھی مفقود ہے۔ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

زیرکی د عشق نہ موبی حق شناسی
او کارِ عشق دزیرکئی محکم اساسی
فیرنګیاں هغه چالاک چه شعله ئے ده مرده
سترګو کښې ئے نظر، مگر زړه ئے دے مرده

"حکمت خیر کثیر است" :۔

علم حرف و صوت را شہپر دہد
پاکئ گوہر بہ ناگوہر دہد

علم مصنف اور خطیب کو شہپر عطا کرتا ہے۔اس سے معمولی شخصیت کو بھی اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔

---

(۱) ، جاوید نامہ (پشتو)، ص ۵۵

علم حرف وته، آواز ته ، وزړ ورکا

خر مهرے ته لطافت دګوهر ورکا

شاعر نے حرف (مصنف) اور صوت (خطیب) کو جو مرادی معنوں کے لیے ہیں، لفظی معنوں میں استعمال کئے ہیں، ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

علم ادیب ته هم خطیب ته وزر ورکا

معمولی سړی ته هم صفا زړه ورکا

"پیغام افغانی باملتِ روسیہ" :۔

ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی

از زماں واز مکاں آمد غنی!

اللہ تعالیٰ کا ذکر قوموں سے بے نیاز ہے وہ زمان و مکان سے ماوراء ہے۔ (مذکورہ شعر کا پشتو ترجمہ صفحہ نمبر ۹۱ پر مفقود ہے) ترجمہ اس طرح سے ہوگا۔

د خدائے ذکر حاجتمند دامت نه دے

د زمان او د مکان د حاجت نه دے

"نغمہ بعل" :۔

خونِ اوسر داز شکوه دیریاں

لاجرم پیر حرم زنار بست

بت کدہ مغرب نے اسے مرعوب کر دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ پیر حرم نے زنار باندھ لیا ہے۔

اوس ئے سپینے تبنتی د کفارو له دبدبه

خوبنس کړل زنارو نه دحرم همه پیرانو(۱)

خوبصورت ترجمہ ہے کیونکہ "سپینے تبنتی "پشتو محاورہ ہے۔"فرعون" کا یہ شعر :۔

وائے قومے از ہوس گردیدہ کور

می برد لعل و گہر از خاک گور

افسوس اس قوم پر ہوسِ زر نے جس کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ جو ہماری قبروں سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے لعل وگہر سمیٹتی ہے۔

حیف په هغه قام چه خپل بنوس ئے نابینا کا

سپړده د قبرونو د ګوهرو له سوداکا(۲)

(۱) ترجمہ جاوید نامہ، ص ۱۰۳

(۲) ایضاً، ص ۱۰۷

افسوس اس قوم پر ہوس نے جس کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ جو قبروں کو کھود کر گوہروں کا سودا کرتی ہے۔ ترجمہ خوبصورت اور لفظی ہے۔ صفحہ نمبر ۱۲۲ پر حکیم مریخی اور زندہ رود کے مکالمے ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۲۳، ۱۲۴ اور ۱۲۵ کے اشعار حکیم مریخی کے ہیں جبکہ انھیں زندہ رود، عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ بعض مقامات پر مصرعے بھی آپس میں برابر نہیں ہیں۔ اس شعر کا ترجمہ :۔

نالۂ کو خیزد از سوزِ جگر

ہر کجا تاثیر او دیدم دگر!

وہ نالہ جو سوز جگر سے اٹھتا ہے میں نے ہر کہیں اس کی تاثیر مختلف دیکھی۔

سوز نه د ځیګر چه دهر چاوتلے وير وى

ماولید چه هر ځائے ئے جدا جدا تاثیر وى(۱)

"غالب" میں :۔

قمری از تاثیر او واسوختہ

بلبل از وے رنگہا اندوختہ!

قمری اس (سوز) کی تاثیر سے سراپا سوختہ ہے۔ بلبل نے اس سے مختلف رنگ حاصل کئے ہیں۔

او سوزی سپوږمئے ئے د تاثیر نه لکه شمع

بل خواتہ بلبل ښکلی رنګونه کړی راجمع(۲)

شاعر نے قمری کو قمر کے معنی میں لیا ہے جو کہ غلطی ہے۔ شعر میں (سپوږمئی) کی جگہ (کوړکوری) چاہیے۔

"حلاج" :۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر

ما سراپا انتظار او منتظر

عبد اور ہے اور عبدہٗ اور چیز ہے ہم سراپا انتظار ہیں اور اُس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ (معراج کی طرف اشارہ ہے)

عبد دے جدا، او عبدهٗ ګورے جدا دے

مونږ منتظر، هغه منتظر زما او ستا دے

شاعر نے مترجم کی طبع رسا میں مفہوم واضح نہیں ہے۔ دوسرا مصرع گڑبڑ ہے۔ اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

ع نانے از جو خورد و کراری نکرد

جو کی روٹی تو کھائی مگر حیدر کرار کا سا عمل اختیار نہ کر کیا۔

روټه ئے خوړه خو خوئ ئے خپل د علیؓ نه کړو(۱)

---

(۱) جاوید نامہ (پشتو ترجمہ)، ص ۱۴۵

(۲) ایضاً، ص ۱۴۵ (۱) "روټه" نان جویں کا بہتر مترادف ہے۔

زندہ رود" :۔

اے ترا اقلیم جاں زیر نگیں
یک نفس باباد گرد صحبت گزیں

روح کی سلطنت آپ کے زیر نگیں ہے۔ تھوڑی دیر اور ہمیں اپنی صحبت سے نوازیئے۔

اے د زړه جهان دِ په فرمان، په تا رحمت شه
بس یوه شیبه راسره نورهم په صحبت شه

دل کی دنیا آپ کے تابع ہے، تجھ پر رحمت ہو، بس تھوڑی دیر کے لیے ہمیں اپنی صحبت سے نوازیئے۔
شاعر نے رحمت کا اضافہ کر کے شعر کو خوبصورت بنا دیا ہے
"مقام حکیم المانوی نطشہ" کا مصرع :۔

دور تر چوں میوہ از بیخ شجر

لرے د میوے غوندے له ستے دشجر وو(۱)

"سٹے" "تنا" کو کہتے ہیں جو کہ غلط ہے، اس کی جگہ "جرے"، چاہیے۔ "غنی" کا یہ مصرع :۔

ہیچ میدانی کہ روزے درولر

بنه نوخبر نهٔ ئے چه دلرے سیند په غاړه(۲)

ترجمہ مطلب اصل سے مختلف ہے۔ اچھا تجھے معلوم نہیں ہے کہ دور دریا کے کنارے۔
اس لیے ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

بنه نو خبر نه ئے چه د وُلر سیند په غاړه

مترجم شاعر نے زیادہ تر لفظی تراجم کئے ہیں۔ "غنی" کا یہ شعر ملاحظہ ہو :۔

آں جواں کو شہر و دشت و در گرفت
پرورش از شیر صد مادر گرفت

وہ دریا جو شہروں، جنگلوں اور آبادیوں کو اپنی پیٹ میں لے لیتا ہے۔ سینکڑوں ندیوں کے پانی سے پرورش پاتا ہے(۱)

هغه ځوان چه بنار او د صحرا د رانیوو دے
شوے پرورش ئے د سل میندو په شودو دے

وہ جوان جو شہروں اور دریاؤں پر گرفت حاصل کرتا ہے سینکڑوں ماؤں کے دودھ سے پرورش پایا ہوتا ہے۔
شاعر نے ترجمہ غلط کیا ہے جس کا بند کے دوسرے اشعار کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا۔

---

(۱) جاوید نامہ (پشتو ترجمہ)، ص ۱۷۸ (۲) ایضاً، ص ۱۹۳

(۱) میاں عبدالرشید، کلیات اقبال، ص ۳۰۹ مزید دیکھیے شرح جاوید نامہ ص ۱۰۴۴

"زندہ رود" :۔

عقل است چراغ تو در راہ گزارے بنہ

عشق است ایاغ تو بابندۂ محرم زن

اگر عقل تیرا چراغ ہے تو اس کو سر راہ رکھدے۔ اگر عشق تیرا پیالہ ہے تو صرف محرم راز سے مل کر پی۔

دا عقل ستا چراغ دے بس په لاره کښې ئے کښېږ ده

پیاله د عشق ده ، څښنه ئے له هغه ، چه وی محرم

دوسرا مصرع مشکل ہے۔ اس طرح ہونا چاہیے۔

که عشق وی پیاله د تا څښنه ئے له محرم

یہ مصرع :۔ لختِ دل پر خونے از دیدہ فرو ریزم

(میں نے اپنی آنکھوں سے دل پر خون کے ٹکڑے آنسوؤں کی صورت میں گرا رہا ہوں)

د زړه ټوټې مې سرې په وینو ونو ستې له سترګو

(میں نے خون سے سرخ دل کے ٹکڑے آنکھوں سے گرائے) مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

ټوټې د وینو اوښکې مې په زړه نوستې له سترګو

صفحہ نمبر ۳۲۶ پر "زندہ رود" کے دو اشعار (جو مندرجہ ذیل درج ہیں) کا ترجمہ مفقود ہے۔

مرد صحرائی بایراں جاں دمید

باز سوے ریگ زار خود رمید!

عربوں نے ایران میں نئی روح پھونک دی اور پھر ریگستان کی طرف واپس چلے گئے۔ (ترجمہ اس طرح ہو گا)

عربو په ایران کښې نوے ژوند پیدا کړو

او ریګستان ته ئے تلل هم واپسی بیا کړو

کہنہ را از لوحِ ما بستر دو رفت

برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت

انھوں نے ہماری لوح حیات سے قدامت کو مٹایا۔ وہ ہمیں نئے دور کا ساز و سامان دے کر واپس گئے (پشتو ترجمہ مفقود ہے جو مندرجہ ذیل ہو گا۔)

تختئی نه ئے زموږ زوړ والے وران کړو بیر ته لاړل

په بر خه موئے د نوی دور سامان کړو بیرته لاړل

"پیغام سلطان شہید بہ رود کاویری" کے دوسرے شعر کا ترجمہ مفقود ہے شعر ملاحظہ ہو۔

در کہستاں عمر ہانالیدہ

راہِ خود را بامژہ کاویدہ

توساری عمر کہستاں میں فریاد کناں رہا۔ تونے نیاراستہ اپنی پلکوں سے کھودا ہے۔۔۔ پشتو ترجمہ اس طرح ہوگا۔

تا تمامی عمر بس په غرهٔ کبش ناله کړې ده

لاره د بڼرو په څوکو تاخان ته کندلے ده

یہ شعر:۔ موجِ تو جز دانۂ گوہر نزاد

طرۂ تو تا ابد شوریدہ باد!

تیری موج نے صرف گوہر کا ایک ہی دانہ پیدا کیا ہے۔ (سلطان ٹیپو کی طرف اشارہ ہے) تیری لہریں اسی طرح تا ابد شوریدہ رہیں!

بس د ملغلرو زیږ ونکے ستا چپه وی

نیغه او تر وه د تر ابده ستا شمله وی(۱)

بس تیری موج موتیاں پیدا کرنے والی ہے۔ اور تیرا طرہ ہمیشہ اونچا اور سیدھا رہے۔

پہلے مصرع میں فرق ہے۔ اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

بس یو ملغره زیږ ونکے ستا چپه وی

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آں کہ خاکش مرجع صد آرزوست

اضطرابِ موجِ تو از خونِ اوست!

جسکا مرقد آج بھی سینکڑوں آرزووں کا مرجع ہے۔ تیری موجوں کا اضطراب اسی کے خون کے باعث ہے۔

هغه چه ده خاوره ئې مرجع د ارمانونو

دے هم ستاله وینو، اضطراب ئې د موجونو(۲)

جس کی خاک آرزووں کا مرجع ہے۔ تیرے خون کے سبب موجوں کا اضطراب ہے۔ ترجمہ میں فرق ہے، مترجم نے خاکش جو بمعنی قبر کے ہے خاک کے معنی میں لیا ہے۔ دوسرا مصرع بھی صحیح نہیں اس لیے ترجمہ اگر اس طرح ہو جائے تو صحیح ہوگا۔

هغه چه ئې مزار دے مرکز دارمانونو

دے دَ دهٔ له وینو، اضطراب دِ دَموجونو

یہ شعر:۔

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود

غیر حسرت چیست باداشِ نمود؟

(۱) حمزہ، جاوید نامہ، ص ۲۱۵

(۲) ایضاً، ص ۲۱۵

وجود کی تعمیر خس وخاشاک سے ہے۔ نمود کا انجام سوائے حسرت کے اور کچھ نہیں۔

وے ، ذخس خاشاک څنے تعمیر د وجود څه وی

وایه نتیجه بے له حسرت ، د نمود څه وی(۱)

کہا کہ خس وخاشاک سے وجود کی تعمیر کیا ہے؟ نمود کا انجام سوائے حسرت کے کیا ہے۔۔ ترجمہ مشکوک اور غلط ہے۔ صحیح ترجمہ اس طرح ہوگا۔

هم دا خس وخاشاک چه تعمیر دے ذوجود

حشر به ئے وی څه بے له حسرته ذ نمود

صبح امروزے کہ نورش ظاہر است

در حضورش دوش و فردا حاضر است

(میں نے دیکھا) کہ صبح امروز جس کا نور ظاہر ہے۔ اس کے حضور میں ماضی اور مستقبل دونوں حاضر ہیں۔

دا د نن سحر گوره چه نورئے بنه ظاهر دے

نن اوکه صبا دے په حضور کبنی ئے حاضر دے(۲)

آج کی صبح دیکھ جس کا نور ظاہر ہے۔ آج اور کل (مستقبل) اس کے حضور میں حاضر ہیں۔

مترجم شاعر نے دوش (ماضی، کل) کے معنی "آج" کے کئے ہیں جو کہ غلط ہے۔ اس لیے دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

صبا اوکه پرون دے په حضور کبنی ئے حاضر دے

مثالی تراجم :۔

پشتو زبان وادب کے عظیم نقاد محمد اعظم لکھتے ہیں کہ حمزہ بابا کی فکر بلند، نظر دوربین اور قلم طاقتور ہے۔ تینوں کی یکجہتی نے ارمغان حجاز اور جاوید نامہ کے ترجمے کو دلکش اور خوبصورت بنادیا ہے۔ اس کے شعر محاسن اور پشتو الفاظ کی چھان پھٹک کی کاوشیں نمایاں ہیں۔(۳)

ترجمہ کی زبان سادہ اور رواں ہے اور مترجم کی محنت اور کاوشیں قابل تعریف ہیں۔ ذیل میں مثالی تراجم کی مثالیں پیش کی جاری ہیں۔ جس نے ترجمے کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔

"مناجات" صفحہ نمبر ۱۳ کا یہ شعر :۔

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من

جلوۂ داری دریغ از جانِ من؟

آپ کا چہرہ ہی میرا ایمان اور میرا قرآن ہے۔ آپ اپنے دیدار سے مجھے کیوں محروم رکھتے۔

(۱) حمزہ، جاوید نامہ، ص ۲۱۴ (۲) ایضاً، ص ۲۲۳

(۳) محمد اعظم اعظم "پښتو کښې اقبال" ماہنامہ پشتو، مارچ اپریل، ۱۹۸۰ء، ص ۳۸۹

د تاسخ زما ایمان زما قرآن دے

تۀ زما نه دِ جلوے ساتے ارمان دے

غزل صفحہ نمبر ۳۰ پہ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

بگشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزوست

بنمائے رخ کہ باغ وگلستانم آرزوست

یک دست جامِ بادہ ویک دست زلفِ یار

رقص چنیں میانۂ میدانم آرزوست

اپنے لب کھولیے کہ مجھے قندِ فراواں کی آرزو ہے۔ اپنا چہرہ دکھایئے کہ میں باغ وگلستاں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ ایک ہاتھ میں جامِ شراب ہو۔ اور ایک ہاتھ میں زلفِ یار، پھر میں میدان کے درمیان رقص کروں، یہ میری آرزو ہے۔

شونډے پرانیزه چه قندِ فراوان زما ارمان دے

مخ بنکاره کړه چه دا باغ او ګلستان زما ارمان دے

په یو لاس کښې جام د میو په یو لاس داشنا زلفې

هم په دے رنګه یو رقص په میدان زما ارمان دے (۱)

نظم "رقاصہ" صفحہ نمبر ۸۶ پر:۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را

یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

اس دلِ بیقرار کو کشمکش میں رہنے کی فرصت نہ دے۔ اپنے گیسوئے پیچیدہ میں ایک دو شکن کا اور اضافہ کر دے۔

دوه ژرندئے چه سے نه کړے دا زړګوتے بے قرار

یو دوه ولونه ئے زیات کړه د تاؤ تاؤ زلفو د زار(۲)

نظم "گردش در شہر مرغدین" صفحہ نمبر ۱۹۴:۔

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش

خوب روے نرم خوے سادہ پوش

وہاں کے رہنے والوں کی زبان شہد کی طرح میٹھی تھی۔ وہ خوبرو، نرم خو اور سادہ پوش تھے۔

خلق ئے همه لکه ګبین شیرین ژبان وو

بنه بنکلی مخونه ، نرم خوئ ، ساده پوشان وو

مترجم نے لفظی ترجمہ کرنے کے باوجود بھی سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

---

(۱) حمزہ، جاوید نامہ، ص ۱۲

(۲) ایضاً، ص ۵۰

"حکیم مریخی" صفحہ نمبر ۲۰۰ پر یہ شعر

شبنمی؟افتند گی تقدیر تست
قلزمی ؟پائندگی تقدیر تست

اگر تو شبنم ہے تو تیری تقدیر میں نیچے گرنا ہے۔اگر تو سمندر ہے ؟تو تیری تقدیر ہمیشہ رہنا ہے۔

تهٔ که شولے پرخه په تقدیر دِ پریوتل دی
خان دِکه دریاب کړو پائیدل دِ تل ترتل دی(۱)

"رومی" نظم کا یہ شعر صفحہ نمبر ۲۰۸ پر :۔

دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق
دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق!

آدابِ عشق کے بغیر دین پختہ نہیں ہوتا۔اس لیے اربابِ عشق کی صحبت سے دین حاصل کر۔

دین به نه شي پوخ بے د آدابو نه د مینے
دین واخله صبحت نه دارباںونه د مینے (۲)

ترجمہ لفظی ہے لیکن سلیس اور آسان ہے۔عام فہم ہونیکی وجہ سے باعث سرور ہے۔"نوائے غالب"

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

اٹھ کہ آسمان کا دستور بدل دیں۔پیالۂ شراب کی گردش سے قضا تبدیل کر دیں۔

دا زور دَول راځئ چه دآسمان اوګر زوؤ
مرګے په جام د میو سرګردان اوګرَوو(۳)

ساری نظم غزل نما ہے۔ترجمے میں غزل جیسی چستی،چاشنی اور رعنائی موجود ہے۔ بعنوان "حلاج"

عشقِ ما از شکوہ ہا بیگانہ ایست
گرچہ اور اگریہ مستانہ ایست

ہمارا عشق شکوہ وشکایت سے ناآشنا ہے۔اس کا گریہ مستی کا گریہ ہے۔

عشق چه دے زمونږه د ګِلو نه بیګانه دے
بیا سره ددے هم په ژړا کښې مستانه دے(۴)

ترجمے میں اصل جیسی چستی نمایاں ہے۔بحریں مختصر اور چست ہیں۔

---

(۱) حمزہ،جاوید نامہ،ص ۱۲۳ (۲)ایضاً،ص ۱۳۰

(۳) ایضاً،ص ۱۳۶ (۴)ایضاً،ص ۱۳۹

"نمودار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس" کا یہ شعر :۔

گفتمش بگزر ز آئین فراق
ابغض الاشیاءِ عندی الطلاق

میں نے اسے کہا تو فراق کی راہ چھوڑ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق سب سے ناپسندیدہ عمل ہے۔

وے سے ورته تیر شه د آئین نه د فراق
"تولو نه خراب څیز دے زما په نیز طلاق"(۱)

اس میں مشہور حدیث شریف کی طرف اشارہ ہے۔
صفحہ نمبر ۲۶۴ پر یہ شعر :۔

در فضائے نیلگوں یک دم بایست
تا مکافاتِ عمل بینی کہ چیست

اس کی فضا میں ایک لمحے کے لیے رک جا تاکہ تو دیکھ لے کہ مکافاتِ عمل کیا ہے۔

لږ خو نظر اوکړه په دے شنه لو یه فضا کښنې
ګوره نتیجه د عمل څه وی په دنیا کښنې (۲)

"غزل" صفحہ نمبر ۳۲۶ :۔

دست را چوں مرکبِ تیغ و قلم کردی مدار
ہیچ غم گر مرکب تن لنگ باشد یا عرن

جب تو نے اپنے ہاتھ کو تیغ و قلم کا مرکب بنالیا تو پھر اگر تیرا بدن لنگڑا یا لولا ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں۔

لاس کښنې چه دِ توره قلم د اخستو غم مکړه
څه وی که بربنډ وی که بے کاره دِ وی تن (۳)

مذکورہ غزل کا ترجمہ اصل کا ایسا عکس پیش کرتا ہے گویا اصل ہی تو ہے۔ بحریں مختصر، پرسوز اور غنائیت سے مالا مال ہیں۔

ے لالہ صحرائی تنہا نتوانی سوخت
ایں داغ جگر تابے بر سینۂ آدم زن

اے لالۂ صحرائی تنہا نہیں جلا جاسکتا۔ اپنا یہ داغِ جگر تاب آدم کے سینے کو بھی عطا کر دے۔

---

(۱) حمزہ۔ جاوید نامہ، ص ۱۵۹
(۲) ایضاً، ص ۱۶۶
(۳) ایضاً، ص ۲۰۵

صحرا کښې ریدی ګله، سوزیدے نه شے ځان ته
دا رونړ د خکر داغ و هه یه ز ړونو ذ آدم

ترجمہ خوبصورت، دلکش اور پر سوز ہے جو قاری کو لذت و سرور سے مالامال کرتا ہے۔

"ابدالی" کا یہ شعر:۔

آسیا یک پیکرِ آب و گل است
ملتِ افغاں در آں پیکر دل است

ایشیا ایک اب و گل کا پیکر ہے اور اس پیکر کے اندر افغان ملت، دل کی مانند ہے۔

ملک د ایشیا که یو قالب دآب وګل دے
دا د پښتنو ملت په دے قالب کښې دل دے(۱)

سہل را جستن درین دیرِ کہن
این دلیل آں کہ جاں رفت از بدن

اس دیر کہن (دنیا) میں آسانی کی تلاش کا مطلب یہ ہے کہ جان بدن کے اندر سے ختم ہو چکی ہے۔

خوک چه آسانی غواړی په دے زاړه جهان کښې
پوهه شه بدن به ئے روح نه لری په ځان کښې

"پیغام سلطان شہید بہ رود کاویری" کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر!
مرگِ پورِ مرتضیٰؓ چیزے دگر!

اگرچہ مومن ہر موت کو شکر سے قبول کرتا ہے مگر سیدنا حسین کی موت اور چیز ہے۔

مرګ له هره قسمه، خوږ مومن ته وی که سپور دے
مرګ چه د فرزند د مرتضیٰؓ وو، هغه نور دے(۲)

"سپور" یہاں محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لفظی معنی چکنائی کے بغیر ہوتا ہے۔ یہاں ناپسند مراد ہے۔

"ندائے جمال" صفحہ نمبر ۳۵۸ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

مردِ حق برندہ چوں شمشیر باش
خود جہان خویش را تقدیر باش!

اے مردِ حق! شمشیر کی مانند تیز رہ اور آپ اپنے جہان کی تقدیر بن۔

---

(۱) حمزہ، جاوید نامہ، ص ۲۰۸
(۲) ایضاً، ص ۲۱۸

باسه پرے کوونکے تۀ په مثل د شمشیر شه

ته دے خپل جهان لره پخپله خپل تقدیر شه

شاعر مترجم نے "مرد حق" کو ترجمے میں نظر انداز کر دیا ہے۔ چونکہ ندائے جمال مرد حق کے لیے ہو سکتی ہے اس لیے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

ملتے چوں می شود توحید مست

قوت و جبروت می آید بدست!

جب ملت توحید مست ہو جاتی ہے تو وہ قوت و جبروت کی مالک ہو جاتی ہے۔

مست چه د توحید په پاکو میٔو کوم ملت شی

دۀ وته حاصل هم جبروت او هم قوت شی(۱)

جو ملت پاک مئے توحید سے مست ہو جاتی ہے۔ وہ قوت و جبروت کی مالک ہو جاتی ہے۔

شاعر نے مست کا ساتھ مئے کا اضافہ کیا ہے۔ الفاظ کا یہ اضافہ اور مناسبت بڑی خوش آئندہ ہے۔

"خطاب بہ جاوید ":۔

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر

سوختن در لاالٰہ از من بگیر!

اے بیٹے! اب ذوقِ نگاہ یعنہ لاالٰہ میں جلنا مجھ سے لے لے۔

اے بچیه ذوق اوس د نظر زمانه واخله

سول په لا اله کښې سراسر، زمانه واخله(۲)

ے جوانان تشنہ لب ، خالی ایاغ

شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ!

ہمارے نوجوان پیاسے ہیں مگر ان کے جام خالی ہیں۔ چہرے چمکدار، دماغ روشن، مگر اندروں تاریک۔

تږی دی ځلمی، تش نے په لاس کښې دی جامونه

رونړ مخونه ، تور زړونه ، رو ښنا نه دماغونه(۳)

اس کے علاوہ بھی بے شمار کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کے تراجم لفظی ہونے کے باوجود بھی معیاری ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے تراجم دیکھنے میں نہیں آئے جو قاری کے لیے مشکل ہوں۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ آپ کے تراجم سہل، آسان اور رواں ہیں۔ یہ سہرا دوسرے مترجمین کے حصے میں کم آیا ہے۔

---

(۱) حمزہ، جاوید نامہ، ص ۲۲۷ (۲) ایضاً، ص ۲۳۴

(۳) ایضاً، ص ۲۳۷

جہاں تک شعر کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کا تعلق ہے بذاتِ خود ایک پیچیدہ اور غور و پرداخت کا کام ہے۔ جب شاعر فکر و فن میں سے ایک پر قابو پاتا ہے تو دوسرا جاتا رہتا ہے۔ یہ مرحلہ شاعر مترجم کے لیے بڑا کٹھن اور دشوار گزار ہوتا ہے۔ لیکن وہ ان مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو اپنی راہ میں حائل ہونے نہیں دیتا۔ اپنے مقاصد کو سر کرنے کے لیے وہ دن رات ایک کر کے آخر کار کامیابی حاصل کر ہی لیتا ہے۔

جاوید نامہ علامہ کے آخری عمر کا کلام ہے۔ فلسفیانہ خیالات کے ناطے ایک مشکل تصنیف ہے۔ اس مشکل فلسفیانہ خیالات اور فارسی زبان کو سمجھنا اور اس پر عبور حاصل کرنا شاعر کے لیے ایک آسان مرحلہ نہیں ہے۔ لیکن بابائے غزل حمزہ بابا جیسی عالم فاضل شخصیت، ایسے تجربات میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کے ان فلسفیانہ خیالات کو پشتو کا زرین لباس پہنایا۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔ عام قاری بھی علامہ کے خیالات کو آسانی سے بھانپ سکتا ہے۔

بندہ بشر کے کلام میں اغلاط اور کوتاہیوں کا ہونا ایک فطری بات ہے۔ یا تو اشعار چھوٹ جاتے ہیں یا کاتب سے رہ جاتے ہیں یا بعض الفاظ کی املا ہی غلط ہو جاتی ہے۔

صفحہ	غلط	صحیح	صفحہ	غلط	صحیح
4	آسمان	آسان	143	وو	دے
8	اوغوبنتو	اوغوبنتلو	145	خکر	خکر
20	فوق	فوقه	do	هغوئ	هوئ
30	ستورے	سورے	151	عیش	عشق
37	چه	چرته	174	ایمان	اَلمان
84	سوا	رسوا	212	قرآن	آسمان
99	مردوح	مردوح	222	ګکهه	کهه
129	نامداره	نامدار	223	بنکاره	بنکار
			228	پاتے	پائے
			229	اوره	اور وو
			235	بیدا	پیدا
			do	واجباب	واجبات
			243	ګرادب	ګرداب

﴾۔۔۔ حمزہ کے تراجم کا معیار ۔۔۔﴿

جاوید نامہ :۔

حمزہ شنواری کے ترجمے کے سلیس اور رواں ہونے کی دلیل اس بات سے ہے کہ جاوید نامہ کے ترجمے میں بہت کم اصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جب ہم اس کا دوسرے تراجم کے ساتھ تقابلی جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کلام اقبال کے دوسرے تراجم میں اصل الفاظ کی بھرمار ہے۔ اکثر قوافی کے پشتو الفاظ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ لیکن حمزہ کا کلام ان عیوب سے مبرا ہے۔ انھوں نے ترجمے پر ذاتی رنگ کو غالب رکھا۔ کلام اقبال کے قوافی یکسر نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ ترجمے میں مندرجہ ذیل اصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پھر بھی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ تاک، نسترن، آذری (بہاری)، نارون (انار کا درخت)، سیمیا، شعبدہ، دام ودد (چوپایوں)، ہجوم، توتیا (سرمہ)، عیان، آفاق، پنہان، نگین، کاروان، شمشیر، صہبا، نیست، ہست، وغیرہ۔

بعض قافیے صحیح نہیں۔ جہاں ترجمے میں فرق ہے وہاں ترجمہ زیادہ تر لفظی ہے اور بعض الفاظ کے ترجمے میں شاعر غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ جس نے ترجمے کو مشکوک اور غلط بنادیا ہے۔ بعض مقامات پر ترجمہ مفقود ہے اور ایسے اشعار کی تعداد چھ ہے۔ پشتو محاورات بر محل اور دلکش ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ مثالی ہو گیا ہے۔ بعض مقامات پر آزاد ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن غلط تراجم نے ترجمے کی ساکھ کو ٹھیس پہنچایا ہے۔

ارمغانِ حجاز :۔

ترجمے میں بہت کم اصل الفاظ و قوافی استعمال ہوئے ہیں۔ مصرعے مختصر اور بحریں چست ہیں۔ بعض مقامات پر مصرعے یا الفاظ و تراکیب اضافی ہیں۔ جس سے کلام کی شرح ہو کر ترجمے کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال مناسب اور موزوں ہے۔ بعض لفظی تراجم میں بعض الفاظ مشکوک اور غلط استعمال ہوئے ہیں۔ جس نے ترجمے کو مبہم اور پیچیدہ بنادیا ہے۔ بعض اصل الفاظ و قوافی نے ترجمے کو مشکل اور بعید از فہم بنادیا ہے۔ فکری بلندی، بصیرت اور قلم میں روانی ترجمے کو دلکش بنا دیتے ہیں۔

ارمغان حجاز اور جاوید نامہ کے تراجم سے ترجمے کا عمل تمام ہوا، لیکن تصحیح کا عمل ابھی ناتمام ہے، جونہی وقت گزرتا جائے گا۔ تصحیح کا عمل جاری رہے گا۔ البتہ پشتونوں کے لیے اقبال اردو اور فارسی زبان وادب سے پشتو زبان میں جلوہ گر ہوئے ہیں لیکن ملتِ افغان کو علامہ کی امنگوں پر پورا اترنے کے لیے عمل پیہم کی اشد ضرورت ہے۔

باب ششم

ضربِ کلیم، زبورِ عجم، مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد

ا ضربِ کلیم (پشتو ترجمہ ۱۹۶۷ء)

از سیّد محمد تقویم الحق کاکاخیل

مترجم کا تعارف
ضرب کلیم پر ایک نظر
ترجمے کی نوعیت
ترجمے کا تفصیلی جائزہ

ب زبورِ عجم (پشتو ترجمہ ۱۹۶۱ء)

از تقویم الحق کاکاخیل

زبور عجم پر ایک نظر
ترجمے کی نوعیت
ترجمے کا تفصیلی جائزہ

ج مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد (پشتو ترجمہ ۱۹۶۹ء)

مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد پر ایک نظر
تینوں تراجم کا تقابلی مطالعہ اور ترجمے کا معیار
ترجمے کا تفصیلی جائزہ
ترجمے کی نوعیت

۱

کتاب :۔ ضرب کلیم (۱۹۳۶ء)

مترجم :۔ سیّد محمد تقویم الحق کاکاخیل

ناشر :۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سنِ اشاعت :۔ ۱۹۶۷ء

صفحات :۔ ۱۵۴

باب ششم

مترجم کا تعارف :۔

سیّد محمد تقویم الحق کاکا خیل ۱۵ اگست ۱۹۲۷ء میں نوشہرہ موضع "زیارت" میں سید حمیم گل کے گھر پیدا ہوئے۔ مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے کی بدولت اُن کی تربیت اسلامی خطوط پر کی گئی۔ بر صغیر کی منفرد درسگاہ "دیوبند" میں تعلیم حاصل کی۔ عربی اور پشتو ادبیات میں ایم۔ اے کی ڈگریاں امتیازی پوزیشن لے کر حاصل کیں۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء میں محکمہ تعلیم میں اسلامیات کے لیکچرر مقرر ہوئے اور مختلف کالجز میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ مختلف کالجوں کے پرنسپل بھی رہے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے پشتو ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ شعری اور نثری ادب پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ تحریر سادہ، رواں، مزاحیہ اور اصلاحی ہے۔ بہت سی کتب لکھیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پشاور کے ریجنل ڈائریکٹر بھی رہے۔

آپ نے اقبال کے زبور عجم، ضرب کلیم اور مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد کا منظوم پشتو ترجمہ بھی کیا۔ کلام اقبال کے تراجم میں زیادہ حصہ آپ کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ آپ بڑا علمی وادبی تجربہ رکھتے ہیں۔ غزلیں دلکش مگر بہت کم ہیں۔ تغزل کے تمام لوازمات کے علاوہ کلام میں تشبیہات واستعارات اور کنایہ کا خوبصورت ودلکش استعمال موجود ہے۔ فصاحت وبلاغت ان کے کلام کی جان ہے۔ آپ نے ۵ مئی ۱۹۹۹ء میں وفات پائی۔

تصانیف :۔

پشتو گرائمر، پشتو ادب کی تاریخ، مقدمہ مخزن مؤلف اخون درویزہ، تاریخ ادبیات پشتو (تلخیص)، مقدمہ دیوان علی خان، مقدمہ لی لی نورہ، دلاسوکر بنیے (افسانے)، لڑ غونڈ (طنز و مزاح)، پتہ (طنز و مزاح)، سیاح کا روزنامچہ (ریڈیو پاکستان پشاور)، نوے تازہ، قائداعظم محمد علی جناح، بنیادی پشتو۔

---

(۱) اخونزادہ فرمان مسافر، د پښتو ادب خلنده ستوری، مکتبہ اباسین اشنغر چارسدہ، اگست 1984ء، ص ۲۱۹

ضربِ کلیم کا تعارف :۔

ضرب کلیم اقبال کی پختہ عمر کا کلام ہے۔ یہ علامہ کی وفات سے دو سال قبل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، اس میں شعریت یا تغزل کم ہے اور فلسفہ زیادہ ہے۔ اس میں فلسفیانہ طریق پر عہد حاضر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس دور کی غلط روش، غلط تعلیمات، غلط خیالات اور غلط منطق کی نہایت واضح الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ بعض منظومات اتنی بلند پایہ ہیں کہ ان کی سرحد الہام سے ملی ہوئی ہے۔ افرنگ اور دانش افرنگ کے ساتھ ساتھ عرب و عجم اور ایران و ہندوستان پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مسلم لمۃ کی حیاتِ اجتماعیہ کے مختلف شعبوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ الغرض ضرب کلیم مغرب اور مشرق دونوں پر بے لاگ تبصرہ ہے جس کی نظیر اردو تو کیا اس وقت کی تمام ایشائی لٹریچر میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔(۱)

ضرب کلیم بقول علامہ، دور حاضر کے خلاف جنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسمیں علامہ نے دنیا کے تمام مسائل پر اسلامی نکتہ نگاہ سے تنقیدی بحث کی ہے۔ "عصر حاضر" کے عنوان سے جو نظم ہے، اس سے دور حاضر کی اصطلاح کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اقبال کی مراد الحاد اور بے دینی کا موجودہ دور جس میں دنیا نت نئے بتوں کی پرستش کر رہی ہے۔ یہ اشعار عصر حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں ضرب کلیم کا اثر رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو دورِ حاضر سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دے کر فتح مندی کا طریقہ بھی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ بت شکنی کے لیے ضرب کلیمی کی ضرورت ہے اور یہ طاقت "خودی میں ڈوبنے" سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

لیکن معلوم نہیں کہ یہ ضرب کلیمؑ کی وہ ضرب ہے جو بحر احمر پر پڑی تھی۔ جس سے دریا پھٹ گیا تھا اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی یا یہ وہ ضرب ہے جو وادیٔ تیہہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی۔ جس سے پانی کے بارہ چشمے بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لیے پھوٹ پڑے تھے! بہر حال ان دو میں سے جو بھی ہو وہ ہمارے لیے فالِ نیک ہے۔(۲)

علامہ نے یہ کتاب نواب صاحب بھوپال کے نام معنون کی تھی اور ان کی ذات سے کچھ توقعات وابستہ کی تھیں، جن کا اظہار ان فارسی اشعار میں کیا گیا ہے جو سرورق پر مرقوم ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اقوام مغرب نے اقوام ایشیا پر جو مظالم کیے ہیں ان کی داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ اب تک کسی شخص کی توجہ اس داستان کو قلمبند کرنے کی طرف مبذول نہ ہوئی۔ انجام کار میں نے اس اہم فریضہ کو انجام دیا۔ اے ممدوح! تو صاحب نظر ہے اور تیری فراست اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ تو میرے جذبات اور خیالات قلبی سے اچھی طرح واقف ہے۔ پس میں اپنے افکار و احساسات تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں کیونکہ تیرے اندر وہ خوبیاں جمع

---

(۱) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، "ضرب کلیم اور احمدیت" مرتب، ڈاکٹر تحسین فراقی، نقد اقبال حیات اقبال میں، بزم اقبال لاہور، ص ۲۰۵، ۲۰۶

(۲) اختر راہی مرتب، اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، "ضرب کلیم" لاہور بزم اقبال، طبع اول، مارچ 1978ء، ص ۷۹

ہیں کہ پھولوں کو شاخ سے وہ تروتازگی نصیب نہیں ہو سکتی، جو تیرے ہاتھ میں آکر نصیب ہو سکتی ہے۔اس کے بعد تین شعروں میں ناظرین کو بعض ان حقائق سے آگاہ کیا ہے جن کے بغیر کوئی قوم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

څو چه د ژوند حقیقتونو ته نظر اونه کړے
دِ تا بنیبنه به د سنگین کانړی د څنگ نۀ شی

اے مسلمان! جب تک تو زندگی کے حقائق کو پیش نظر نہیں رکھے گا، تیری ذات یا شخصیت جو باعتبار تخلیق، شیشہ کی طرح کمزور ہے۔ حوادثِ روزگار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ زندگی کے حقائق اقبال کے سارے فلسفہ کی کلید ہے اور ان کی شاعری حقائق زندگی اور سرمایہ حیات کی گتھیاں سلجھانے میں کام آئی ہے۔ انسان بہت کمزور ہے۔ اگر وہ زندگی (فطرت) کے اٹل قوانین کو مد نظر نہیں رکھے گا تو کشمکش حیات میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ زورِ دست وضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

دا خو د سختو لاسو کلکو گزارونو ځائے دے
دَجنگ میدان کښی راغوبنتل چړے د چنگ نه شی

اے مسلمان! یہ دنیا عیش وآرام کی جگہ نہیں ہے بلکہ زورِ دست اور ضربتِ کاری کا مقام ہے۔ یہ دنیا سرور رقص اور خورد و نوش کی محفل نہیں بلکہ میدان جنگ ہے، جس میں سکوں محال و نا ممکن ہے۔ مسلمان کی زندگی تغیر و انقلاب، حرکت و عمل او سعی پیہم سے عبارت ہے۔ اس لیے اے مسلمان! تجھے چاہیے کہ میدان جنگ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے اور نوائے چنگ و رباب کی تمنا چھوڑ دے۔ سرمایۂ حیات خونِ دل و جگر سے تقویت پاتا اور پروان چڑھتا ہے، اس کے لیے "لہو ترنگ" یعنی جہاد کی ضرورت ہے نہ کہ جل ترنگ یعنی عیش و عشرت کی۔ وہی قومیں دنیا میں برسر اقتدار آتی ہیں جو مقصدِ حیات کے لیے ہر وقت برسر پیکار رہتی ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، بصیرت و موعظمت ہے۔ وہ مسلمانوں کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ سمجھانا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر حکمت کے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ چکی ہے۔ اور "اِنَّ مِنَ الشعرِ لَحِکْمۃ" کے خلعتِ نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے۔ اب وہ میدان جنگ کار جزیا مسافرانِ راہ کے لیے بانگِ درا نہیں بلکہ وہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریل امین کا پیام ہے۔

علامہ اقبال کو پشتون قوم سے گہری محبت تھی، جس کا اظہار انھوں نے پہلی دفعہ ۱۹۲۳ء میں اس وقت کیا جب علامہ اقبال نے پیام مشرق امیر امان اللہ خان شاہِ افغانستان کے نام منسوب کر دی اور ایک طویل و بلیغ فارسی نظم میں اس کی وجوہات بیان کی ہیں۔ علامہ نے اس پیغام کو شاہ افغانستان کی طرف سے مغرب کے نام کیوں پسند کیا؟ اس لیے کہ علامہ نے زندگی کے اس حصے سے عمر کی آخری حد تک افغان قوم کو اپنی فکر، ذہن اور قلب میں ایک اعلیٰ اور بلند مقام عطا کیا تھا۔

افغان قوم سے علامہ کی بے پناہ محبت تھی۔ جاوید نامہ میں احمد شاہ ابدالی کی ملاقات کا جو منظر علامہ نے پیش کیا وہ ان اشعار سے خوبی واضح ہے۔

آسیا یک پیکرِ آب و گلِ است
ملت افغاں در آں پیکر دل است
از فساد او فساد آسیا
در کشاد او کشاد آسیا

اس ضمن میں علامہ کا عقیدۂ افغان بتدریج مستحکم ہوتا گیا اور ان کی ہر کتاب اور پھر مثنوی پس چہ باید کرد، بال جبریل اور ضرب کلیم میں یہ عقیدہ بڑا قوی اور طاقتور دکھائی دیا۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کے لیے بعض ایسے الفاظ و تصورات سے کام لیا ہے جو صرف پشتون و افغانی قوم کی زبان اور فلسفۂ حیات سے منطبق ہیں۔ فلسفہ خودی اور اس کی جزئیات، کوہ و کمر، باغ و راغ، کوہستان، باز شاہین، چرخ شکرے، وغیرہ بے شمار اصطلاحات و تصورات پشتون کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ خودی یعنی عرفانِ نفس اور پشتو ہم معنی الفاظ اور ہم آہنگ تصورات ہیں۔(۱)

علامہ نے دنیائے اسلام کی مختلف اقوام کے حالات کا نقشہ پیش کر کے اُمتِ مسلمہ کو خودی کا درس دیا ہے۔ انھوں نے اس مرحلے پر عرب کو مقدم سمجھا اور افغان کو مؤخر۔ ہر قوم کے اصلی جواہر، اس کی روایات، اخلاق اور فلسفۂ بقا ہوتے ہیں۔ فلسفۂ اخلاقیاتِ اسلامی اور فلسفۂ پشتو میں ایسی ہم آہنگی تھی کہ علامہ پشتون کی سرشت میں یہ جوہر دیکھتے تھے۔ محراب گل افغان کے افکار پیش کرنے کے سلسلے میں علامہ نے پشتون اور عرب دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ ضرب کلیم کا آخری شعر:۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

بندہ صحرائی عرب اقوام ہیں اور مرد کہستانی، سید جمال الدین افغانی اور محراب گل افغان کی قوم ہے۔ پشتون فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ جس زمین پر قدم رکھے اسے اپنا سمجھے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر اسلامی نظریے (Pan Islamism) کے حقیقی حامل دنیا میں اس قوم کے ایک فرد سید جمال الدین افغانی تھے، اور محراب گل افغان کے افکار بھی اسی نظریے اور عقیدے کے حامل ہیں۔ دنیا کی تمام اقوام یکے بعد دیگرے عروج و اقتدار کے مراحل طے کر چکی ہیں لیکن پشتون قوم کی صحیح باری ابھی تک نہیں آئی۔ اگرچہ آج کی سائنسی دنیا میں بے شک وہ پیچھے ضرور ہے لیکن اس کی روایات اور اخلاقی دنیا ایسی سالم ہے جو دنیا کو امن و سکون کا نقشہ پیش کر سکتا ہے۔

---

(۱) مولانا عبدالقادر، ضرب کلیم، تعارف، ص ۷

وہ وقت دور نہیں جب پشتون اسلامی عقائد واخلاق کا بہترین مظاہرہ کرے اور علامہ اقبال کی تعلیمات، باطل کے لیے ضرب کلیم ثابت ہوں۔ علامہ کی یہ پیش گوئی "کہسارباقی۔ افغان باقی۔ الحکم للہ "ایک نہ ایک دن ضرور پوری ہو گی۔

ترجمے کا تعارف :۔

ضرب کلیم کا پشتو ترجمہ پروفیسر سید تقویم الحق کاکا خیل نے بڑی محنت کے بعد انجام دیا ہے، اور امیر حمزہ خان شنواری نے نظر ثانی کے فرائض ادا کیے ہیں، جو مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ پشتو زبان وادب کے نقاد محمد اعظم اعظم لکھتے ہیں کہ اس ترجمے میں دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو مخمل میں بوری کی پیوندکاری معلوم ہوتی ہے پھر بھی مترجم (منظوم) کی ازلی مجبوری ہوتی ہے۔ ترجمے کے زیادہ ترحصے میں شعر کے معنی کے ساتھ جامے کی زیبائش کا جو خیال رکھا گیا ہے، اُس میں معمولی خامیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں(۱)

نظم "اعلیٰحضرت نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں" کا مصرع :۔

زمانہ باامم ایشیا چہ کردو کند

ترجمہ :۔

پہ ایشیا یانو زمانے څہ اوکړل او څہ کوی

لفظ "ایشیایانو" اگرچہ ترجمہ میں صحیح ہے لیکن پڑھنے میں دقت کی وجہ سے مصرع کے وزن میں حائل ہے۔
نظم "ناظرین سے" کا مصرع :۔

فطرت لہو ترنگ، ہے غافل! نہ جل ترنگ

د وینې ترنګ غواړی فطرت پہ جل ترنګ نہ شی

اقبال نے غافل کو مخاطب کیا ہے لیکن ترجمہ میں مترجم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تمہید میں :۔

جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

ترجمہ :۔

غریبان وو چہ کوم د ډوډے پہ پوست عادت
ستا نغمو ور او بخښلے هسکے ولوے

ترجمہ وزن بحر کی قید سے آزاد ہے۔ جو پڑھنے میں دشواری کا سبب ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

کوم غریبانان چہ ډوډے پو پوست عادت وو
ستا نغمو ور او بخښلے مستے ولولے
کوم غریبان چہ پہ اپیمو امو ختہ وو گورہ
دے تا نغمو ور او بخښلے مستا نہ ولولے

---

(۱) محمد اعظم اعظم، پشتو میں اقبال حصہ دوم" ماہنامہ پشتو، مارچ، اپریل 1980ء، ص ۳۸۸

ے تیری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقامِ شوق وسرور و نظر سے محرومی!

تاسره بنائیږی دسحر ذ اسلویلونه محرومی
شوق د سرور او د کتونه محرومی

ترجمے کے وزن، بحر، طوالت اور بے قاعدگی قارئین کے لیے پیچیدہ اور اکتاہیٹ کا باعث ہیں۔ اس لیے ترجمے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ االفاظ و قوافی کا تناسب اور بحروں کے کھچاؤ اور دلکشی، قارئین کے لیے میلان ورجحان کا سبب بنے۔ مذکورہ شعر کا ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا۔

ستا سزا سحر د اسویلو نه محرومی
شوق او د سرور اوذ کتو نه محرومی

صفحہ نمبر ۸ پر :۔ماته حکم دے اذاں لاالٰہ الااللہ میں "ے " زائد ہے۔
"صبح کا ایک شعر :۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

ترجمہ :۔

دا سحر چه کله صبا کیږی کله نن شی
خدائے خبر دکوم زمکے آسمان نه پیدا کیږی

ترجمے کا مطلب ہے کہ یہ صبح جو کبھی کل اور کبھی آج ہوتی ہے، خدا جانتا ہے کہ کونسے زمین وآسمان سے پیدا ہوتی ہے۔ ترجمے میں چستی، کھچاوٹ اور دلکشی نہیں ہے۔ ترجمہ اسی طرح صحیح ہوگا۔

کله دا سحر چه صبا او کله نن شی
معلومه نه ده چه د کومے پیدا کیږ ی

ے وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

ترجمہ :

هغه پاک سحر چه د وجود شپه ترے نه رپی
هغه د اذان د مسلمان نه پیدا کیږی

الفاظ کی تکرار اور طوالت نے ترجمے کو پیچیدہ بنادیا ہے۔ اس لیے ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

دا سحر چه د وجود شپه ترے نه رہی

د اذان د مسلمان نه پیدا کیږی

نظم "معراج" :۔

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز

کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج!

ترجمہ :۔

چه د شوق ولولے خوند د پروازورکړی

هغه ذره کولے شی دانمر سپو ږمئی تاراج

پہلا مصرع مشکوک، مشکل او پیچیدہ ہونے کی بنا پر بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

چاله چه خوند د پرواز شوق ولوله ورکړی

مذکورہ نظم میں تاراج، دراج، معراج اور محتاج اصلی قافیے ہیں۔ نظم علم و عشق کا یہ شعر :۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن

عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!

ترجمہ :۔

علم راته اووے د امینه لیونتوب نشه

مینے راته اووے دا علم گمان وهم شپه

ترجمے میں نشہ (نشہ) اور شپہ (رات) اضافی ہیں لیکن پھر بھی شعر کے مفہوم پر بار گراں نہیں۔ اس نظم میں حضور، حجاب، ذات ،حیات و ممات، مقام صفات، سکون و ثبات، تاج و نگین، مکان و مکین، زمان و زمین، فتح یاب اور ام الکتاب جیسے الفاظ و مرکبات اپنی اصلی صورت میں ترجمے میں موجود ہیں۔ نظم "شکر و شکایت" کا ترجمہ دلکش ہے۔ ایسے اشعار جہاں قافیے ترجمے میں اصلی استعمال ہوئے ہیں۔ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ مذکورہ نظم کے مندرجہ ذیل مصرعے ملاحظہ کریں :۔

ع تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں

دازما د ساه تاثیر دے چه په دے سوی خزان کښنی

ع لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے

ولے زهٔ دِ پیدا کړے یم یوداسے سپیرهٔ ملک کښنی

ع اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو

ولو له مے نوی ورکړه زړو زړونو ته له سره

ان مصرعوں میں زړو (پرانے)، سوی (جلے ہوئے) اور سپیرهٔ (منحوس) اضافی الفاظ ہیں لیکن ان سے الفاظ کا مفہوم دلکش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے دلوں کو، جلی ہوئی خزاں اور منحوس ملک ترجمے پر بار گراں نہیں گزرتے۔ اس کے علاوہ پیوند، سمرقند، خورسند اور رضامند اصلی قافیے ہیں۔

نظم "تقدیر" میں اصل کی بحرین چست اور مصرعے چھوٹے ہیں لیکن ترجمہ میں مصرعوں کی طوالت اور پیچیدہ بحروں نے ترجمہ کو پھیکا بنادیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت

کله نا اهلو ته حاصل شي جبروت وقوت

ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی

کله ذاتي جوهر تکرے په تکرے ګرځي

شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں

شاید ددے په کار کښنې هم چرته څه پټ منطق وی

تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی

خو تقدیر داسے تابعدار د منطق نه ښکاری

منظوم ترجمے پر نثر کا گمان ہوتا ہے، اس طرح نظم "توحید" بھی ہے

ژوند طاقت وو پخوا! په دے دنیا کښنی توحید

نن صبا څه پاتے دی؟ یو مسئله دکلام(۱)

"ہندی مسلمان" کا ترجمہ دلکش ہے۔ بحریں چھوٹی اور مختصر ہیں۔

بامبران ورته ګدا وائی د ملک

فیرنګے وائی مسلم دے ګداګر (۲)

اسی طرح "قوت اور دین" کا ترجمہ بھی دلکش ہے۔

د چنګیز او سکندر په لاسو دلته

سل سل ځله د انسان ګریوان شو چاک(۳)

غزل کے مطلع میں دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں لیکن مندرجہ ذیل غزل کے ترجمے میں یہ تصور مفقود نظر آتا ہے:

---

(۱) ضرب کلیم، ترجمہ، ص ۱۸
(۲) ایضاً، ص ۳۰
(۳) ایضاً، ص ۳۳

دلِ مردہ دل نہیں ہے' اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

دا د امتو نو د زاړه مرض علاج دے
مړ زړهٔ څه زړهٔ نه دے دا ژوندے کړه دوباره(۱)

نظم "نماز" کا یہ شعر :۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ترجمہ :۔

دایوه سجده چه تاته گرانه بنکاری
خلاصوی بنده له سل زره سجدو(۲)

ترجمے کے دوسرے مصرع کا مطلب ہے کہ انسان کو سو ہزار (ایک لاکھ) سجدوں سے نجات دلاتا ہے لیکن پھر بھی مفہوم پر بار گراں نہیں۔ نظم "قلندر کی پہچان" میں یہ شعر ملاحظہ کریں۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر!

قلندر ته نمر سپوږمئ سر ټيټوی
قلندر په زمانه سورلی کوی(۳)

ترجمے کا مطلب یہ ہے کہ چاند، سورج قلندر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور وہ زمانے پر سواری کرتا ہے۔ ترجمے میں "انجم" اور "ایام کا مرکب نہیں" نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

نظم "امارت" میں :۔

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

ترجمہ :۔

د نقصان په احساس وينه د په جوش کړی
او په فقر د شمشير غوندے آبدار کا

دوسرے مصرع میں شمشیر اور آبدار پشتو الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ "سان" لفظ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بھی ترجمے کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

(۱) ضرب کلیم، پشتو ترجمہ، ص ۲۱ (۲) ایضاً، ص ۳۲ (۳) ایضاً، ص ۳۶

نظم "الہام اور آزادی" میں

؎ اس مرد خود آگاہ و خدامست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

د خان پوهه په خدائے مست سړی مجلس کښې
فقیران د بدبه موسی د پرویز(۱)

ترجمے میں جم (جمشید) کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

فقیران د بدبه سومی د جم پرویز

نظم "مرد مسلمان" میں :۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

هر حالت د مسلمان نوے شان دے نوے آن
په خبرو په کولو د الله د ذات برهان(۲)

دوسرے مصرع میں کردار مفقود ہے۔ نظم "قم باذن اللہ" میں دگرگوں، گردوں اور افسوں کے پشتو تراجم ندارد، بعض اشعار کا جب تک اصلی کلام اقبال کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کیا جائے، مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ان منظومات میں زمانہ حاضر کا انسان، اقوامِ مشرق اور عصر حاضر قابل ذکر ہیں۔ نظم "آگاہی" میں :۔

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس
نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ

ترجمہ :۔

د آسمان په سیل کښې ورک نجومی کله
له خپل ځان او له مقامه دے خبر!(۳)

ترجمے کا مطلب ہے کہ آسمان کی سیر میں کھویا ہوا نجومی اپنے آپ اور اپنے مقام سے کب آگاہ ہو سکتا ہے۔ لیکن مترجم کا اندازِ بیان ڈھیلا اور سست ہے۔ بحریں طویل ہونے کی وجہ سے ترجمے کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں اصلی جیسی چابک دستی باقی نہیں رہتی۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

تو رہ نورد شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

(۱) ضرب کلیم (پشتو) ترجمہ، ص ۵۱،
(۲) ایضاً، ص ۵۷
(۳) ایضاً، ص ۶۸

ترجمہ :۔

نه چه د شوق په لاره ځے لو منزل مه قبلوه

درسره کښيني که ليلىٰ خو محمل مه قبلوه(۱)

نظم"خودی کی تربیب" میں :۔

یہی ہے سرِ کلیمی ہراک زمانے میں

ہوائے دشت وشعیب وشبانیٔ شب وروز

ترجمہ :۔

په هره زمانه کښے دغه راز د کليمی دے

شعيب او شبانی او ورځ شپه مينه د صحرا(۲)

ہوائے دشت کا ترجمہ محبت صحرا کیا گیاہے،جس سے مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

نظم "ہندی مکتب" ترجمے میں نظم کا عنوان (مکتب) رکھا گیاہے۔ نظم "خوب وزشت" میں فکر اقبال کو مد نظر رکھ کر ترجمے میں مفہوم کا حق ادا کر دیا گیاہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو،وہ جمیل

جو ہر نشیب میں پیدا ، قبیح ونا محبوب

چه په غر د خودئ اوخيژی ښيښنه شی

او چه کنده کښے وی نه وی د کتو(۳)

نظم"مدرسہ" میں :۔

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا

زندگی موت ہے کھودیتی ہے جب ذوق خروش

ترجمہ :۔

زړهٔ دِ درګوی حريفا نه کشاکشو نه

ژوند مرګ شی چه ذوق ورک شی د ګوتو خبنوو(۴)

ترجمہ اتنا بے ذوق اور مشکل ہے کہ سمجھ سے بالاتر ہے،اس لیے ترمیم کی ضرورت ہے۔اسی طرح یہ

ع جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

سپکر غلامئې کړے د خفاش په شان کتو

---

(۱) ضرب کلیم(پشتو ترجمہ)،ص ۷۱

(۲)ایضاً،ص ۷۴

(۳) ایضاً،ص ۷۹ (۴)ایضاً،ص ۸۲

لفظ خفاش نے ترجمے کو مشکل بنادیا ہے۔ نظم "اساتذہ" کا یہ شعر ملاحظہ ہو :۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

ترجمہ :۔

چه امامت به ئے دخپلے زمانے کړے شو
هغه زاړه و ختونه ګرځی زمانے پسے (۱)

(جو اپنے زمانے کی امامت کرتے تھے وہ پرانے اوقات اپنے زمانے کے مقلد ہیں۔)

دوسرے مصرع میں "وختونه" کی جگہ دماغ یا خلق چاہیے "غزل" کا مصرع :۔

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس

هغه بزم د یو دوؤ لحظو میلمه دے

ترجمے میں عیش کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ع صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

صباهم نه درکوی د ګل سراغ (۲)

اگر چہ بوئے گل کا ترجمہ گل کیا گیا ہے لیکن پھر بھی مفہوم میں خلل انداز نہیں ہے۔ نظم "جاوید سے"

ع شاخ گل پر چہک ولیکن

د چمن د ګل په خانګو ګرځه خیر دے (۳)

(چمن کے پھولوں کی شاخوں پر گھوم پھر) ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

د چمن د ګل په خانګه نغمے وایه

"مرد فرنگ" میں :۔

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

ترجمہ :۔

قصور واره نه ده ښځه په دے باب کښې
دی ګواه په شرافت ئے ورځ او شپه (۴)

---

(۱) ضرب کلیم، پشتو ترجمہ، ص ۸۴
(۲) ضرب کلیم (پشتو ترجمہ)، ص ۸۵
(۳) ایضاً، ص ۸۶
(۴) ایضاً، ص ۹۰

(اس باب میں عورت قصوروار نہیں ہے۔ اس کی شرافت پر دن رات گواہ ہیں) مترجم نے مہ و پرویں کا ترجمہ دن رات کیا ہے جو کہ غلط ہے۔ نظم "شاعر" میں نے، لے، مئے، کے، طے اصلی قافیے استعمال ہوئے ہیں ورنہ ترجمہ دلکش ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے!

شاعر! تیرے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے!

اے شاعره ستا سینه کښې چرته ساه شته دے که نشته

د مشرق په نیستان کښې د نفس محتاج ده نے (۱)

"ہنروران ہند" میں :۔

ع ان کے ریشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

د قوسونوئے فکرونو کښې مزار

ریشہ تاریک کا ترجمہ "فکرونو" کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ نظم کا ترجمہ مثالی ہے۔ "رقص و موسیقی" اور "ضبط" میں سوز، سرود، خلوت، اہرمن، اور "مشرق" میں دارورسن جیسے مشکل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ورنہ علاوہ ازیں ترجمہ مثالی ہے۔

مری خودی سزا کی ہے مستحق لیکن

زمانہ دارورسن کی تلاش میں ہے ابھی!

د سزا لائقه ده زما خودی هم

زمانه دارورسن تلاش کوی لا (۲)

نظم "گلہ" میں :۔

دہقان ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ

بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے!

دهقانان ئے لکه مړهٔ له قبره ختی

چه کفن ئے لا وس هم زیر زمین دے (۳)

مترجم نے بوسیدہ کو نظر انداز کیا، زیر زمین کا ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دہقان کو جمع استعمال کیا۔

نظم "انتداب" کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو :۔

جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں

جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری

چه بربنډے نه وی ښځې ، شراب نه وی

او حرامه شی ګڼړلے جواری (۴)

(۱) ضرب کلیم، پشتو، ص ۱۲۶ (۲) ایضاً، ص ۱۴۳ (۳) ایضاً، ص ۱۵۲ (۴) ایضاً، ص ۱۵۲

مترجم نے خواری اور قمار کا آپس میں تبادلہ کیا ہے۔ ترجمہ اس طرح مناسب ہوگا۔

چه جواری نه وی د تنگو جامو بنځے نه وی
چرته چه حرامه مشغله وی ہے خواری

جسوروز یرک وپژدم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیض مکاتب کا چشمۂ جاری

لاخامن ئے ننګیالی، مردان زیرک وی
د مکتب د فیض چینے نۀ وی جاری (۱)

ترجے میں "بدوی" کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف "بچے" کا ذکر کر کے ترجمہ کو مشتبہ بنادیا ہے۔ "شام و فلسطین" کا نمونہ :۔

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا

تل دِ میخانه آباده اوسی د فرانسیانو
ډکے د سرو وینو نه ښیښے دی د حلبو (۲)

ترجے میں رندان کو ترک کر کے مئے گلرنگ کا ترجمہ سرخ خون کیا گیا ہے۔ ترجمہ اس طرح بہتر ہوگا۔

سلامت دے میخانه وی د فرانسیسے د رندانو
له سرو شرابو ډک دوی جامونه د حلب

"نفسیات حاکمی" میں :۔

یہ مہر ہے بے مہریِ صیاد کا پردہ
آیانہ مرے کام مری تازہ صفیری

پکار نه شو زما نوی اسویلی هم
دے کرم ده پټه کړی بے مهری (۳)

ترجمہ مشکوک ہے۔ اور اس سے کوئی مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

"محراب گل افغان کے افکار" (۳) کے ترجمے میں چار سو اور رسم کدو مشکل الفاظ کا ترجمہ مفقود ہے۔ نمبر ۱۱ میں :۔

جس کے پرتو سے منور رہی تیری شبِ دوش
پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغ خاموش

---

(۱) ضرب کلیم (پشتو ترجمہ)، ص ۱۵۹
(۲) ایضاً، ص ۱۶۴
(۳) ایضاً، ص ۱۷۵

چه روښانه ئے په نور ده توره شپه

بلیدلے شی بیا هغه مړه ډیوه

پہلے مصرع کے ترجمے کا مطلب ہے کہ جس کے نور سے اندھیری رات روشن ہے۔ ترجمہ فعل حال میں ہے اس لیے غلط ہے۔ دوسرے مصرعے میں بھی فرق ہے۔ ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا۔

ے ستا پرونئی شپه ئیے په عکس چه منوره وه نو

کیدے شی بله شی بیا هم هغه مړه شوے ډیوه

نمبر ۱۳ میں مصرع :۔

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی

دَبے زوره ژوند کولے تلافی شی

ایک تو ترجمہ بغیر اصل کے سمجھ میں نہیں آتا، دوسرا "بے معرکہ" کے معنی بے زورہ (بے طاقت) کیا گیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

بغیر د معرکے دژوند کولے تلافی شی

وہ ترجمہ جس میں اصل کے مفہوم کو مد نظر رکھ کر بامحاورہ ترجمہ کیا جائے وہی معیاری ہوتا ہے۔ جہاں الفاظ کو مد نظر رکھا گیا ہے وہاں مفہوم ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ عموماً وہ منظومات جن میں اصل قوافی مستعمل ہیں معیاری اور دلکش ہیں۔ ذیل میں وہ منظومات مندرجہ ہیں جن میں اصل قوافی استعمال ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کے استعمال سے وزن بحر چست رہتے ہیں لیکن ترجمہ پیچیدہ اور مشکل ہو کر رہ جاتا ہے۔

منظومات	قوافی
شکست :۔	شراب، الست، دست بدست، شکست
مردانِ خدا :۔	عیاری، کلاہ داری، چنگاری، زناری
کافر و مومن :۔	تریاق، براق، آفاق
آزادی :۔	خداداد، آباد، ایجاد، آزاد
امرائے عرب :۔	بے ادبی، بولہبی، عالم عربی
احکامِ الٰہی :۔	خردمند، خورسند، پابند
مقصود :۔	وجود، نمود، مقصود
مغربی تہذیب :۔	تہذیب، عفیف، ذوقِ لطیف
اسرار پیدا :۔	فولاد، آزاد، خداداد، افتاد

غزل، ص ۲۷ :۔ حجازی، بے نیازی، گدازی، شاہبازی، کارسازی، نے نوازی

ہندی مکتب :۔ مقالات، مقامات، اوقات، مناجات، کرامات، نباتات

تربیت :۔ دماغ سراغ، ایاغ، چراغ

غزل، ص ۸۴ :۔ سراغ، چراغ، فراغ، مازاغ، ایاغ

دین و تعلیم :۔ گزاف، خلاف، انصاف، معاف

جاوید سے :۔ کافرانہ، آستانہ، جادوانہ، شبانہ، تازیانہ، عارفانہ، فرنگیانہ، آشیانہ، بیکرانہ، دانہ، خامی، کہنہ دامی، تشنہ کامی، غلامی جامی، زیبامی، گرامی، بلند نامی، نظامی وغیرہ

دین و ہنر :۔ یکدلنہ، کاشانہ، افسانہ، بیگانہ

تخلیق :۔ جہاں، بیکراں، جاوداں، رازداں، ہم عناں

مسجد قوت الاسلام ذوقِ نمود، مقامِ محمود، وجود، نبود، درود، سجود

شعاعِ امید :۔ پیغام، آرام، بام، سیماب، جہاں تاد، گراں خواب، سیراب، پایاب، مغراب، محراب

امّید :۔ جنوں، کارفرمائی، رعنائی، دشتِ پیمائی، رسوائی

نگاہِ شوق :۔ بینائی، کارفرمائی، رعنائی، دشتِ پیمائی، رسوائی

غزل، ص ۱۱۱ :۔ خس و خاک، نمناک، افلاک، چاک، ے تاک، ادراک، پاک

سرود :۔ مئے، نَے، کَے، پے در پے، رے، طے

اہل ہنر سے :۔ وجود، کبود، سرود، سجود، امیر جنود

اہرامِ مصر :۔ تعمیر، تصویر، نخچیر

اقبال :۔ آش (شوربا)، فاش

جدّت :۔ نظر، سحر، قمر، گوہر، ہنر، گدائی، رسائی

جلال و جمال :۔ ادراک، افلاک، بیباک، (اس کے علاوہ سرود اور سرکش بھی اصل سے نقل ہیں)

سرودِ حلال :۔ کشود، محمود، لاموجود، سرود، (زیروبم اور مطرب مشکل الفاظ اور اصل سے نقل ہیں)

مناصب :۔ نمناک ہلاک، ادراک، چالاک

یورپ اور یہود :۔ تعلّی، تجلّی، متولّی

نفسیات غلامی :۔ زمانہ یگانہ، افسانہ

لادین سیاست :۔ بصیر، ضمیر، سفیر

دام تہذیب :۔ خریدار، افکار، گرفتار

اس کے علاوہ "نصیحت" میں سیر، شیر، زیر، پیر۔ "ایک بحری قزاق اور سکندر" میں پہنائی، رسوائی، دریائی۔ "سیاسی پیشوا" میں کمند، پیوند، بلند۔ " غلاموں کی نماز" میں امام، غلام، نظام، حرام، پیام۔ "محراب گل افغان کے افکار" نمبر ۱ میں خاک، پاک، تابناک، ہلاک، چاک۔ نمبر ۵ میں روارو، جو، تک ودو، پرتو، ضو۔ نمبر ۶ میں زمانہ، یگانہ، شبانہ، بہانہ۔ نمبر ۹ میں مگس، قفس، جرس، نفس، بس۔ نمبر ۱۲ میں الا ھو، آہو، آب جو، رنگ وبو، ترش رو۔ نمبر ۱۴ میں ید اللّٰہی ، راہی، آگاہی، شہنشاہی۔ نمبر ۱۵ میں فقیر، امیر، حریر، نذیر۔ نمبر ۱۶ میں خدائی، گدائی، رائی، حنائی، "فقر و راہبی" میں رہبانی، طوفانی، عریانی، فانی، فغیانی۔ "عورت" حصے کی منظومات کا ترجمہ دلکش اور عام فہم ہے لیکن مکدر، گوہر، میسر، سوزدروں، درمکنوں قند، خرد مند، نگہبان درخشان،، نمود، وجود، نابود (نبود) اور کشود اصلی قوافی مستعمل ہیں۔ "نگاہ" میں رعنائی، پہنائی سپہر مینائی، زیبائی، "وجود" میں صورت گری اور مشکل الفاظ ۔ "فنون لطیفہ" میں مترجم نے شرر، نیساں، نوا، مغنی، اور ضرب جیسے الفاظ کے پشتو الفاظ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "مصور" میں تخیل، مقلد، بہزاد عن اور سرود ازلی جیسے الفاظ (مشکل الفاظ) استعمال ہوئے ہیں۔ مندرجہ بالا قوافی والفاظ، جو کلام اقبال سے من و عن ترجمے میں استعمال ہوئے ہیں، نے پشتو ترجمے کو پیچیدہ اور بعید از فہم بنادیا ہے۔

ذیل میں املائی اغلاط درج کی جاتی ہیں۔

صفحہ	غلط	صحیح	صفحہ	غلط	صحیح
10	برکستان	برکساں	105,76	غر	نمر
30	مظبوتو	مضبوطو	113	قدمونو	قومونو
21,88	فکر	فقر	139	هلته	دلته
77	فقر	فکر	148	اوسی	اوسئی(هوسئی)
91	خیران	حیران	164	سبت	سبب
99	بے کران	بیکران	172	استاته	اوساته
99	هم غنان	هم عنا	174	جنک	جنگ

کئی مصرعوں کے وزن، بحر اور ترتیب کو ذیل میں درست کیا گیا ہے۔

صفحہ	اغلاط	صحیح
11	نجاری ځنے قرشی رهنما بنهٔ دے	نجاری نه قرشی------
25	د دغه دین نو دویم نوم هم شته دے فقرِ غیور	ددغه دین یو----------
27	ستا په نظر کښے ده د معجزو دنیا	--------- د معجزاتو دنیا

28	اوکړه غم د ستا وجود دے بے نمود	اوکړه غم ستا وجود -------
29	که د سحر څیره پریشانه وی نو هیڅ هم نه وی	که د سحر برق----------
30	څه چرته یو غار کښې تسبیح اروه الله اکبر کړه برے یاد	"اکبر" اضافی ہے
31	سمندر کښې دے سکون دے دا سکون دے که فسون دے	ستا دریاب ولاړ دے دا سکون دے که فسون دے
	نه نهنګ نه طوفان شته نه خراب کرانه	نۀ نهنګ طوفان----------
	ستا په نیستان کښې د سحر نغمې خورې کړې	تا په نیستان----------
34	هم یو شے دده له حده نه شی تلے په ځنګ	هیڅ یو شے-------
	حقیقت او امات	حقیقت د امامت
52	ستا مشکل ئے له ساغره	ستا مشکل ئے د ساغره
55	ځان پوه کړه زما په نوائے سحری	ځان پوئے کړه زما په نواهائے سحری
	او گوره ته دارو ئے د پریشانه نظری	اوس دارو ئے اوکړه د آشفته نظری
	انعام د تانه غواړی زما آشفته سری	ستا نه انعام غواړی زما آشفته سری
56	هغه فیرنګی مجذوب په چند طریقه	------- په څو چنده طریقه
57	دایو راز د هر چاپټ دے لا تراوسه چه مومن	دا یو راز له هر چا--------
	هسے ښکاری خو قاری خو حقیقت کښې ده قرآن	د قرآن لوستونکی ښکاری حقیقت کښې دے قرآن
	د فیرنګی رور ولی ده ، د نسب په نظام	د فیر نګیانو رور ولی-------
68	دنظر ښه اوبد پیژنی هغه	دنظر ښه اوبد پیژنی ؟ دزړه
	د حلال حرام د زړه نه دے خبر!	له حلالَ له حرامَ دے خبر
77	محکوم ته هر لحظه وی	محکوم ته هر ساعت وی
84	هغه زاړهٔ وختونه	هغه زاړه ذهنونه
	زمانے کړے شو	زمانے کړلے شو
87	چه لوئی موسے کوم ځائے کښې	چه وی ځائے ستا د لوئیئ
	څهٔ زما په شوی ولئی کښې	څه زما په څوئ ولئی

105 عجب خائے دے دنیا----------
راشئی بیا راغونه شئی---------
د نفس محتاج ده نیِ
126 دافلاک دلاندے نشته

څه خائے دے دنیا------------
راشئی بیا راغونډے شئی---------
دنفس محتاج دے نۓ
د افلاکو لاندے (۱)

مندرجہ بالا اغلاط، کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود بھی منظوم ترجمہ کرنے کی سعی مذکورہ قابل ستائش ہے۔ کیونکہ مترجم قافیہ پیمائی کی دھن میں مطلب کو قربان کرنے کے لیے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسری زبان کے الفاظ ہوں یا اصل کلام کے قوانی، جس کے استعمال کے بغیر شاعر کو چارہ کار نہیں۔ شاعری کے فن میں عروض کی بڑی اہمیت ہے۔ بحور کی بے قاعدگی اور اوزان کی غیر ہم آہنگی شعر کے مصرعوں میں تفاوت کو بڑھا دیتا ہے۔

ذیل میں چند اشعار پیش خدمت ہیں جو مترجم کو تراجم میں اہم مقام دلاتے ہیں۔

نظم "فلسفہ" میں :۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

ترجمہ :۔

هوښیار نه نخښلی په دام کښے د الفاظو
سر جو نړا غواړی صدف او که ګوهر
پیدا ہے فقط حلقہ اربابِ جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
هغه عقل لیونو سره موندے شی
چه راغونډے سرے لمبے کړی دشرر

"اے روحِ محمدؐ" میں :۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے
د خدایه بخښلی ملت غونډه شیرازه خوره شوه
اوس راته تهٔ اووایه ستا مسلمان جرته لاړ شی

(۱) تقویم الحق کاکاخیل "ضرب کلیم پشتو ترجمہ" ماہنامہ پشتو، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۲۱، ۲۳، ۲۴

"مدنیتِ اسلام" میں :-

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت ، عرب کا سوزِ دروں

د جبریل ذوقِ جمال کړه دعجمو حسنِ طبع
د عربو د زړه سوز کړه د مسلم ژوندون دے دا

ترجمے میں "د مسلم ژوندون دے دا" (یہ مسلمان کی زندگی ہے) یہی اضافی جملہ ہے لیکن الفاظ کا حسنِ ترتیب اور دلکش انداز قابل ستائش ضرور ہے۔ یہی اضافی جملہ شعر کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

"شاعِ امید" میں :-

مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش

خوند دتماشے لا د مشرق نه ورک خو نه دے
بیا هم د لاهوت غوندے خاموشه تورے شپے

اگر چہ مشرق لذتِ نظارہ سے محروم نہیں ہے لیکن پھر بھی لاہوت کی اندھیری راتوں کی طرح خاموش ہے۔ مترجم نے اندھیری راتیں (تورے شپے) کہہ کر مفہوم کو قابل فہم بنادیا ہے۔ جس سے لاہوت کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے۔

"شعر عجم" کا نمونہ

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نمائندہ بہ پرہیز!

دا وخت دے د ګټانو د تراشلو اے قباله
بس هر چه د آینے غوندے وی کړه ترِ نه پرهیز!

"ابن سینا" میں :-

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
تهذیب کمال ته اورسیدهٔ لاړهٔ شرافت
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش!
قومونه په لوټو لو خپل ځانونه پایوی
ہر گرگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش!
هر پړانګ ځان ته ماشوم غوندے ورغوسے لټوی

" سلطانی جاوید" میں :۔

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیت پرویز
لا ژوندی دی ماتول د فرهاد کانړی
او رخصت ملوکیت شو د پرویز

"مسولینی" کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
زه چه چج کوم دانے چانړولے خفه کیږی
دواړه صفائی ده چانړ دتا او چج زما
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج
تاسو پټی لوټ کړو تاسو لوټ کړو تخت وتاج
تاسو د بے کسو خیمے لوټ کړے په صحرا

یہ چند مثالیں مترجم کے علم و فن اور ایک اچھے شاعر ہونے کے لیے کافی ہیں۔ کیونکہ ہر شاعر کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا کلام معیاری اور غیر فانی ہو لیکن بہتر سے بہتر کلام کو بھی جب نکتہ چینی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تو ہزاروں کوتاہیاں اور فرد گزاشتیں نظر آتی ہیں۔ کلام صرف اللہ تعالیٰ کا ہی بے عیب اور مثالی ہے۔ اسی طرح ضرب کلیم کا ترجمہ ایک منظوم ترجمے کا درجہ ضرور رکھتا ہے لیکن اس پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے، تاکہ مثالی ترجمے کا درجہ حاسل کر سکے۔

ب

کتاب :- **زبورِ عجم** (۱۹۲۷ء)

مترجم :- سیّد محمد تقویم الحق کاکاخیل

ناشر :- پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سن اشاعت :- جولائی ۱۹۶۱ء

صفحات :- ۲۰۸

﴾۔۔۔زبور عجم۔۔۔﴿

تصنیف کا تعارف :۔

یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر آربری نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ۱۹۴۹ء میں کیا۔اس کے تین حصے ہیں۔
پہلا حصہ ، خاص زبور عجم "دو حصوں پر مشتمل ہے
۱۔ صحیح انسانی تخیل میں انسان کیا ہستی ہے۔
۲۔ صحیح انسانی تخیل میں خدا کو کس شان میں دیکھنے کا متمنی ہے۔
دوسرا حصہ "گلشن راز جدید" اور تیسرا حصہ "بندگی نامہ" پر مشتمل ہے

زبور حضرت داؤدؑ کا آسمانی صحیفہ تھا۔ جس کے معنی "ٹکڑوں" کے ہیں۔اقبال کے نغمے ، غزل کے ٹکڑوں کی صورت میں حروف والفاظ کی قید میں آئے۔ مشرق کے بندوں کی اصلاح کا پاکیزہ مقصد شاعر کو وقتاً فوقتاً آسمان سے زمین پر لاتا ہے۔ پہلے حصے میں ایسی جوش انگیز و دلآویز نظمیں ہیں جو مشرق کو بیدار کرنے کے لیے لکھی گئیں۔ "گلشن راز جدید" اسرارِ حیات فرد کی نئی انداز کی تعلیم سے اسرار خودی کی یاد تازہ کراتی ہے۔ اور "بندگی نامہ" محکومیت کی لعنتوں کے ذکر سے خائف ولرزاں ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ پہلا حصہ عشق ہے اور دوسرا حصہ دعوت۔ حقائق عشق شانِ کبریائی کا آئینہ ہے اور دوسرے حصے میں اقبال کے دل کی اس تڑپ کا پتہ چلتا ہے جو اسے ہر وقت بنی نوع کو منزل حقیقت تک پہنچانے میں بیتاب رکھتی ہے۔ شاعر کبھی فرش سے اٹھ کر عرش پر حضورِ باری میں پہنچ جاتا ہے۔اپنی تمام آرزوئیں، مقاصد اور بنی نوع کے مقاصد، اس کی لغزشیں، اس کے خلاف شکوے، خود خدا سے بعض امیدوں کے نہ پورا کرنے کے گلے اس کے سامنے عرض کرتا ہے۔ راستہ دکھاتا ہے۔ ہمت بڑھاتا ہے اور منازل و مقاصد کی خبر دیتا ہے۔ پہلی صورت میں لب پر آنے والے اشعار عشق کے ترانے ہیں جبکہ دوسری صورت دعوت و پیام کی ہے۔ دونوں حصوں میں بعض ٹکڑے بجائے خود پیغام ہیں۔

اقبال صاحبِ پیام ہیں اور انھوں نے پیام کو غزل میں ادا کر کے اپنے جوہر کے کمالات دکھائے ہیں۔ غزل کو پیام کے درجے تک لانا بذاتِ خود قابل ستائش ہے۔ خود اقبال جب اس تصنیف کے زمانے میں دو طویل و مستقل پیاموں کا حامل ہوا ہے تو خود بخود غزل کو چھوڑ کر مثنوی کی راہ اختیار کر گیا ہے۔ گلشن راز جدید اور بندگی نامہ مستقل پیام ہیں اور اسی لیے مثنوی میں ادا ہوئے۔ حصہ اول میں دعا کے بعد ۶۶ ٹکڑے ہیں گویا ۶۶ نغمے اقبال نے باری تعالیٰ کے حضور لحن داؤدی کے ساتھ عاشقانہ رنگ میں الاپے ہیں۔اس میں عاشق انسان نے اپنے معشوق خداوند سے کہیں عجز و نیاز سے التجائیں کی ہیں تو کہیں شوخی و ناز سے شکایتوں اور تقاضوں کا باب کھولا ہے۔ افتتاحیہ دعا ایک طرح سے خدا کے سامنے بندوں کے موجودہ حال کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ مشرق کے طلوع

صبح اور کمتر بیداری سے شاعر کو قدر تسکین ملتا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے ہم جنسوں کی مدد ویاوری کے لیے چند تو تیں خدا سے مانگی ہیں تا کہ غلامی سے نجات پا کر خدا کے مقبول بندے بن سکیں۔

یارب درونِ سینہ دل ماخبر یدہ

درباده نشہ رانگرم آں نظر بدہ

شاہین من بصید پلنگاں گزاشتی

ہمت بلند وچنگل ازیں تیز تربدہ

ترجمہ :۔

خدایه د سینے دننه زړهٔ باخبر راکړه

وینم چه باده کښې نشه داسے نظر راکړه

تا لکه شاهین د پلنګانو په ښکار پریښنوم

کلکے پنجے راکړه، همت راکړه ، وزر راکړه(۱)

حصہ اول کا ہر شذرہ جہاں عشق کا نغمہ ہے وہاں اپنے خالقِ حقیقی سے ایک حقیقی عہد کی دعا بھی ہے۔ توحید انسان کا جوہر و منبع ہے۔ اس کے بغیر زندگی عبث اور بے معنی ہے۔ شاعر نے بارگاہِ الٰہی میں چند ایسے سوال کئے ہیں جن کے جواب دنیا کا کوئی عاقل و فلسفی آج تک نہیں دے سکا۔ ان اسرار کا مبدأ وہ حی وقیوم ہستی ہے، جس کے سامنے شاعر استفہام واستعجاب کے لہجے میں نغمہ پیرا ہیں۔ انبیائے کرام نے سب سے پہلے اس ذاتِ واحد کا پتہ بتادیا ہے، جس کو انھوں نے ایک، لاشریک، حی وقیوم، لم یزل، رب العالمین، اللہ دیکھا اور انسانوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اقبال کے سامنے خداوہ حقیقت اور مطلق حقیت ہے جسے وہ دیکھ رہا ہے۔ اور جس سے وہ مخاطب ہوتا ہے۔ وہ توحید وایمان کا کوئی نیا خیال نہیں دے رہا مگر عشق کی بدولت معرفتِ توحید اور حقیقت ایمان کے راز ہمیں ضرور نئے انداز میں دے رہا ہے اور ان اسرار کو عقل وادراک کی اس محک پر پرکھ کر لاتا ہے کہ دانایانِ فرنگ کو اس کی تعلیم سے چارہ نہ رہے۔ اقبال اس ادراک سے پاک ہے جو دل پر نقشِ باطل کھینچتا ہے۔ کبھی کبھی صحیح ادراک صحیح عشقِ الٰہی کا منبع بھی ہوتا ہے۔ اقبال کا جنون پیدا ہی انتہائے فرزانگی سے ہے۔

گہے رسم و رہ فرزانگی ذوقِ جنون بخشد

من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آیم!

کله کله عقل د جنون دلار رهبر شي

زه خیرے گریوان د عقلمندو له خوا راغلم (۲)

---

(۱) سید تقویم الحق کاکا خیل ، مترجم ، زبور عجم ، اقبال اکیڈمی کراچی ، جولائی ۱۹۶۱ء ، ص ۳

(۲) ایضاً ، ص ۲۸

اقبال ایک ایسے دل کا آرزو مند ہے جس کے ذریعے وہ خود دار و خود آگاہ ہو کر شجاع و غیور بن کر محبت والفت کی کمندیں بنی نوع کی گردن میں ڈال سکے۔ تقدیر کے ہاتھوں نالاں نہ رہے۔ جہانگیری کے طریقے اگر چہ فرسودہ ہوگئے ہیں لیکن زندگی بذاتِ خود فرسودہ نہیں۔ اسے نیا میدان مارنا ہے۔ ہر حضوری میں دل کا مضمون شاعر کے لب پر رہا ہے۔ خالق سے اس کی شکایتیں ہیں اور زندہ تر وروشن تر دل کا مطالبہ ہے۔

ے ایں دل کہ مرا داوی لبریز یقیں بادا
ایں جام جہاں بینم روشن تراز یں بادا

زړهٔ چه دے راکړے اوس ئے ډک کړه له یقینه
جام زما رنړا کړه زیات له جام جهان بینه (۱)

جب حضوری سے علیحدہ اپنے آپ کو تصور کرتا ہے تو دل کے کمالات اور کرشموں پر نظر ڈالتا ہے اور بے خود دل کے وہ کارہائے نمایاں بیان کئے جاتے ہیں جس کی قوتیں اور معجزوں کی دنیا روشن ہونے لگتی ہے۔

ے دل بے قید من بانورِ ایماں کافری کردہ
حرم را سجدہ آوردہ بتاں را چاکری کردہ

کبھی تو اقبال خدا کے پاس جاتا ہے اور کبھی کبھی خدا اس کے ہاں آجاتا ہے۔ کبھی دل کو بھی خدا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ کہ اسے تسلی دے دی جائے۔ واپس ملتا ہے تو پھر اُسی طرح بے قرار ہوتا ہے۔ وہ زمانہ بھی آتا ہے کہ محبت سر راہ انتظار اور محبوب بے پروا اپنے خرام میں مست پاس سے نکلتا ہے کبھی اس کا مشاہدہ ہے، کبھی سطوت و جبروت۔ عدم سے وجود اور وجود سے عدم اور پھر عدم سے وجود میں آنے کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہے۔ عشق خداوندی اور ایمان وایقان کے رموز کا بے پایاں سمندر ہے۔ ایمان کی انتہائی منزل معرفتِ توحید کی وہ منزل ہے جو مشاہدہ اور قلبی تجربہ سے حاصل ہو۔ یہ ایمان و عشق اقبال تمام دنیا کو دینا چاہتا ہے۔

خدا کے حضور دنیا اور اہل دنیا اور بالخصوص مغرب کی شکایتیں ہیں۔ مغرب کے گمراہ کن علوم وفنون کی کرشمہ طرازیوں کی شکایتیں اور اہل مشرق کے صحیح مذہب کو رسوم کی شکل دے کر اپنا الو سیدھا کرنے کی شکایتیں ہیں تا کہ گمراہ مخلوق کو ابدی حیات کا پتہ دیا جائے۔ اقبال کے لیے ناممکن تھا کہ خدا کے سامنے کھڑا اور یہ کہے۔

ے مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہان را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی
چہ ملائی چہ درویشی چہ سلطانی چہ دربانی
فروغ کاری جوید بسا لوسی و زراقی (i)

---

(۱) زبور عجم (ترجمہ)، ص ۴۶

(i) سالوسی :۔ مکاری زراقی :۔ (نیلی)، دھوکہ

خپرے کړے مغرب چینے د علم وعرفان واړه
یو تیاره کړه جوړه مشائی او اشراقی
څه که ملائی که درویشی که سلطانی ده
څوک په سالوسئی کتی او څوک په زراقی(۱)

حصہ دوم کے ۵۷ ٹکڑے ہیں۔ خدا سے جو باتیں سیکھی ہیں وہ بندوں کو بتاتے ہیں۔ خدا کے گھر سے آنے کے بعد سب سے پہلے اپنی حقیقت اپنے ہم جنسوں پر واضح کرتے ہیں تاکہ پیام سننے اور اس پر فوری عمل کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ زبور کا یہ حصہ مثنوی گلشنِ راز جدید کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ تمہید مضمون میں گوئٹے اور شلر کا ذکر آیا ہے۔ اقبال میں گوئٹے اور شلر دونوں جمع ہیں۔ چودھری محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ مثنوی کا اقبال گوئٹے ہے اور غزل کا اقبال شلر(۲)۔ گوئٹے کسی پاک و منزہ ہستی کے جمال کا نظارہ دیکھنے کے لیے بیتاب ہے۔ لفظوں سے تنگ معنی کی تلاش میں ہے اور کائنات کے اسرار و رموز کے نشہ میں ہر آں مست ہے۔ گوئٹے اور شلر کو اسوہ انسانی خود پیدا کرنا تھا۔ اس کے برعکس رومی اور اقبال آگاہ ہیں کہ مکمل ترین اسوہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس اسوہ کو بنئی نوع انسان اور بالخصوص امت کے سامنے لانا ان کا فرض ہے۔ دونوں جانتے ہیں کہ شیکسپیئر، گوئٹے، ڈینٹے اور شلر کے تخیل کی ہزار پروازیں وہ انسان پیدا نہیں کر سکتی جو محمدؐ عربی پیدا کر گیا ہے۔ رومیؒ نے قرآن و حدیث کے اخلاقی و روحانی نکات سہل انداز اور دلکش پیرائے میں مشرق کے کونہ کونہ میں پہنچا دیے۔ اللہ اور عباد کے حقوق کو شعر کی صورت میں روح کی غذا بنا دیا۔ اقبال کا زمانہ محکومی اور غلامی کا زمانہ تھا۔ ایک جانِ نو رومی نے مشرق کے انسان کو عطا کی تھی اور اب ایک مگر نئی قسم کی جان ان میں پیدا کرنا اقبال کا مقصد تھا۔

حصہ دوم میں اقبال نے چند باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ عجمیوں کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ آزادی کی نعمت سے آشنا کرنا اور محکوموں کے دلوں پر حکمرانوں کے علوم و فنون اور تمدن و تہذیب کی جو سکے بیٹھے ہیں ان کی حقیقت کی توضیح۔ نام نہاد پیشواؤں کی تقلید سے آزادی کا اعلان۔ عجم مشرق میں بیداری کے آثار، حالات کی مساعدت، بھولے ہوئے فرائض و مقاصد کی یاد۔ مشرقیوں کا کسی حد تک مصائب و مشکلات پر قابو پانا۔ موجودہ خطرات کو خاطر میں نہ لانا۔ غافلوں اور درماندوں کو عبرت ناک تازیانے۔ نئے فتنہ کا خطرہ اور کسی خضرِ وقت کی آمد کا موقع و انتظار۔ حیات حقہ کے مقاصد، مشرق و مغرب کے لیے اسکے حصول کا طریقہ اور بحیثیت انسان عروج کی منزل۔ انسان کی محدود موجودہ ترقی، تسخیر مادہ اور تسخیر زمان و مکان، انسان کا اصل مقام، مقام ابدیت، عشق و شوق و درد انسان کا خاصہ ہے۔

زبور عجم کا ترجمہ پشتو اکیڈیمی پشاور اور اقبال اکیڈیمی کی مشترکہ کاوشوں کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ ترجمہ جولائی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ سید محمد تقویم الحق کاکاخیل ایک عالم فاضل شخص تھے جنہوں نے عربی، فارسی لسانیات و ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔

---

(۱) زبور عجم (ترجمہ)، صفحہ ۲۵

(۲) محمد حنیف شاہد، مرتب، اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، طبع اول، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۳

قران وحدیث، منطق، صرف و نحو پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کے فلسفے اور علمائے اسلام کے نظریات سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے ترجمے (زبورِ عجم) کا ایک مبسوط تعارف بھی پیش کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

زبور عجم کا تعلق اہل ذوق و خلوت اور درونِ خانہ سے ہے۔ یہ کتاب فلسفیانہ رنگ میں ہے کیونکہ اقبال کی پختہ عمر کا کلام ہے۔ موضوعات عموماً مابعد الطبیعاتی یا ذہنی مجردات ہیں۔ زندگی اور خودی کا خدا تعالیٰ سے تعلق جیسی باتوں کا بیان ہے۔ اقبال کا مابعد الطبیعاتی فلسفہ مشرق و مغرب کے فلسفے کا مرکب ہے جس کے لیے مشرق و مغرب کے فلسفے کا مطالعہ ضروری ہے۔

مابعد الطبیعاتی زندگی طبیعاتی زندگی کی ارتقائی صورت ہے یہ اقبال کا نظریہ حیات ہے۔ مادہ اور روح انسانی انا کی دو حالتیں ہیں۔ زندگی فرد اور فرد انا کا دوسرا نام ہے۔ ہر انا اپنی تکمیل کی کوشش کرتی ہے لیکن تکمیل ایک نا تمام آرزو چاہتی ہے اور نا تمام آرزو ایک بہت بلند معیار رکھتی ہے۔ یہ معیار فرد مطلق، انائے مطلق یا خدائے کائنات ہے۔ خودی (انفرادی انا) اسی معیار کو پیش نظر رکھنے سے مکمل ہوتی ہے۔ انا کی دو قسمیں، انائے فاعلہ تخلیقی کام انجام دیتی ہے۔ اور انائے عاقلہ چیزوں کی اصلیت سمجھنے کی سعی کرتی ہے۔ خودی انائے مطلق سے پیدا ہوئی ہے۔ انائے مطلق نے بہت سی مقید خودی اپنے ظہور کے لیے پیدا کی ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی خودی اور وہ بڑی خودی (انائے مطلق) ایک ہیں۔ چھوٹی خودی کی وہی شان ہے جو انائے مطلق کی ہے اور اس کی طرح وہ بھی آزاد، خلاق اور زمان و مکان سے بے نیاز ہے۔

دنیا میں اصلی وجود صرف ایک ہے۔ یہ وجود کائنات میں مختلف شکلوں اور رنگوں میں پایا جاتا ہے۔ وجود کا کمال یہ ہے کہ مختلف قیود سے آزاد ہو کر وجود مطلق میں فنا ہو جائے۔ یہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے اور فنا کا یہ نظریہ اقبال کو اسلامی تعلیمات کے خلاف دکھائی دیتا ہے۔ خودی فرشتوں سے ذہنی جلا اور انبیائے کرامؑ سے سوز حاصل کر کے انائے مطلق کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ یزداں گیری کا تصور یہ ہے کہ انائے مقید، انائے مطلق کے حضور رسائی حاصل کرے اور وصل و فراق کی لذت میں ہمیشہ کے لیے رہے۔ اقبال کے نزدیک بھی انائے مقید انائے مطلق سے بنی ہے اور اُسی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ فرق آغاز میں نہیں بلکہ انجام میں ہے۔ وحدت کا یہ تصور زبور عجم میں اتنا گہرا ہے کہ خالص وحدت الوجود دکھائی دیتا ہے۔ اقبال نے اکثر مقامات پر خودی کا لفظ بڑی خودی یعنی خدائے کائنات کے لیے استعمال کیا ہے اور اس تصور کی وجہ سے اکثر اشعار معلق دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے شعری استعارات و تشبیہات، فلسفے کے مصطلحات کی صورت میں استعمال کئے ہیں۔ شعریت اور فلسفیت نے اشاریت پیدا کی اور ہر لفظ نے اپنے لیے عجیب معنیٰ پایا۔ لالہ، سوزِدروں کی علامت ہے۔ شعلہ ذوق و شوق کی، چنگاری و قتی تجلی کی اور جبریل عقل کل کی نشانی ہے۔ اقبال شاعری کو فلسفے کا رنگ دینے کے لیے اردو سے فارسی زبان میں آئے۔ انھوں نے تصوف کے قدیم مصطلحات اپنائے اور ان میں بھی اضافہ کیا۔ اس طریقے سے اپنے لیلغت اور زبان ایجاد کی مگر یہ خشک فلسفے اور بے مقصد شاعری کی زبان نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ ترجمے میں زیادہ مشکلات پیدا ہوئیں۔ ترجمے میں زیادہ مشکلات مصطلحات الفاظ نے پیدا کیں۔ چونکہ علامہ اقبال نے اکثر تشبیہات واستعارات اور الفاظ کے لیے اپنے معانی مقرر کئے ہیں بایں سبب مترجم نے اس قسم کے الفاظ اپنی جگہ چھوڑ دیے ہیں۔

ترجمے کا تعارف :۔

شعر وشاعری ایک خداداملکہ ہے، جس میں وزن، بحر، ردیف اور قافیہ جیسے لوازمات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ میاں صاحب نے ترجمہ میں انہی مشکلات کے باوجود بھی وہ خوبیاں پیدا کیں جو وہ پیدا کر سکتے تھے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے کلام کی باریکیوں اور پیچیدگیوں تک رسائی حاصل کی اور منظوم ترجمہ میں اصل مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی۔ ترجمے کا مقصد بھی یہ ہونا چاہیے کہ مفہوم کو مقدم سمجھا جائے۔ پشتو زبان کے مشہور شاعر وادیب اجمل خٹک لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مفہوم کو مقدم سمجھا اگر ترجمہ معنی کے لحاظ سے اصل کے قریب ہوتا تو زبان، وزن اور شعری خوبیوں پر اثر ضرور پڑتا لیکن پھر بھی ترجمہ میں بیشتر مقامات ایسے ہیں جن پر طبع زاد اور اصل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام میں مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے صرف زبان سمجھنا کافی نہیں بلکہ حیات اور مابعد الطبیعات کے بارے میں ان کے فلسفے اور فکر ونظر سے واقفیت بھی ضروری ہے۔(۱)

پشتو زبان وادب کے معروف نقاد محمد اعظم اعظم زبور عجم کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زبور عجم علامہ اقبال کے تصور خودی کا شعری پیکر میں ایک مکمل تصویر فراہم کرتا ہے۔ لیکن فلسفیانہ فکر کے بیان کی خشک زبانی اور فلسفے کی مخصوص زبان اور مصطلحات کے استعمال کی بجائے اقبال نے تشبیہات واستعارات کا رنگین پیرایہ اپنایا ہے۔ سید صاحب نے اس کلام کو دوسری زبان (پشتو) کا جامہ پہنا کر ایک اعلیٰ اور محنت طلب کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے بڑی محنت وہنر مندی سے اس آزمائش کو قبول کیا اور اس مشکل مہم میں کامیاب ہوئے۔ سید صاحب نے اقبال کے فکر وتخیل کو صحیح صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی اور شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر ترجمہ تخلیقی اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں لفظی ترجمے کی بجائے آزاد ترجمہ بھی گیا ہے اور اصل روح بھی مجروح نہیں ہوتی (۲)

تفصیلی جائزہ :۔

زبور عجم کے ترجمے کے ایک ایک شعر کا اصل سے موازنہ اور چھان پھٹک کے نتیجے میں مندرجہ ذیل تنقیدی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

حصہ اول کی نظم نمبر ۳ کا یہ شعر :۔

غزل سرائے ونواہاے رفتہ باز آور

بایں فسردہ دلاں حرف دل نواز آور

کوئی غزل چھیڑیے اور پرانی نوا واپس لائیے! ہم افسردہ دلوں سے دلنواز باتیں کیجئے۔

---

(۱) ترجمہ زبور عجم، پیش لفظ از اجمل خٹک، ص ۱۱

(۲) محمد اعظم اعظم، پشتو میں اقبال، اول، ماہنامہ پشتو، اقبال نمبر ص ۲۵۲

یو غزل اووایه بیا ، بیا ورکے نغمے پیدا کړه

مړ ژوانده زړونو کښے څو نوے ولولے پیدا کړه(1)

مصرعے طویل ہیں جن پر نثر اور فقرات کا گمان ہوتا ہے۔ جہاں وزن بحر میں توازن نہیں وہاں مصرعے بے ہنگم ہو کر رہ جاتے ہیں۔اس لیے شعر اس طرح ہونا چاہیے۔

غزلے اووایه او تللے نغمے بیا راوله

غمزنو زړونو ته خوږے ترانے بیا راوله

ع کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا را

ترجمه :۔

حرم او دیر او کلیسا او بتکدے تشے دی

شاعر نے کنشت، کے معنی دیر کے لیے ہیں جس کے معنی یہودیوں کا معبد، آتش کدہ کے ہیں۔

غزل نمبر ۴ کے مصرعوں اور قوافی میں بھی فرق ہے جس میں تصحیح کی ضرورت ہے۔یہ مصرع ملاحظہ کریں۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ

(مغرب آپ سے ناشنا سا ہے، مشرق میں صرف آپکے قصے کہانیاں ہیں۔)

ستا نه بے خبره مغرب مشرق اوده دے

(مغرب آپ سے بے خبر اور مشرق سویا ہوا ہے) مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

ستا نه بے خبره دے مغرب ، مشرق قیصئی دی

ے بشکوہِ بے نیازی ز خدایگاں گزشتم

صفتِ مہ تمامے کہ گزشت بر ستارہ

میں جھوٹے خداؤں کے پاس سے اس بے نیازی اور باوقار انداز سے گزر گیا جیسے ماہ کامل ستاروں کے پاس سے گزر جاتا ہے۔

بے نیازه په مستئی کښے له شاهانو داسے تیر شوم

لکه سپینه سپو ږمئی تت کړی واړه ستوری په ختلو(1)

میں بادشاہوں کے پاس اس بے نیازی اور مستی سے گزر گیا جس طرح سفید چاند نکلنے سے ستاروں کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ شاعر نے الفاظ بدل کر مفہوم کو صحیح انداز مین پیش کرنیکی کوشش کی۔

نظم نمبر ۱۲ میں :۔

ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است

جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است

---

(1) ترجمہ زبور عجم، ص ۶

یہ جہاں کیا ہے ؟ فقط میرے پندار کا صنم خانہ ہے۔ اس کا جلوہ صرف میرے دید کا رہینِ منت ہے۔

خه دے دا جهان وارہ ، دیر دے دپندار زما

قید ساتی جلوے ددے دیده ئے بیدار زما(۱)

ترجمہ مشکل اور پیچیدہ ہے کیونکہ مترجم نے اصل الفاظ و قافیے استعمال کر کے اس کو بے مزہ اور پھیکا بنادیا ہے۔

فاختۂ کہن صفیر نالۂ من شنید و گفت

کس نہ سرود در چمن نغمۂ پار ایں چنیں

پرانے نغمے گانے والی ایک فاختہ نے میرا نالہ سنا، تو کہا کسی اور نے چمن میں پچھلے سال کا نغمہ اس طرح نہیں گایا

زوړ بلبل زما په نغمو مست په باغ کښې اووے

هیچا په چمن کښې کړے نه دے چغار هسے (۲)

میرے نغموں پر مست بلبل نے باغ میں کہا، کسی نے باغ میں بے سبب نہیں گایا۔ شاعر نے فاختہ کی جگہ بلبل استعمال کیا اس کے علاوہ مفہوم میں بھی فرق ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

د زړو نغمو کونترے هم زما په نغمے اووے

هیچا په چمن کښې کړے نه دے چغار داسے

نظم نمبر ۱۵ میں :۔

خیز و بخاکِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں

آیئے اور مری خاکِ تشنہ پر بادۂ حیات (عشق) چھڑکیے۔

پاسه په اوبو د ژوند تازه کړه مړ جهان (۳)

(اٹھو اور آب حیات سے مردہ جہاں میں جان ڈال) بہتر ترجمہ اس طرح ہوگا۔

پاسه ته په عشق باندِ تازه کړه مړ جهان (یا)

راشه کړه په شراب د ژوند تازه دا مړ جهان

غزل نمبر ۷ میں :۔

نظر بہ راہ نشیناں سوارہ می گزرد

مرا بگیر کہ کارم زچارہ می گزرد

میرا محبوب راستے میں بیٹھے ہوؤں پر ایک نظر ڈال کر سوار گزر جاتا ہے۔ مجھے سنبھالیے کہ اس کی ایک نظر نے میرا تو کام تمام کر دیا ہے۔

---

(۱) تقویم الحق کاکا خیل، مترجم، زبور عجم، ص ۱۰

(۲) ایضاً، ص ۱۵

(۳) ایضاً

سور پہ کبز وکبزو کتو تیریژی

لا رمہ وخت سے دنیوو تیریژی(۱)

سوار (محبوب) ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ میں چلا کیونکہ وقت گزر تا ہے۔

ترجمے کے پہلے مصرع میں راہِ نشیاں، کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دوسرا مصرع مبہم ہے اور کوئی خاطر خواہ مطلب نہیں دے رہا۔ دوسرا مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

ما سنبھال کرئ چہ د نظر غشی ئے تیریژی

یا

د نظر غشی ئے پہ ما تیریژی

مذکورہ نظم کی از سر نو ترجمے کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر مصرعے مبہم ہیں۔ نظم نمبر ۱۸ میں بھی اصل قافیے استعمال ہوئے ہیں جیسے گلگوں، افسوں، جیحوں، ہاموں (ویرانہ) الفاظ ترجمے میں مشکل ہیں۔ نظم نمبر ۲۹ میں :۔

؎ مرغ خوش لہجہ و شاہین شکاری از تست

زندگی را روش نوری وناری از تست

بلبل شیریں نوا ہو یا شاہین شکاری، یہ سب آپ ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ زندگی کا جمال ہو یا جلال، سب آپ ہی کی طرف سے ہے۔

وارہ مرغان ستادی کہ ښائستہ وی کہ ښکاری

ستا جوړ کړے ژوند دے کہ نوری دے کہ ناری

پہلے مصرع "ښائستہ "۔۔۔۔ کا مطلب خوش رنگ ہے جبکہ شاعر کا مطلب خوش الحان ہے۔ اس کے علاوہ ښکاری، (شکاری) کہہ کر کام چلایا ہے۔ اور شاہین کا ذکر نہیں۔ مذکورہ نظم میں سب گونہ عماری، ابر بہاری، تاب داری، عیاری دیاری جیسے اصل قافیے مستعمل ہیں۔ جس نے ترجمے کو بعید از فہم بنادیا ہے۔ نظم نمبر ۳۳، ۳۴ کا ترجمہ دلکش اور پُر کیف ہے۔ اسلیے کہ بحریں چست اور مختصر ہیں۔ نظم نمبر ۴۵ میں ے، پے، کے، طے اصلی قافیے استعمال ہوئے ہیں اس لیے ترجمہ شعری غنائیت سے مالا مال ہے۔

حصہ دوم نظم نمبر ۱۴ میں اصل قافیے ترجمہ میں استعمال ہوئے ہیں۔ الفاظ و قوافی اصل ہوں تو مفہوم پر قابو پایا جاسکتا ہے لیکن ترجمے کا حق ان سے ادا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اصل قوافی ترجمے میں مد نظر ہیں وہاں پشتو قارئین کے لیے سمجھنا مشکل ہوگیا ہے۔ نظم نمبر ۱۸ مثلث قسم کی نظم ہے اور ترجمے میں شاعر نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ نظم نمبر ۲۹ میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانِ کامل کی جستجو میں ہے۔ کائنات اس آرزو کی مرہونِ منت ہے۔ وہ گل و لالہ، پرند نرگس کی آنکھ وغیرہ میں جلوہ نما ہے۔ ہم میں زندگی کا موتی گم ہے۔ یہ گم شدہ موتی ہم ہیں یا وہ ؟ نظم نمبر ۳۵ میں تقصیر ہم وزیر، تکفیر، نخچیر، اکسیر اصل قافیے ترجمے میں من و عن استعمال ہوئے ہیں۔

---

(۱) ترجمہ زبور عجم، ص ۲۰

گلشنِ رازِ جدید میں سوال نمبر ۲ کے جواب میں :۔

ع چہ دریائے کہ ژرف و موج دار است

یہ دریا بہت گہرا ہے اور اس کی سطح پر کئی موجیں اٹھتی ہیں۔

مستے چپے او شنۂ موجونہ لری(۱)

(مست لہریں اور سبز موجیں رکھتی ہے۔ ترجمہ اس طرح ہوگا۔

دے ډیر ژور او مست موجونہ لری

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ، ترجمہ ہی ہوتا ہے اصل کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا لیکن شاعر اپنی ہمتِ مزاولت سے اسے اصل روپ ہی میں شعر و شاعری کی فنی نذاکتیں مد نظر رکھتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی بعض مقامات پر اقبال کے شعر و فلسفے کے امتزاج اور خیالات و افکار کے بحرِ امکان کے ناپید اکناریاں اس (مترجم) کے قدم ڈگمگا دیتے ہیں اور وہ راہِ راست سے بھٹک کر اوہام کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ بے معنی، مبہم اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ذیل میں اس قسم کی امثلہ دی جا رہی ہیں۔ جن میں ترمیم کی اشد ضرورت ہے۔

نظم نمبر ۲۹ میں :۔ ~ نقشِ پرواز توئی ما قلم افشانیم

حاضر آرائی و آئندہ نگاری از تست

ہم تو بس قلم چھڑک دیتے ہیں اس سے نقش بنانا آپ کا کام ہے۔ ہمارے حال و مستقبل کی آرائش و نگارش آپ کے ہاتھ میں ہے۔

زۀ خوتش قلم یمه ،نقشونه تول له تادی

نن دے که پرون وو تول ستا ده ګل کاری

دوسرے مصرع میں پرون کل (ماضی) کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ غلط ہے۔ مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

نن دے که صبا دے تول ستا ده ګل کاری

نظم نمبر ۴۶ میں :۔ دانی کہ نمی زیبد عمرے چو شرر ما را

(آپ جانتے ہیں کہ شرر کی طرح چند روزہ زندگی ہمارے شایانِ شاں نہیں)

د لمبے ژوند راسره نه بنائیږ ی

لمبے بمعنی شعلہ کے ہے، اس لیے اسکی جگہ "سپنړکی" چاہیے۔ (سپنړکی بمعنی شرر کے ہے)

نظم نمبر ۴۷ میں :۔ خاور کہ آسماں بہ کمندِ خیال اوست

(مشرق کہ جس کے تخیل کی کمند میں آسمان ہے)

مشرق چه آسمانونه، اولی په خپل کمندکښی

ترجمہ میں فرق ہے مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

---

(۱) ترجمہ زبورِ عجم، ص ۱۵۱

مشرق چه آسمانونه راولی په خپل کمند کښې (۱)

نظم نمبر ۴۸ میں :۔

از تو درونِ سینہ ام برقِ تجلی کہ من

بامہ مہر دادہ ام تلخئی انتظار را

آپ کی بدولت میرے سینے میں وہ برقِ تجلی موجود ہے جس کی وجہ سے مہ مہر میری آمد کے انتظار کی تلخی برداشت کر رہے ہیں۔

تاسې په سینه کښې هغه سره لمبه پیدا کړه

نمر سپوږمئی مې اوسو په ترخو د انتظار (۲)

پہلے مصرع میں سرہ لمبه (سرخ شعلہ) برقِ تجلی کا مترادف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ترجمہ اس طرح صحیح ہوگا۔

تاسې په سینه کښې آسمانی بریښنا پیدا کړه

یا

تاسې په سینه کښې د وریځ بریښنا پیدا کړه

نظم نمبر ۵۲ میں :۔

ے نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

کہاں شعر اور کہاں میں، یہ تو محض بہانہ ہے۔ میرا مقصد بھٹکے ہوئے ناقہ کو قطار میں واپس لانا ہے۔

چرته د نغمې او چرته زه تولې بانې دي

ګرځم په څه چل راتیزوم داوښو ګام (۳)

پہلے مصرع کا ترجمہ صحیح ہے۔ دوسرے مصرع (ترجمے) کا مطلب :۔ میں کسی طریقہ سے ناقہ کی رفتار تیز کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاعر نے فکرِ اقبال کو قابو کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس سے وہ مطلب ادا نہیں ہو سکتا جو اصل کا طرہ امتیاز ہے۔ مصرع اگر اس طرح ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

چرته نغمه او چرته زه دشعر ساز بانه ده

د قطار په لور راکاږمه زه اوښنه بې زمام

ع همہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

(ہے تو وہ آفتاب مگر صبح کے اثر سے خالی ہے یعنی رات کی تاریکی کو دور نہیں کر سکتا۔)

لکه د نمر وی خو پر خه د سحر نه لری (۴)

---

(۱) زبورِ عجم (پشتو)، ص ۴۹

(۲) ایضاً، ص ۵۱

(۳) ایضاً، ص ۵۵ (۴) ایضاً، ص ۵۷

(آفتاب کی طرح مگر صبح کی شبنم نہیں رکھتا)

مصرع اس طرح کا ہونا چاہیے۔

لکه د نمر وی خور رنړا د سحر نه لری

؎ ماکہ افتندہ تراز پر تومہ آمدہ ایم

کس چہ داند کہ چساں ایں ہمہ رہ آمدہ ایم

ہم جو چاندی سے زیادہ خاک افتادہ ہیں، کسی کو کیا معلوم کہ ہم نے ساری راہ کس طرح طے کی ہے۔

زه د پلوشو غوندے تار تار راغلے یم

څوک خبر دی څنګه په دے لار راغلے یم (۱)

شاعر نے "پلوشو" استعمال کیا ہے یہ سورج کی شعاعیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ترمیم کی ضرورت ہے۔ مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

سپوږمئی د پلو شو غوندے تار تار راغلے یم

ع ازدشت وجبل قافلہ ہا رختِ سفر بست

(دشت وجبل سے قافلے سفر پر چل نکلے ہیں)

قافلے پورته شوے اسونو ته ئے قیزے واچولے (۲)

ترجمے میں دشت وجبل کا ذکر مفقود ہے "گھوڑوں کو لگام دیے" اضافی ہے۔ مصرع اس طرح ہونا چاہیے

د دشتے او د غرهٔ نه ئے قافلے اولیږد ولے

نظم نمبر ۷۴ میں:۔

؎ ضربتِ روزگار اگر چہ نالہ چونے دہد ترا

بادۂ من زکف، نہ چارہ زموميا طلب

اگر تو زمانے کی مشکلات کی تاب نہ لا کر فریاد کرنے لگا۔ تو پھر میرا جام ہاتھ سے رکھ دے اور اپنے زخموں کا مرہم تلاش کر۔

کله چه د وخت ګذار غمژنے نغمے درکړے

رو زما د میئو جام کیده او مومیا غواړه (۳)

جب وقت کی ضرب نے تجھے غمگین نغمے دیے، آہستہ سے میرا جامِ شراب رکھ اور مومیا طلب کر۔ ترجمے سے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ دوسرے مصرعے میں "میئو" اور "مومیا" پشتو قارئین کے لیے مشکل ہیں۔ اس لیے شعر اس طرز پر ہونا چاہیے۔

فریاد کړے چه سختئی دزمانے زغملے نه شے

رو زما جام کیده او مرهم د زخم غواړه

(۱) زورِ عجم، (پشتو)، ص ۵۸

(۲) ایضاً، ص ۸۱

(۳) ایضاً، ص ۱۱۲

نظم نمبر ۵۰ میں :۔

ع کہ خوں کند جگرم راایازیٔ محمود

(اس بات نے میرے جگر کو خون کر دیا ہے کہ محمود نے لیاز کا شیوہ اختیار کر لیا)

چه د محمود په ایاز ئ سے له زړه وینے اوری

"اوری" قافیہ پیائی ہے جس سے شاعر مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ لفظ مطلب میں خلل انداز ہے۔ نظم نمبر ۵۱ ایسا لفظی ترجمہ ہے کہ جس سے کوئی خاطر خواہ مطلب اخذ نہیں ہوتا۔ یہ مدینہ منورہ کی تعریف وتوصیف میں ہے۔ یہاں نگاہِ ساقی کوثر شیشہ ہائے تاک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہ مقام نیاز ہے لیکن ترجمہ لفظی اس حق کو ادا نہیں کر رہااسلیے ترجمے میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

نظم نمبر ۵۳ کا یہ شعر :۔

جلوت اندو کمندے بہ مہر وماہ پیچند
خلوت اندوزمان ومکاں درآغوشند!

جب وہ جلوت میں ہوتے ہیں تو مہر وماہ پر کمند پھینکتے ہیں، اور خلوت میں ہوتے ہیں تو زمان ومکاں ان کی آغوش میں ہوتا ہے۔

ناست وی په محفل کښې مهر ومه په کمند گیر کړی
کښېنیني په خلوت کښې جها نو نه در آغوش

دوسرے مصرع میں زمان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ پہلے مصرعے میں بھی فرق ہے۔ اس لیے شعر اس طرح ہونا چاہیے۔

چه وی جلوت په نمر سپوږمئ باندے کمند اچوی
چه وی خلوت زمان کمان ئے وی پراتهٔ په آغوش

ع شکست کشتیِ ادراکِ مرشدانِ کہن

(پرانے صوفیا کے ادراک کی کشتی ٹوٹ چکی ہے)

زړے کشتئ د ادراک ماتے شولے

(پرانی کشتیاں ادراک کی ٹوٹ چکی ہیں) مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

د پخوانو پیرانو کشتئ دادراک ماته شوله

نظم نمبر ۵۵ میں :۔

سوزِنوایم نگر! ریزۂ الماس را

(میری آواز کا سوز دیکھ، میں الماس کے ٹکڑے کو)

له خپل لاسه د الماس سختے ټکړے زهٔ

(میں اپنے ہاتھ سے الماس کے سخت ٹکڑے کو) ترجمے میں فرق ہے اس لیے مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

له سوزه د آواز د الماس سختے تکړے زه

بعض مقامات پر شاعر نے مصطلحات والفاظ اور قوافی اپنی جگہ چھوڑ دیے ہیں۔ جس کی وجہ سے ترجمہ مشکل ہو کر رہ گیا ہے ذیل میں ایسے ہی اشعار کی مثالیں دی جا رہی ہیں۔ نظم نمبر ۲۲ میں :۔

ے دل گیتی! اناالمسموم، اناالمسموم فریادش

خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق ولا راق

زمانے کے دل کے اندر سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ مجھ میں زہر پھیل رہا ہے اور خرد رو رہی ہے کہ اس کے پاس اس زہر کا کوئی مداوا نہیں ۔

زړه انا المسموم انا المسموم ژاړی او عقل

وائی ما عندی بتریاقی ولا راقی(۱)

مذکورہ غزل میں شاعر نے اصل قوافی ساقی، تریاقی، اشراقی، زراقی، زرامی، براقی استعمال کیے ہیں، جن کی وجہ سے ترجمہ مشکل اور پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ نظم نمبر ۲۵ میں :۔

زہر نقشے کہ دل از دیدہ گیرد پاک می ایم

گدائے معنی پاکم تہی ادراک می ایم

میں نے اپنے آپ کو ہر اس نقش سے پاک رکھا ہے جو نگاہ کے ذریعے دل پر وارد ہو۔ چونکہ میں آپ کے حسنِ پاکیزہ کا دلدادہ ہوں اس لیے اپنا ادراک صاف رکھتا ہوں (قرآن پاک میں نگاہ نیچی رکھنے کا حکم ہے۔)

پاک زړهٔ دنظر له هره نقشه صفا راغلم

یو پاکے معنی پسے ساده معرا راغلم

میں نظر کے ہر نقش سے پاک دل لیے ہوئے آیا۔ ایک پاک معنی کے پیچھے پاک صاف اور سادہ آیا۔

اب اصل اور ترجمے کا فرق خوب واضح ہے۔ ترجمہ مختصر ہے لیکن اس اختصار نے اصل الفاظ کو نظر انداز کر کے ترجمے کو مبہم بنا دیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہو گا :

له هغه نقش چه نظر په لاره زړهٔ نیسی زهٔ پاک راغلم

زه یم گدا د پاک فطرت خالی ادراک راغلم

نظم نمبر ۱۹ میں :۔

آویزے، قیزے، یسار اور یمین جیسے اصلی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نظم نمبر ۴۱ کا یہ شعر :۔

دریں میخانہ ہر مینا زبیم محتسب لرزد

مگر یک شیشۂ عاشق کہ از وے لرزہ بر سنگ است

(۱) ترجمہ زبور عجم، ص ۲۵

اس میخانے میں ہر صراحی محتسب کے خوف سے لرزہ بر اندام ہے مگر عاشق کا پیمانہ کہ اسے دیکھ کر پتھر پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

هره شیشه ربی محتسب نه میخانه کښنیے

بے مینا د مینے که پرے کانړے ماتوے

ترجمے کا دوسرا مصرع مشکوک ہے جو مبہم ہے اس لیے ترجمہ اس طرح ہو گا۔

د محتسب له ویرے ربی میخانه کښنی شیشے

بے د عاشق د یوے شیشے چه ترے نه کانړی ربی

نظم نمبر ۷۶ میں :۔

ع مہے کز حلقۂ آفاق سازد گردِ خود ہالہ

دل وہ چاند ہے جو حلقۂ آفاق سے اپنا ہالہ بناتا ہے۔

سپوږمئی چه له آفاقو غونډ وی څان ته حاله

مترجم نے "حاله" کو ہالہ کا نعم البدل استعمال کیا ہے جو کہ مشکل ہے۔ ہالہ چاند کے گرد بخارات کے حلقے کو کہتے ہیں۔ لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود بھی شاعر کی کوشش بار آور ہیں۔ وہ خود بھی انہی مشکلات کے قائل ہیں اور بخوبی آگاہ ہیں جن کا اظہار دیباچے میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے حتی الوسع سعی کی کہ ترجمہ اقبال کے فکر و خیال پر پوری طرح حاوی ہو۔ جس کے لیے انھوں نے ترجمے کی دنیا میں ہلچل مچادی۔ ذیل میں مثالی تراجم کی امثلہ پیش کی جارہی ہیں۔

نظم نمبر ۴۱ میں :۔

مرا اے صید گیر از ترکشِ تقدیر بیروں کش

جگر دوزی چہ می آید ازاں تیرے کہ در کیش است ؟

اے میرے مالک! مجھے تقدیر کے ترکش سے باہر نکالیے۔ جو تیر ترکش کے اندر ہو وہ کیسے جا کر جگر پر لگ سکتا۔

ما ښکاری بهر کړه د تقدیر له دے ترکشه

غشے ناویشتلے کله ښخ په نښانه دے(۱)

مجھ شکاری کو تقدیر کے ترکش سے باہر نکالیے، تیر جو نہ پھینکا جائے کب نشانے پر لگ سکتا ہے۔

شاعر نے "غشے ناویشتلے" کی خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے۔ نظم نمبر ۴۲ کا ترجمہ بھی مثالی اور دلکش ہے۔

ے کفِ خاک برگ و سازم بر ہے فشانم اورا

بامید ایں کہ روزے بفلک رسانم اورا

مٹھی بھر خاک میری متاع ہے میں اسے راہ میں بکھیر رہا ہوں۔ اس امید پر کہ ایک روز اسے آسمان تک پہنچادوں گا۔

---

(۱) ترجمہ زبور عجم، ص ۴۴

خپله موتېے خاوره ستا په لار کښې دوړه ووم
دا امید لرم چه تر آسمان ئے رسوم

نظم نمبر ۴۸ میں :۔

فرصتِ کشمکش مده این دل بیقرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوے تابدار را

اس دلِ بیقرار کو تڑپنے کا موقع نہ دے۔ اس کے گرد اپنے پیچدار گیسوں کے ایک دو شکن اور بڑھا دے۔

هسے نه چه زړهٔ ہے کشمکش ته شي اوزګار
بیا دِ راخورے کړه ول ول زلفے تار په تار(۱)

ترجمہ غنائیت کی دولت سے مالامال ہے۔ آزاد ہونے کے باوجود بھی کیف و سرور اور مفہوم پر پورا اترتا ہے۔ نظم نمبر ۵۱ کا ترجمہ خوبصورت ہے۔ شاعر فکر و فن کی گرفت میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

من اے دریائے بے پایاں بہ موجِ تو در افتادم
نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

اے دریاے پایاں! میں تیری موجوں سے کشمکش کا خواہاں ہوں، نہ مجھے گوہر کی طلب ہے نہ ساحل کی۔

زه ستا بے پایا نه شنو چپو سره اخته یم
نه ہے کناره نه ہے ګوهر دزړه ارمان دے(۲)

نظم نمبر ۵۵ کا ترجمہ مثالی ہے اور ترنم و موسیقیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

بار قیباں سخن از دردِ دل ما گفتی
شرمسار از اثرِ نالہ و آہ آمدہ ایم

ہمارے رقیبوں سے آپ نے ہمارے دردِ دل کی بات کہہ دی۔ ہم اپنے آہ و نالہ کے اثر سے شرمسار ہیں۔

تا زما د زړه د غم قصے رقیب ته اوکړے
خپلو اسویلو نه شرمسار راغلے یم (۳)

حصہ دوم نظم نمبر ۷۱ کا ترجمہ غنائیت، موسیقیت اور شعریت کی دولت سے مالامال ہے۔ البتہ اصل قافیوں کا سہارا لیا گیا ہے۔

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجاست ؟
عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجاست

وہ عرب کہاں جو پھر وہی محفلِ شبانہ سجائے، کہاں ہے وہ عجم جو دریائے عشق تصوف کو از سر نو زندہ کرے

(۱) زور عجم، (پشتو)، ص ۵۱
(۲) ایضاً، ص ۵۴
(۳) ایضاً، ص ۵۸

بزیرِ خرقۂ پیراں سبوچہ ہاخالی است
فغاں کہ کس نہ شناسد مئے جوانہ کجاست

صوفیہ کے پاس خرقہ تو ہے لیکن ان کے سبو (معرفت) سے خالی ہیں۔ فریاد! کہ کوئی نہیں پہچانتا کہ وہ مئے جواں (عشق الٰہی) کہاں ہے۔

څه شولو عرب چه مجلس مست کړی شبانه
څه شوے د عجمو ترانے عاشقانه
ارتے خلقے گرځی پیران تشے شیشے خواکښی
نشته څوک چه اولتوی د که پیمانه(۱)

تواے شاہین نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
ہوائے اوبالِ تو دہد پروازِ کوتاہے!

اے شاہین! تو نے چمن میں نشیمن بنالیا ہے، مگر مجھے ڈر ہے کہ اس کی آب و ہوا تیری پرواز کو تاہ نہ کردے۔

تا خواے شاهینه جاله جوړه کړه چمن کښې
هسے نه چه پاتے شے له پورته الوتو(۲)

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند ومیگویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے!

پس زما به شعر زما لولی، دابه وائی
ملک بدل کړو یو سړی، چه ځان ئے پیژندو(۳)

میرے بعد لوگ میرے شعر پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں :۔ایک مرد خود آگاہ نے جہان کو بالکل بدل ڈالا۔

نظم نمبر ۴۰ کا ترجمہ لفظی ہونے کے باوجود بھی پر کیف و دلآویز ہے۔ اصل کے (پے درپے) کے ترجمے (په مخه) نے ترجمے کو موسیقیت و غنائیت سے دلکش بنادیا ہے۔

کشیدی بادہ ہا در صحبتِ بیگانہ پے درپے
بنورِ دیگراں افروختی پیمانہ پے درپے!
زاشکِ صبح گاہی زندگی رابرگ و سازآور
شود کشتِ تو ویراں تانہ ریزی دانہ پے درپے

تو نے غیروں کی صحبت میں پے درپے جام لنڈھائے اور اپنے پیمانہ (ادراک) کو دوسروں کی روشنی سے چمکانے کی کوشش کی۔ صبح کے آنسوؤں سے اپنی زندگی کی آبیاری کر، اگر تو اس میں پے درپے دانہ گرائے گا تو تیری کھیتی ویران ہو جائے گی۔

(۱) زبور عجم (پشتو)، ص ۹۷
(۲) ایضاً، ص ۹۹ (۳) ایضاً،

خپلو پیالو کښې دے شریک کړو بیګانه په مخه
دبل په نور دے او ځلوله پیمانه په مخه
جوړ د ژوندون سازو سامان کړه د سحر په اوښکو
پتے به شاړشی که ورنۀ راغله دانه په مخه

نظم نمبر ۴۵ میں :۔

"شو د روژے "ردیف ہے، ترجمے میں "شي یو ورځ" ردیف نے حسن وکیف کا وہ جادو جگایا ہے جو بہت کم کسی کے حصے میں آیا ہے۔ نظم نمبر ۵۲ کے ردیف "چیزے نیست" کے ترجمے "هیڅ شے نه دے" نے موسیقیت کا دلکش رنگ پیدا کیا ہے، یہ وہ رنگ ہے جس پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔

مئے دیرینہ و معشوق جواں چیزے نیست
پیش صاحب نظر اں حور و جناں چیزے نیست
ہرچہ از محکم و پائندہ شناسی، گزرد
کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست

زاړه شراب او یا پے مخے جانان هیڅ شے نه دے
سترګو لرونکو ته دا حورو جنان هیڅ شے نه دے
دا چه محکم او پاینده ښکاری د اتول به ورک شي
غر او صحرا او بحر وبر وکراں هیڅ شے نه دے(۱)

نظم نمبر ۷۳ کے ترجمے میں غلام، تمام، دوام اور مقام اصل قوافی ہیں۔ مصرعے مختصر ہیں اس لیے ترجمہ دلچسپ ہے۔
مترجم کی خواہش ہوتی ہے کہ ترجمہ اصل مفہوم پر پوری طرح حاوی ہونے کے علاوہ آزاد با محاورہ تراجم کی صف میں شامل بھی ہو۔ اس لحاظ سے سید صاحب کا ترجمہ دیکھا جاتا ہے تو اس میں یہی عکس نمایاں ہے۔ نظم نمبر ۴ آزاد ترجمہ کی بہترین مثال ہے۔ شاعر نے شعریت کا کمال دکھایا ہے۔

تو بایں گماں کہ شاید سر آستانہ دارم
بطواف خانہ کارے بخدائے خانہ دارم

آپ کو شاید خیال ہو کہ میں صرف آستانہ کی خواہش رکھتا ہوں نہیں، طواف خانہ سے میرا مقصود صاحبِ خانہ ہے۔

ته وائے جوړ خیال د آستانے لرم
کار له جوړه وونکی د خانے لرم(۲)

---

(۱) زبور عجم (پشتو)، ص ۱۱۷
(۲) ایضاً، ص ۱۹

شررِ پریدہ رنگم ، مگزر زجلوۂ من

کہ بتابِ یک دو آنے تبِ جاودانہ دارم

عقل ہم عشق است واز ذوقِ نگہ بیگانہ نیست

لیکن ایں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست

زۂ کہ سرہ شعلۂ یم کم سے مہ گنڑہ

تب د ابد تاب د زمانے لرم (۱)

عقل هم عشق دے او له ذوقه بے خبره نه دے

خو دا غریب لا په دے مینه تیر له سره نه دے (۲)

جرأتِ رندانہ کا ترجمہ "تیر له سره" کیا گیا ہے جو کہ بے حد دلکشی ہے۔ نظم نمبر ۲۳ بھی آزاد ترجمے کی بہترین مثال ہے۔

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز

دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

اوبیک دانہ گندم بزمینم انداخت

توبیک جرعۂ آب آنسوئے افلاک انداز

ساقی میرے جگر پر ایسا شعلہ ڈال جسمیں سوز کی نمی ہو۔ ایک بار پھر میری خاک میں آشوبِ قیامت برپا کردے۔۔۔اس ابلیس نے مجھے ایک دانہ گندم کھلا کر جنت سے نکلوادیا۔ آپ مجھے ایک جرعۂ عشق (گھونٹ) سے ورائے افلاک پہنچادیں۔

راکه ساقی، راکه یو شعله تیزه نماکه

بیا مے گډ په ختمه قیامتونه د دنیاکه

دۂ په یو دانه د غنم اوویشتم په زمکه

تۂ مے په یوه جرعه اوچت کړه له افلاکه (۳)

نظم نمبر ۳۹ میں :۔

سخن بے پردہ گوبابا، شداں روزِ کم آمیزی

کہ می گفتند تومارا چنیں خواہی، چناں خواہی

ہم سے سامنے آکر بات کریں، کم آمیزی کے دن بیت گئے۔ جبکہ دوسرے کہتے تھے :۔آپ ہم سے یہ چاہتے ہیں وہ چاہیے ہیں۔

خبره سپینه کړه دپټ پټونړی ورځے لاړے

دبل په خله به خبریدو چه دا او دا غواړے (۴)

---

(۱) زبور عجم (پشتو)، ص ۱۹

(۲) ایضاً، ص ۲۳

(۳) ایضاً، ص ۳۶ (۴) ایضاً، ص ۴۲

نظم نمبر ۳۶ میں :۔

انجم بگریباں ریخت ایں دیدۂ تر مارا

بیروں زسپر انداخت این ذوقِ نظر مارا

ہمارے دیدہ تر نے ہمارے گریباں پر ستارے گرائے ہیں۔ ہمارے آنسوؤں نے ہمارے اندر جو ذوقِ نظر پیدا کیا ہے وہ ہمیں آسمان سے زیادہ بلندی پر لے گیا ہے۔

ستر گے مے ستوری وروی گریوان کښې

له آسمانونو مے نظر تیر بزی(۱)

مذکورہ بالا نظم کا ترجمہ آزاد اور ایسا دلکش ہے جس پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ حصہ دوم نظم نمبر ۱۳ میں شاعر نے اصل فکر و تخیل کو صحیح صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا، جس کی وجہ سے ترجمہ تخلیقی اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو

زسلطاں کنم آرزوے نگاہے!

مسلمانم از گل نہ سازم الٰہے

بادشاہوں سے نگاہ التفات کی آرزو کروں، مسلمان مٹی کا خدا نہیں بناتا۔

دل بے نیازے کہ در سینہ دارم

گدارا دہد شیوۂ پادشاہے

میرے سینے کے اندر جو دل بے نیاز ہے، وہ گداؤں کو شاہانہ انداز عطا کرتا ہے۔

د بادشاهانو نه امید نۀ لرم

زۀ مسلمان یم بتان نۀ جوړوم

یو بے نیازه زړۀ لرم سینه کښې

چه فقیر انو ته شاهئی وربخښنم

نظم نمبر ۳۶ کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔ "تو در زیر درختاں ہچو طفلاں آشیاں بینی"

بہ پرواز آکہ صیدِ مہر و ماہے می تواں کردن

تو بچوں کی طرح درختوں کے نیچے کھڑا آشیانے کو دیکھ رہا ہے (درخت کے نیچے سے نکل) پرواز میں آکر مہر و مہ کو بھی شکار کیا جاسکتا ہے۔

تۀ د اونے په یخ سوری کښې د جالے تمنا کړے

که را والوتے ښکارونه د سپوږ مو پیدا کیدے شی(۲)

تو درخت کے ٹھنڈے سایے میں گھونسلے کا متمنی ہے۔ پرواز میں آنے سے چاند کے شکار بھی مل سکتے ہیں۔

---

(۱) زبور عجم (پشتو ترجمہ)، ص ۴۹ (۲) ایضاً، ص ۷۵

ہر تصنیف و تالیف میں دوسری فروگزاشتوں کے ساتھ کتابت کی اغلاط بھی سامنے آتی ہیں۔
ذیل میں یہی اغلاط تصحیح کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں۔

صفحہ	غلط	صحیح	صفحہ	غلط	صحیح
8	نه	نۀ	112	غواړی	غواړه
13	لاسه	لاخه	121	شوی	سوی
14	ورک کړه	ورکړه	154	کم لبشتم	كَمْ لَبِثْتُمْ
14	برف	برق	157	دا غوسته	واغوستله

ج

کتاب :۔ مثنوی مسافر پس چہ باید کرد (۱۹۳۶ء)

مترجم :۔ سیّد تقویم الحق کاکاخیل

ناشر :۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی

سنِ اشاعت :۔ جون ۱۹۶۹ء

صفحات :۔ مثنوی :۔ ۵۳ صفحات

پس چہ باید کرد :۔ ۱۷ صفحات

مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

تصنیف کا تعارف :۔

۱۹۳۳ء میں اقبال نے نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا تھا۔ واپسی پر اپنے تاثرات قلمبند کر کے "مسافر" کے نام سے شائع کئے۔ پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۳۴ء میں جداگانہ شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں اس کو "مثنوی پس چہ باید کرد" کے ساتھ شائع کیا گیا۔
امان اللہ خان کے عہد حکومت تک افغانستان میں قدیم نصاب تعلیم مروج تھا۔ جب نادر شاہ بر سر اقتدار آئے تو انھوں نے چاہا کہ ملک کے باشندے جدید علوم سے بھی شناسائی حاصل کریں اس لیے انھوں نے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی کو مدعو کیا کہ تدوین نصاب میں مشورہ دیں۔ فرض منصبی سے فارغ ہو کر علامہ نے غزنی اور قندہار کی سیاحت بھی کی۔
نادر خان، امان اللہ خان کے عہد حکومت میں سپہ سالار تھے۔ پھر وزیر جنگ ہو گئے۔ جب ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خان کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا تو اس وقت وہ فرانس میں تھے۔ ان کے جانے کے بعد ملک میں انتشار پھیل گیا۔ اس لیے ان کے جانشین عنایت اللہ خان نے بھی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس خلفشار میں ایک معمولی شخص بچہ سقہ نے کابل پر قبضہ کر لیا اور حبیب اللہ خان کا لقب اختیار کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔
جنرل نادر خان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور یورپ سے واپس آ کر کچھ فوج فراہم کی اور اکتوبر ۱۹۲۹ء میں بچہ سقہ کو شکست دی اور نادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ بہت جلد ملک میں امن و امان قائم کیا مگر نومبر ۱۹۳۳ء میں ایک افغان نوجوان نے انھیں شہید کر دیا ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا ظاہر شاہ تخت نشین ہوا(۱)

مثنوی مسافر کا خلاصہ :۔

تمہید میں اقبال نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلو اجاگر کئے۔ اپنی طلبی کا تذکرہ کیا اور اپنی روانگی کا حال لکھا۔ دوسری فصل میں اقوام سرحد سے خطاب ہے۔ دین اسلام کی حقیقت، افغانوں کو قرآن و حدیث کے مطالعہ کی دعوت جیسے اوامر بیان ہوئے ہیں۔
تیسری فصل میں نادر شاہ سے ملاقات کا حال لکھا ہے۔ چوتھی فصل میں شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پانچویں فصل میں حکیم سنائیؒ کے مزار پر حاضری کا تذکرہ۔ چھٹی فصل میں حکیم موصوف کی زبان سے فقر کا فلسفہ سپرد قلم کیا ہے۔

---

(۱) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح پس چہ باید کرد مع مسافر، عشرت پبلیشنگ ہاؤس لاہور، 1982ء، ص ۷، ۸

ساتویں فصل میں سلطان محمود غزنوی کے مزار پر حاضری کا حال لکھا ہے۔آٹھویں فصل میں "مردِ شوریدہ" کے پردے میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر ماتم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ ان کے دلوں میں پھر عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کردے تاکہ وہ دنیا میں دوبارہ سربلند ہوسکیں۔

نویں فصل میں قندہار کے سفر کی طرف اشارہ کیا ہے اور "خرقۂ مبارک" کی زیارت کا تذکرہ لکھا ہے۔دسویں فصل میں احمد شاہ ابدالی کے مزار کا حال ہے۔آخری فصل میں ظاہر شاہ سے خطاب کیا ہے اور اُسے رموزِ سلطانی سے آگہی دلائی گئی ہے۔

مثنوی پس چہ باید کرد کا خلاصہ :۔

اقبال نے اس میں عنوان کے سوال کا جواب دیا ہے۔اس میں چھ (۶) بند ہیں۔ پہلے بند میں انسان کی تمام موجودہ مشکلات اور مصائب کا منبع یورپ کو بتایا ہے۔اس نے دنیا میں رسم "لادینی" کی بنیاد رکھی۔دوسرے بند میں اسلام کا نقطہ نگاہ پیش کیا گیا ہے۔جس کی رو سے کائنات کی اصل مادہ نہیں بلکہ نورِ حق ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ مادہ پرست لادین تہذیب کا خاتمہ کردے۔

تیسرے بند میں "احوالِ حبش" سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور متنبہ کیا ہے کہ "مجلسِ اقوام" سراسر مکروفریب ہے اس لیے اس سے کسی قسم کے توقعات وابستہ مت کر، چوتھے بند میں بتایا کہ رنگ و نسل کے امتیاز کو دل سے نکال دو۔ تمام انسانوں کو عالمگیر برادری کے ارکان سمجھو۔ فرنگ سے قطع تعلق کرو۔اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سیکھو۔پانچویں بند میں بتایا کہ احساس کمتری دل سے نکالو، مشرق (ایشیا) کی عظمت کا نقش دنیا میں قائم کرو۔ مشرق، یورپ سے ہزار درجہ برتر ہے۔ساری دنیا کو مذہب اور اخلاق کا درس دیا ہے۔لیگ آف نیشنز کے مقابلے میں جمعیت خاور کی بنیاد رکھو۔چھٹے بند میں بتایا کہ بادشاہی سوداگری ہے۔ مغربی اقوام نے صنعتی ترقی کر کے ایشائی ملکوں کو اپنی مصنوعات کی بدولت معاشی غلام بنالیا ہے۔اس لیے تمھارا فرض ہے کہ ان کی تمام مصنوعات کا بائیکاٹ کر کے سودیشی اشیا استعمال کرو۔

ترجمے کا تعارف :۔

نثر کا نثر میں ترجمہ بھی ایک دشوار کام ہے اور پھر نظم کا تو نظم میں اور بھی الجھا ہوا اور پیچیدہ عمل ہے لیکن سید تقویم الحق کاکاخیل نے ان تمام مشکلات پر قابو پایا ہے اور کٹھن اور بھاری کام کو اتنا آسان بنادیا ہے کہ ترجمہ پڑھتے ہوئے قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ اصل (طبع زاد) کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔(۱)

پشتو کے مشہور شاعر، ادیب اور نقاد قلندر مومند اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس ترجمہ میں پشتو کی متبادل صنف "بدلے" کی بحر استعمال ہوئی ہے لیکن ترجمہ اور عام "بدلے" میں فرق یہ ہے کہ عام "بدلے" میں بارہ بحریں ہوتی ہیں اور ترجمہ گیارہ بحروں میں کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر بارہ بحروں کے مصرعے ہیں۔ایسے مقامات جہاں قافیے کی مشکلات ہیں وہاں گیارھویں بحر کے بعد اگر ایک حرفِ علت کا اضافہ کیا جائے تو عام "بدلے" کے وزن کے برابر ہو جائے گا۔ بعض مقامات پر ترجمہ

---

(۱) سید محمد تقویم الحق کاکاخیل، مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، جون 1949ء پیش لفظ از سید رسول رسا، ص iii

پشتو محاورے سے اس طرح منطبق ہو جاتا ہے کہ ترجمہ تخلیقی اور طبع زاد معلوم ہونے لگتا ہے۔اس کی وجہ زیادہ تر شاعر کی فنکارانہ صلاحیت اور پشتو فارسی کے زیادہ تر الفاظ و محاورت کا اشتراک ہے۔اس کے علاوہ کہ اقبال بنیادی طور سے زبان کے نہیں بلکہ خیال (فکر) کے شاعر ہیں اور ایسے شاعر کا ترجمہ مترجم کے لیے زیادہ مشکلات پیدا نہیں کرتا، سوائے اس کے کہ خیالات و تفکرات مترجم کی زبان اور عوام کے فکر و فہم سے بالاتر ہوں اور مجھے امید ہے کہ قارئین ایسے مقامات پر مترجم کی مشکلات نظر انداز نہیں کریں گے۔(۱)

---ترجمہ کا تفصیلی جائزہ (مشتبہ/غلط تراجم)---

مثنوی مسافر:۔

ے میر خیل!از مکر پنہانی بترس
از ضیاعِ روحِ افغانی بترس!

اے سالارِ لشکر! تو دشمنوں کی خفیہ سازشوں سے ہوشیار رہ اور اس بات سے ڈر کہ کہیں روحِ افغانی نہ جاتی رہے۔

دخپل مشرہ! لہ پټ مکرہ ساتہ ځان
چہ برباد نہ کړے پښتون روح د افغان(۲)

پہلے مصرع میں "خپل" کی جگہ "خیل" چاہیے۔

ے آں کہ چوں کودک لب از کوثر بشست
گفت در گہوارہ نامِ او نخست!

جس نے بچپن میں کوثر سے اپنے لب تر کیے، جس نے گہوارہ میں سب سے پہلے آپ کا نام لیا۔

ھغہ شاہ چہ بہ ماشوم پاکہ کړہ خلہ
نو اول بہ ئے نامہ دا اختسہ(۳)

شعر کا قافیہ صحیح نہیں اور دونوں مصرعے بھی ہم وزن نہیں ہیں، نہ ترجمے سے کوئی خاص مطلب اخذ ہوتا ہے۔ پہلا مصرع بھی غلط ہے۔ترجمہ اس طرح صحیح ہو گا۔

چہ ماشوم خلہ پہ کوثرئے پرانستہ
د نبیؐ نامہ ئے زانګو کښې اخستہ

ے برق سوزاں تیغِ بے زنہارِ او
دشت و در لرزندہ از یلغارِ او

(۱) تقویم الحق، مثنوی مسافر ص ج د
(۲) ایضاً، ص ۹ (۳) ایضاً ص ۲۴

اس کی شمشیر بے پناہ،برقِ سوزاں تھی،اس کی یلغار سے دشت ودر پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ صفحہ نمبر ۲۴ پر مذکورہ شعر کا ترجمہ نہیں ہے۔لہذا مندرجہ ذیل ترجمہ درج ہونا چاہیے۔

تیرۂ توره ئے بریبنیدلے پرقیدلے

دشت ودر ددهٔ له ویرے لرزیدلے

ــــ لالہ ہادر خلوتِ کہسارہا

نارہاخ بستہ اندر نا رہا

اس کے کہسار کی خلوت میں گلہائے لالہ کھلے ہوئے ہیں۔وہاں انار کے دانے ایسے سرخ ہیں گویاوہ یخ بستہ آگ ہوں

له لاله وو ډک د غرونو خلوتونه

وو اورونه په اورونو یخ دننه(۱)

پہاڑوں کی خلوتیں گل لالہ سے بھری تھیں۔آگ آگ کے اندر یخ بستہ تھی۔)اس لیے مترجم نے نارہا کی تکرار بھی آگ کے معنی میں لیا ہے۔لہذا ترجمہ غلط ہے۔ صحیح ترجمہ اس طرح ہو گا۔

دوسرا مصرع :۔

د انار دانے وے سرے هم یخ اورونه

ــــ خرقۂ آں "برزخٌ لا یبغیان" دِلی

دمیدمش در نکتۂ لی خرْقتان(ii)

نبی کریمؐ کی حدیث مبارک کہ میرے دو پیراہن ہیں ایک فقر اور دوسرا جہاد، کے نکتہ میں، میں نے آیت شریفہ "دو ملے ہوئے دریا جو الگ الگ رہتے ہیں" کی تشریح دیکھی

ما خرقه د برزخٌ لا یبغیان"

په نکته کښے ولیده د خرقتان

ترجمہ مشکل ہے۔حاشیہ میں آیت اور حدیث درج ہیں،ترجمہ نہیں۔

ــــ برخور از قراں اگر خواہی ثبات

در ضمیرش دیدام آب حیات

اگر تو ثبات چاہتا ہے تو قرآن پاک سے حاصل کر،میں نے اس کے باطن میں آبِ حیات دیکھا ہے۔

د قرآن میوه خوره غوارے که ثبات

چه ئر وینم زره کښے زهٔ آبِ حیات (۲)

---

(۱) تقویم الحق،مسافر،ص ۲۹ (۲)ایضاً ص ۴۳

(i) مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (سورۃ رحمٰن)خدانے چلائے دو دریا مل کر چلنے والے،ان دونوں میں ہے ایک پردہ تاکہ ایک دریا دوسرے پر زیادتی نہ کرے۔

(i) لي خرقتانِ الفقر والجهاد یعنی میرے لیے دو خرقے ہیں ایک فقر اور دوسرا جہاد(حدیث)

ترجمہ آزاد اور بامحاورہ ہے جو کہ مثالی ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق :۔

؎ گاہ دشت از برق و بارانش بدرد

گاہ بحر از زور طوفانش بدرد

کبھی اسی کی برق و باراں نے صحرا کو ہلا دیا اور کبھی اس کے زور طوفان نے سمندر کو جھنجوڑ دیا۔

کله غرئے له بارانه په ژړا

کله سیندئے له طوفانه په ژړا(۱)

(کبھی پہاڑ اس کی بارش سے روتا ہے کبھی دریا اس کے طوفان سے روتا ہے) ترجمہ غیر معیاری ہے کیونکہ دشت بمعنی پہاڑ لیا ہے اور بحر بمعنی دریا۔ برق کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ روزمرہ بھی ناقص ہے۔ اصل میں جو تلاطم خیز جذبات ہیں ترجمہ ان سے عاری ہے۔ ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

کله دشت تندر باران نه په ژړا

کله بحر تُند طوفان نه په ژړا

؎ کارِ خود را اُمتاں بردند پیش

تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش

قوموں نے اپنے کام کو آگے بڑھایا مگر تو اپنے صحرا کی قیمت سے بے خبر ہے۔

تولو خلقو خپل عزت کړلو سیوا

ته پوئے نه شوے د قیمت ستا دصحرا(۲)

دوسرے مصرع کا روزمرہ غلط ہے، اس لیے قباحت سے خالی نہیں۔ بنا بریں دوسرا مصرع اس طرح صحیح ہوگا۔

ته پوئے نه شوے په قیمت د خپل صحرا

یہاں تک مشتبہ/غلط تراجم کا خاکہ پیش کیا گیا۔ ذیل وہ چند اشعار جن کا ترجمہ مشکل ہے پیش خدمت ہیں۔

﴿۔۔۔ مشکل تراجم ۔۔۔﴾

ع آں دیارِ خوش سواد آں پاک بوم

یہ خوش منظر شہر یہ پاکیزہ سرزمین (اردو ترجمہ)

بنکلے ملک بنائسته وطن پاک مرز دبوم (۳)

پاک مرز دبوم پشتو قارئین کے لیے نہایت مشکل ترکیب ہے جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

---

(۱) تقویم الحق، پس چہ باید کرد، ص ۲۱ (۲) ایضاً ص ۵۳ (۳) مسافر، ص ۱۲

؎ نکتہ سنجِ خاور اں ہندی فقیر

مہمانِ خسرو کیواں سریر

یہ ہندی فقیر جو مشرق کے رموز پیش کرتا ہے۔ بلند مرتبت بادشاہ کا مہمان تھا۔

دمشرق نکته شناس هندی فقیر

او میلمه د شهنشاه کیوان سر یر(۱)

شاعر نے اصل قافیے کا پشتو لفظ تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ "کیوان سریر" پشتو ترجمہ کے دائرے سے خارج ہے۔ اس لیے اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ مثنوی پس چہ باید کرد کا شعر :۔

اے خوش آں مجذوبئی دل بردگی

آہ زیں دل گیری و افسردگی

کیا مبارک تھی تمہاری (آپ) وہ مجذوبی اور دلبری اور کتنی افسوسناک ہے تمہاری موجودہ دلگیری وافسردگی۔

واه واه هغه مجذوبی دل بردګی

آه دا فکر دلګیری افسردګی(۲)

دل بردگی ، دیگری، افسردگی پشتو الفاظ نہیں ہے۔ یہ شاعر کی ناکام کوشش ہے

شاعر مترجم نے ترجمے میں اکثر اصل الفاظ استعمال کئے جو پشتو قارئین کے لیے سمجھنا مشکل ہے۔ اس سے ترجمے کا مزہ کرکرا کر پھیکا ہو گیا ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

"آفتاب، پیچ و تاب، دیر کہن، مصور، انجمن، سنگ، ساقی، صہبا، اسرار، جوہر دار، دل ترمت، صف شکن، اقلیم، سخن، فتح و ظفر، نوا، صدا، طناب، روشن ضمیر، جذبِ درون، جنون، مہر منیر، قبا، صدف، افتادہ، جہات، ثبات، چرخ کبود، کج خرام، ایاغ، ہست و بود، فرزین (سوار)"

جن اشعار سے یہی الفاظ جوں کے توں نقل ہیں اصل اور ترجمہ کے اشعار کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ان الفاظ سے ترجمہ نہ صرف مجروح ہو گیا ہے بلکہ مشکل پیچیدہ اور بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے ترجمہ کی ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

﴿۔۔۔مثالی تراجم۔۔۔﴾

ایسا ترجمہ جو پشتو زبان و ادب کا نادر مرقع ہیں۔ جن میں نہ صرف اقبال کے فکر و فن پر مضبوط گرفت ہے بلکہ الفاظ و تراکیب، روز مرہ و محاورہ کی نشست و موزنیت، شاعر کی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیت پر دال ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی اشعار کا انتخاب اور وجہ تسمیہ درج کیا جاتا ہے۔

---

(۱) تقویم الحق، مسافر، ص ۱۸

(۲) ایضاً، ص ۵۳

مثنوی مسافر :۔

~ شکوہ کم کن از سپہر لاجورد

جز بگردِ آفتابِ خود مگرد

نیلے آسمان کی گردش کا شکوہ نہ کر۔ اپنے آفتاب کے علاوہ کسی اور کے گرد نہ گھوم

گله مه کړه له ګردشه د آسمان

ګیر چاپیر ګرځه له نمره د خپل ځان(۱)

ترجمہ سلیس، سادہ اور دلچسپ ہے۔ فکر اقبال کو دلکش الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

ہر کہ تخم آرزو در دل نہ کشت

پائمالِ دیگراں چوں سنگ و خشت!

جس نے اپنے دل کے اندر آرزو کا بیج نہ بویا وہ سنگ و خشت کی طرح دوسروں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔

د آرزو تخم چه زړه کښې نه کرې

لکه لوته ځان په پښو کښې د لوې(۲)

دوسرا مصرع پشتو محاورے سے ترجمے کے اعلیٰ معیار پر ہے۔

~ یعنی آں فقرے کہ داند راہ را

بیند از نورِ خودی اللہ را

یعنی وہ فقر جو اللہ سے باخبر ہے اور نورِ خودی سے اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔

فقیری چه واخلی لاره د مولا

د خودئ په رڼا اووینی اللہ (۳)

فقیر جب مولا(ﷺ) کا راستہ لیتی ہے تو خودی کی روشنی سے اللہ کو دیکھنے لگتی ہے۔ ترجمے میں فقر کو فقیری کے معنوں میں لیا ہے جو کہ خوش آئند ہے۔

ظاہر شاہ کے نام خطاب میں اُن کی تعریف و توصیف کے علاوہ انھیں نادر شاہ اور احمد شاہ کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ علامہ کا یہ پیغام عام ہے اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے ذوقِ حضوری نصیب فرمائیں، میں نے جو کچھ زبور عجم میں کہا ہے دوبارہ کہتا ہوں اور پھر اسی نظم کے تحت فرمایا۔

خاوراں از شعلہ من روشن است

اے خنک مردے کہ در عصر من است

(۱) تقویم الحق، مسافر، ص ۱۰

(۲) ایضاً، ص

(۳) ایضاً، ص ۲۰

مشرق میرے شعلے سے روشن ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو میرے دور میں زندہ ہے۔

از تب و تابم نصیب خود بگیر

بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر!

میرے تب و تاب سے اپنا حصہ لے لے اس کے بعد مجھ جیسا مجھ جیسا مردِ فقیر نہیں آئے گا۔

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام

شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام(i)

میں نے قرآن پاک کے سمندر سے موتی نکال کر انھیں اپنے کلام میں پرویا ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے رنگ کے راز کی شرح بیان کی ہے۔

په شعلو مے نمر خاته شولو رنړا

خوش قسمته دی په عصر کښې زما(۱)

له دے تب وتابه واخله خپل تقدير

بيا به رانهٔ شي زما غوندے فقير

ما پټيلي مر غلرے د قرآن

او د صبغة الله رازمے کړو بيان (۲)

مترجم نے سیدھے سادے الفاظ میں علامہ کے عالی نکات بیان کیے ہیں۔ ترجمہ دلفریب اور دلکش ہے۔اس نظم کے آخری اشعار میں اقبال نے اپنا پیغام دیا ہے۔ میں نے مسلمانوں کو نیا احساس دیا ہے۔ میں نے اس پرانی شاخ کو نمی دی ہے۔ میرا عشق زندگی کے معانی بیان کرتا ہے۔ میری شراب سے عقل کا جام روشن ہے۔ میں نے مسلمانوں کو شوق کی بات سکھائی اور انھیں سوز عشق سے گرمایا۔ میں نے عشق کی بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔ مجھے آہ سحر گاہی عطا ہوئی ہے۔ اس "کاہ" "کو" "کوہ" کی سطوت دی گئی میں اپنے سینے میں لاالہٰ کا نور رکھتا ہوں، میری شاعری کی شراب میں لاالہٰ کا سرور ہے۔ اسی کے فیض سے میرا فکر فلک پیما ہے۔ اس کے فیض سے میری ندی ناپید اکنار ہے۔ تو بھی میر شراب ہے۔ ایک دو جام لے لے تاکہ تیغ بے نیام کی طرح چمک اٹھے۔

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام

تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام!

له دے ميونه مے واخله څو پيالے

چه په شان د ويستے تورے پرق وهے (۳)

(i) صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ۔سورۃ البقرہ۔ اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے رنگ سے مراد توحید ہے۔

(۱) تقویم الحق، مسافر، ص ۴۳

(۲) ایضاً، ص ۴۳

(۳) ایضاً، ص ۴۴

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق :۔

؎ پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

اسلیے سب سے پہلے فکر کی تطہیر کرنی چاہیے اس کے بعد فکر کی تعمیر آسان ہو جائے گی۔

نو اول پکاره فکر کښې پاکي
بیا آسانه شي د فکر آبادي(۱)

آسان الفاظ میں خوبصورت لفظی ترجمہ ہے۔

؎ ہر کہ اندر دستِ او شمشیر لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

جس کے ہاتھ میں لا کی شمشیر ہے وہ ساری موجودات کا فرمانروا ہے۔

چه د چا په لاس کښې توره وي د لا
هغه دے په هر وجود فرمانروا(۲)

شاعر زیادہ تر لفظی ترجمے کو بروئے کار لاتا ہے۔ بحور کی چستی اور مصرعوں کے ہم وزن ہونے سے شاعر کے سخن فہم ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

؎ داستانِ او مپرس از من کہ من
چوں بگویم آنچہ نایدِ در سخن

مجھ سے اس زوال پزیر قوم کی داستان نہ پوچھو جو بات بیان میں نہیں آسکتی میں اُسے کیسے بیان کروں۔

ددے قوم افسانه مه پوښته له ما
څه به اووایم چه نه ده دوینا(۳)

؎ مردِ حُر چوں اشتراں بارے بُرد
مردِ حُر بارے برد خارے خورد

مردِ حُر اونٹ کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے اور کانٹے کھا کر گزارہ کرتا ہے۔

مردِ حُر لکه د اوښ بارونه وړي
مردِ حُر بارونه وړي او ازغي خوري(۴)

ترجمے کی بحریں چست، مصرعے مختصر اور رواں دواں ہیں۔ اس لیے ترجمے پر تخلیقی اور طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔

؎ ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود
نورِ حق از سینہ آدم ربود

---

(۱) ترجمہ پس چہ باید کرد، ص ۱۱ (۲) ایضاً، ص ۲۲ (۳) ایضاً، ص ۲۸ (۴) ایضاً، ص ۳۲

تہ و بالا نہ گردد ایں نظام

دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

یہ بینک جو یہودیوں کی عیار سوچ کا نتیجہ ہیں۔ انسان کے سینے سے اللہ تعالیٰ کا نور نکال لیتے ہیں۔ جب یہ سودی نظام تہ و بالا نہ ہو۔ دانش، تہذیب اور دین کی باتیں بے سود ہیں

دا بینکونه د یهودو چالاکی

د انسان د سینے نور د مولا وړی

چه څو دړے وړے نه شی دانظام

دتهذیب د عقل ودین فکر دے خام (۱)

خام قافیہ پیمائی کا نتیجہ اور مجبوری ہے ورنہ ترجمہ سادگی و سلاست کا نمونہ ہے۔

؎ تا خودی در سینۂ ملت بمرد

کوہ کاہی کرد و باد اورا ببرد

جب ملت کے سینے میں خودی مرگئی تو اس کے کوہ نے کاہ کا انداز اختیار کرلیا اور اُسے ہوا اُڑا لے گئی

چه خودی شی د ملت سینه کښې مړه

غر نوړی خو باد ئے وړی لکه بنړه (۲)

الفاظ و تراکیب کی سلاست اور دلکش بحر قاری کے دل کو موہ لیتا ہے۔

؎ در بدن داری اگر سوز حیات

ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت (i)

اگر تو اپنے اندر سوزِ حیات رکھتا ہے تو تو محسوس کرے گا کہ نماز میں مسلمان کی معراج ہے

که لرے د ژوندون سوز په تن اوځان

په نمانځه کښې دے معراج د مسلمان (۳)

"په تن او ځان "کی ترکیب اضافی ہے۔ مگر خوش آئند اور قابل تعریف ہے۔

؎ آں چہ از خاکِ تو رست اے مردِ حر

آں فروش و آں بپوش و آں بخور

---

(۱) تقویم الحق، پس چہ باید کرد، ص ۳۸

(۲) ایضاً، ص ۳۸

(۳) ایضاً، ص ۵۰

(i) تلمیح حدیث شریف، نماز مومن کی معراج ہے۔

اے مردِ حر! جو کچھ تیرے سرزمین سے پیدا ہوتا ہے، اُسے کھا، اُسے پہن اور اُسے فروخت کر۔

چه ستا خاورے توکولی دی ساده

هغه اغونده هغه خرخوه، خوره

شاعر نے "ساده" لفظ استعمال کر کے ترجمے کو کئی جہتوں سے دلکش بنادیا ہے۔

قالی از ابریشم تو ساختند

بازِ اورا پیشِ تو انداختند

وہ (یورپ) تیرے ریشم سے قالین بُنتا ہے اور پھر وہ تیرے ہی سامنے فروخت کے لیے پیش کرتا ہے۔

ستا ریبنم نه قالینونه جوړوی

او دتامخ ته ئے بیرته غورزوی(۲)

شاعر نے "انداختند" کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن پھر بھی مطلب پورا پورا ادا ہوتا ہے۔

مومنم، از خویشتن کافر نیم

بر فسانم زن که بد گوهر نیم

میں صاحبِ ایمان ہوں کافر نہیں ہوں، مجھے سان پر لگایئے، میں اصل فولاد کی شمشیر ہوں

زه مومن یم اوله ځانه کافر نه یم

یو خرح راکړه چه بد ذات بدګوهر نه یم(۳)

یہی خوبصورت ترجمہ شاعر کے قادر الکلام ہونے کا بین ثبوت ہے۔

بعض الفاظ شہر (بنهر) برخه (پرخه) ګوشو (کوشو) غلط درج ہیں۔

---سیّد محمد تقویم الحق کاکاخیل کے تراجم کا اجمالی جائزہ---

ضربِ کلیم :۔

سید صاحب نے علامہ اقبال کے کلام میں سے سب سے زیادہ تین حصوں کو پشتو کا منظوم جامہ پہنایا اور یہ انکی علمیت، اقبال شناسی اور شاعرانہ صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔ جہاں تک ضربِ کلیم کے ترجمے کا تعلق ہے اس میں اشعار اور مصرعے بے زون، اشعار بگڑے ہوئے، قواعد غلط، الفاظ بے ترتیب، معانی غلط اور زبان نرم اور سخت لہجے کا ایک ایسا امتزاج ہے جو سرحد میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ مترجم نے خود بھی انہی خامیوں کا اعتراف کیا ہے اور ایک تنقیدی مضمون لکھ کر اکثر اشعار کی اصلاح کر دی ہے(۴)

(۱) تقویم الحق، پس چہ باید کرد، ص ۶۲

(۲) ایضاً، ص ۶۳

(۳) ایضاً، ص ۷۰

(۴) تقویم الحق، "د ضرب کلیم پښتو ترجمه" ماہنامہ پشتو، پشتو اکیڈیمی، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۲۱

پشتو زبان وادب کے نقاد اعظم نے بھی ترجمے کی خامیوں کے ساتھ اکثر حصے کی تعریف بھی کر دی ہے۔ ترجمے کے اگرچہ بعض اشعار مثالی ہیں لیکن اصل قوافی اور اردو زبان کے مشکل الفاظ کا کثرت سے استعمال نہایت معیوب ہے۔ اس لیے اس ترجمے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ ایک مثالی ترجمہ فراہم ہو سکے۔

زبور عجم :۔

سید صاحب نے زبور عجم کے دیباچہ میں اقبال کے فلسفہ خودی، تشبیہات واستعارات اور فلسفے کی اصطلاحات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ ترجمے میں زیادہ مشکلات فلسفے کی اصطلاحات نے پیدا کیں اور چونکہ علامہ نے ہر لفظ، تشبیہ اور استعارے کے لیے اپنے معنی مقرر کیے ہیں، اس لیے انھوں نے اس قسم کے الفاظ کے پشتو مترادف کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انھوں نے مفہوم کو لفظی معانی پر ترجیح دی اگر ترجمہ معانی کے لحاظ سے اصل کے قریب ہوتا تو اور بھی بہتر ہوتا۔ پھر بھی ترجمہ بیشتر مقامات پر طبع زاد اور تخلیقی معلوم ہوتا ہے۔

اقبال نے فلسفے کی مشکل زبان کی بجائے تشبیہات واستعارت کا سہارا لیا ہے۔ جن کا ترجمہ ایک اعلیٰ اور محنت طلب کام ضرور ہے اقبال کے فکرو تخیل کو صحیح صورت میں پیش کرنا اور شعریت کا دامن بھی ہاتھ میں تھامے رکھنا اُن کے ایک فاضل شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔

بعض مقامات پر مصرعے غیر متوازن اور طویل ہیں، وزن بحر میں کوئی ربط نہیں اور مصرعے بے ہنگم ہو کر رہ گئے ہیں۔ بعض الفاظ کے معنی غلط لیے، اکثر مقامات پر اصل قوافی اور الفاظ استعمال کیے جس کی وجہ سے ترجمہ مشکل، پیچیدہ اور بد مزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ بعض الفاظ (اصل) نظر انداز کر دیے گئے ہیں، بعض مصرعے مبہم ہیں اور ان سے کوئی خاطر خواہ مطلب اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ بعض الفاظ قافیہ پیمائی کی مجبوری میں مجبوراً استعمال کیے گئے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ایسے الفاظ مطلب میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں۔

بعض مقامات پر پشتو کی خوبصورت اصطلاحات، چست بحریں، مختصر مصرعے استعمال میں لائے گئے ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ آزاد ہونے کے باوجود بھی کیف وسرور اور غنائیت کی دولت سے مالا مال ہے اور شاعر اقبال کا فکر وفن قابو کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اس لیے ایسے تراجم شعریت کا بہترین مثال ہیں۔ بعض مقامات پر آزاد ترجمہ شاعر کی فنکارانہ صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔ لفظی ترجمے کی بجائے آزاد ترجمہ ایسی ہنر مندی سے کیا گیا ہے۔ کہ اصلی روح بھی زخمی نہیں ہوتی۔ یہ ترجمہ ضرب کلیم کے ترجمے کی نسبت خوبصورت، معیاری اور دلکش ہے۔

مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد :۔

بعض مقامات پر ترجمہ مشتبہ ہے اور فکر اقبال کے مفہوم کو مبہم الفاظ یا مبہم مصرعوں سے غلط کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک آدھ شعر کا ترجمہ بھی نہیں کیا گیا۔

بعض الفاظ کے معانی بدل دیے ہیں جیسے دشت بمعنی پہاڑ۔ بعض الفاظ کے پشتو الفاظ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بعض قوافی اور مشکل الفاظ اپنی اصلی صورت میں جوں کے توں موجود ہیں جن سے ترجمہ کی ساکھ کو نہ صرف ٹھیس پہنچی بلکہ ترجمہ مشکل، پیچیدہ اور بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ سید صاحب کے ترجمے کو زیادہ نقصان کلام اقبال کے الفاظ نے پہنچایا ہے جو ترجمے میں کثرت سے موجود ہیں۔

مندرجہ بالا خامیاں ترجمے کی خوبیوں کے مقابلے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ اکثر مقامات پر ترجمہ سلیس، سادہ اور دلچسپ ہے اور اقبال کے فکر و تخیل کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ الفاظ و محاورات کی ترتیب درست ہے، بحریں چست اور مصرعے مختصر ہیں۔ جب شاعر کے خیالات کو دوسری زبان کے رواں دواں اور موجزن بحور میں پیش کیا جائے۔ خواہ ترجمہ لفظی ہو یا آزاد تو مترجم شاعر کی شاعرانہ خوبیاں اجاگر ہو جاتی ہیں، بس یہی حال سید صاحب کا ہے جو فارسی زبان پر قدرت حاصل ہونے سے ظاہر ہے۔ وہ علامہ کے فکر و فلسفہ اور فارسی اصطلاحات پر حاوی نظر آتے ہیں اور انھیں پشتو کا موزوں جامہ پہنانے پر عبور رکھتے ہیں۔

علامہ اقبال نے خلوت میں زبور عجم پڑھنے کا جو مشورہ دیا ہے وہ بے جا نہیں۔ یہ علامہ کی زندگی اور پیغام کا ماحصل ہے، جسے وہ زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ علامہ کی اس پسندیدہ تصنیف کا ترجمہ کرنے کا سہرا سید صاحب ہی کے سر ہے۔ اس لحاظ سے وہ علامہ کی حیات، اس کا فلسفہ اور پیغام کے زیادہ قریب ہیں۔ کلام کسی بھی بندہ بشر کا عیب سے مبرا ہونا بعید از قیاس ہے لیکن دوسرے مترجمین اقبال سے جب ان کا موازنہ کیا جاتا ہے تو ان کے تراجم کا معیار کئی پہلوؤں سے بلند پایہ نظر آتا ہے۔

باب ہفتم

حاصلِ تحقیق

١) ترجمے کا فن اور کلامِ اقبال کے تراجم کی خصوصیات

٢) مترجم کی مشکلات

٣) پشتو زبان اور اقبال

٤) کلامِ اقبال کے تراجم میں پشتو زبان کی سبقت

٥) سمندر، اسیرؔ، اثرؔ، راحتؔ، مینوشؔ، حمزہؔ، تقویم الحق، عبد المنان اور مولوی صاحب گل کے تراجم اور ان کا معیار

٦) تراجم کی تصحیح اور از سر نو شائع کرانے کی ضرورت و اہمیت

ساتواں باب

حاصل تحقیق

ایک زبان کے مطالب، مفہوم اور مقصد کو دوسری زبان کے سانچے میں ڈھالنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ علم السنہ سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ ہر زبان اپنے اپنے ماحول، آب وہوا، بود وباش،، جغرافیائی حدود اور سماجی تقاضوں میں پروان چڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔ جب دوسری زبان سے اس کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے تو تغیراتِ فطری کے نتیجے میں تہذیب وثقافت کی بے شمار اصطلاحات سامنے آتی ہیں۔ روزمرہ اور محاورہ، ضرب الامثال، تشبیہات واستعارات، کنایہ اور مجاز مرسل کے علاوہ صنائع وبدائع جیسے دقیق مراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ الفاظ ومفاہیم کا الجھاؤ پیچاؤ اور خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ایک زبان کو دوسری زبان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مترجم فطری مجبوریوں کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم زبان کو طبیعاتی خصوصیات رکھنے والے کسی مادہ سے تعبیر نہیں کرسکتے وہ تو کئی صدیوں پر محیط ایک نسل انسان کی بے پناہ آرزووں کی آماجگاہ اور تہذیبوں کا گہوارہ ہوتی ہے۔ اسے دوسری زبان کے جامے میں پیش کرنا گلدار چادر کے دوسرے رخ کی مصداق ہے جس سے صرف نقش کا اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے لیکن رنگ وبو اور آرائش وزیبائش کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ اقبال کی شاعری تغزل وترنم اور شوکت الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جس میں بندش کی چستی، خیالات کی بلندی اور گہرائی داغ کی "زبان" غالب کا فلسفہ اور شبلی وحالی کی قومیات سبھی کچھ شامل ہیں۔ آپ کے سینے میں ایک شاعر کا حسن پرست اور عشق پرور دل اور ایک مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح کارفرما تھی۔ آپ کی شاعری نے زبان اور طرز ادا کے امتیازات سے بالاتر ہوکر اردو فارسی کے امتیاز کو ایک قصۂ پارینہ بنادیا۔ زلف ورخ کے استعارات سے بے نیاز شاعری شاعر کے پیغام کی قبولیت، ایمان کی استواری اور تخیل کے راستے کی صحت پر شاعر کے ایمانِ کامل کا پتہ دیتی ہے۔

اقبال جس جرأتِ رندانہ کے ساتھ مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتا ہے ادنیٰ سیاسیات کی اصطلاحوں سے آلودہ کرنا شرکِ جلی کے مترادف ہے۔ صہبا، خم خانۂ قدیم سے ہے، عرب کی کھجور کا افشردہ، داغ وحالی وشبلی سے الگ دنیا، اقبال جائے خود اقبال ہے۔

امیدواری، مستحکم ایمان اور غیر متزلزل پیام کا مظہر شاعر۔ خودی وخودداری کا سراپادرس اور مبلغ دین مبین۔ دین وسیاست کے تجربات اور انسانیت کی حیات افروز پیام سے مملو شاعری جو شاعر کے کمالات کا مرقع ہے، اس قسم کی شاعری کو دوسری زبان پشتو میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کو مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔

۱۔ ترجمہ ایک دقیق اور باریک بینی کا کام ہے لیکن منظوم ترجمہ اور بھی کٹھن اور مشکل ہے اس لیے مترجم کی شاعری میں فطری شاعرانہ صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ شاعر ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ اردو، فارسی ادبیات کا عمیق مطالعہ رکھتا ہو۔

۳۔ پشتو، فارسی اور اردو زبان پر عبور رکھنے کے علاوہ شاعر کے لیے فکر وفن اور اصطلاحات پر حاوی ہونا ضروری ہے۔

۴۔ تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ رکھنے کے ساتھ ساتھ فلاسفۂ اسلام اور فلاسفۂ مغرب کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہو۔

۵۔ مترجم مشرق ومغربی تہذیبوں سے واقف ہو اور ان کا آپس میں موازنہ بھی کیا ہو۔

۶۔ مترجم شاعرانہ بصیرت رکھتے ہوئے ناقدانہ نظر اور فلسفیانہ فکر، جیسے اوصاف سے متصف ہو۔

۷۔ علامہ اقبال کے فکر وفن کی نزاکتوں سے واقفیت رکھتے ہوئے شاعر اُن کے پیغام اور خیالات پر کھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

کتابوں کے ترجمے ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس اہم کام کو کسی سوچی سمجھی مقصدی کوشش کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مترجم کس زاویے سے کسی کتاب کے نفس مضمون، معنی اور موڈ کا نتیجہ اخذ کر رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مترجم ترجمہ علم کی ترویج، اشاعت کا فریضہ سمجھنے کی بجائے اپنی خالی جیبوں کو بھرنے کے لیے کرتے ہیں اور اسے ایک ادبی خدمت کے برعکس ایک کاروبار اور مالی منفعت کے پست درجے پر لے آتے ہیں میری دانست میں مترجم کا کردار اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اگر مترجم دونوں زبانوں پر قادر ہو۔ ایک وہ جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے اور دوسری وہ زبان جس میں اس کتاب کے معنی مقصدیت اور معنوی وسعتوں کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت، تو یوں مترجم دو مختلف ثقافتوں کے باہمی عمل اور اس کے مظاہر کو قارئین تک پہنچانے اور اسکے آفاقی ذہن کو مالامال کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مترجم دراصل زندگی کی خدمت کرتا ہے اور انسانیت کے مفاد کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ عالم بشریت سے ہماری ہمدردی کو فروغ دیتا ہے اور ہمیں اس لائق بناتا ہے کہ ہم انسان کے آفاقی شعور سے مکمل ہم آہنگی محسوس کر سکیں۔

ترجمہ میں صرف دو زبانیں جاننا کافی نہیں۔ مضمون یا کتاب کے موضوع پر قدرت رکھنا بھی لازی ہے۔ فلسفیانہ ذہن کے ساتھ موضوع سے مترجم کی ہمدردی ضروری ہے۔ متعلقہ زبانوں کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع سے دلچسپی اور ذاتی ہمدردی کے بغیر معیاری ترجمہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمے میں دشواری یہ ہے کہ ہر زبان کا اپنا لب ولہجہ، اپنے الفاظ وامثال اور اپنے استعارات ہوتے ہیں جو اسکی اپنی روایات اور اپنے مزاج میں ڈھلے ہوتے ہیں پھر یہ سب مقامی رنگ وآہنگ میں ایسے رچے بسے ہوتے ہیں کہ انکے پیکر کا رنگ کھرچ کر دوسرا رنگ چڑھانا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

تراجم کے ذریعے زبانیں کئی طرح سے پھلتی پھولتی ہیں اور اپنے میں ہیئت اور مواد کی خوبیاں پیدا کر لیتی ہیں۔ قوموں کی مذہبی، سماجی، تہذیبی اور ثقافی سرگرمیوں کی مانند ترجمے کا عمل انسان کو انسان کے قریب تر لاتا ہے اور ان کے سوچ بچار کی سرحدوں کو پھیلاتا اور وسیع تر کرتا ہے۔ ترجمہ کشتِ ادب میں کھاد کا کام دیتا ہے اور علمی وادبی نشوونما کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ہمیں تخلیقی صلاحیتوں کی نئی راہیں اور نئے اسلوب دکھاتا ہے اور قافلۂ ادب کے لیے نئی جہتیں سمجھاتا ہے۔ علامہ اقبال کی آرزو تھی کہ ان کی آواز دنیا کے بیشتر مسلمانوں تک پہنچ سکے چنانچہ یہی تراجم اسی خواہش کی ایک کڑی ہے۔

۔۔۔مترجم کی مشکلات۔۔۔

۱۔ ترجمہ بامحاورہ ہونا چاہیے لیکن اگر بعض مقامات پر ترجمہ لفظی بھی ہو جائے تو غنیمت ہے کیونکہ وزن، بحر، قافیہ جو شعر کے لوازمات میں سے ہیں، ان سے لاپروائی نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ ہر زبان ایک بحرِ زخار ہے، جس میں تشبیہات واستعارات کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ جب یہ موتی دوسری زبان کا روپ دھار لیتے ہیں تو پاش پاش ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دمک باقی نہیں رہتی جو اصل کا حصہ ہے۔

۳۔ ایک صاحب طرز شاعر اپنے خیالات وافکار کو منظوم صورت میں پیش کرنے کی جسارت تو کرتا ہے لیکن اس ترکیب وترتیب کو قائم نہیں رکھ سکتا جو اصل کا ورثہ ہے۔

۴۔ جب مترجم شاعر بحر دوں کو چست اور شگفتہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اختصار کی دھن میں بعض الفاظ وتراکیب کو سرے سے نظر انداز کر دیتا ہے جس سے اصل کی روح مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔

۵۔ شاعر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن لے آئے لیکن تخیل پر گرفت حاصل کرنے میں وزن میں فرق آ جاتا ہے جسے درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۶۔ کبھی شاعر مترادف کی تلاش میں کھو کر رہ جاتا ہے جہاں غیر مانوس الفاظ سے ترجمے کا مقصد ضائع ہو جاتا ہے اور ترجمہ خانہ پری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

۷۔ شاعر آزاد ترجمہ کے خیال سے اپنے خیالات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

۸۔ شاعر بعض الفاظ کا مفہوم غلط لیتا ہے جس سے ترجمے کا حق ادا نہیں ہو تا بلکہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

۹۔ بعض الفاظ کے مترادف تلاش کرنے میں شاعر الجھ جاتا ہے یا ان کو چھوڑ دیتا ہے یا اصل قوافی کا سہارا لیتا ہے۔

۱۰۔ اصلی قوافی پر مبنی ترجمہ میں اگرچہ فنی خوبیاں بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں لیکن حقِ ترجمہ کما حقہ ادا نہیں ہو پاتا اور غیر زبان کے الفاظ قاری کے لیے مشکلات اور بیزاری کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ شاعر کے لیے بڑا مسئلہ قافیہ پیائی کا ہے جس کی وجہ سے مترجم اصل قوافی کے استعمال سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ لیکن یہ قباحت اس کی کامیابی کا سبب بھی بنتی ہے اور ترجمہ طبع زاد کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

۱۱۔ بعض اوقات لفظی ترجمہ سے اصل کا مشکوک رنگ نظر آتا ہے۔

۱۲۔ بعض مقامات پر اضافی الفاظ وتراکیب کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

۱۳۔ بعض اوقات الفاظ کے مترادف تلاش کرنے میں بحریں طویل ہو جاتی ہیں۔

۱۴۔ بسا اوقات الفاظ کے ہیر پھیر سے مطلب الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ ترجمے کو آزاد اور دلکش بنانے میں بعض الفاظ نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور بعض الفاظ زائد استعمال ہو جاتے ہیں۔

۱۶۔ جو تراجم ذاتی شوق سے کیے گئے ہیں وہ عمدہ ہیں جہاں کوئی مالی منفعت پیش نظر رہی ہے اور فرمائشی قسم کا کام ہے وہاں علمی معیار برقرار نہیں رہ سکا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ سے گہری عقیدت کا حق ادا کرنے میں سمندرؔ، راحتؔ اور اسیرؔ پیش پیش ہیں کیونکہ وہ ذاتی شوق اور لگن سے سرشار ہو کر کلام اقبال کو منظوم پشتو سے مزین کرنے لگے۔

علامہ اقبال محض ایک شاعر اور فلسفی نہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک ایسے قومی و ملی شاعر کی ہے جنھوں نے ملی تشخص اجاگر کر کے تصور پاکستان بھی پیش کیا۔ علامہ کے سیاسی افکار، فلسفہ، فکر وفن اور نجی زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان کی عمر بھر کی تخلیقی کاوشوں کا غالب حصہ منظوم کلام ہے۔ بعض نثر کی تحریریں بھی ان کی یادگار ہیں۔ مگر ان کی شہرت وعظمت کا باعث ان کی شاعری ہے۔ قدر و منزلت اور اہمیت کے اعتبار سے ان کی شاعری ان کی نثر پر فوقیت رکھتی ہے۔ اسی شاعری پر اقبالیاتی ادب کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت میں برصغیر کی مختلف مقامی زبانوں کا بڑا حصہ ہے۔

جہاں تک پشتو زبان وادب کا تعلق ہے، اقبالیات میں اس کی ابتدا ہی سے روز افزوں کوششیں جاری رہیں۔ جب اقبال کے بلند پایہ فکر سے مملو اشعار کی دلآویزی اور دلکشی نے برصغیر کے اندر اور باہر، ہر سو خاص وعام کو اپنی جانب متوجہ کیا تو متعدد پشتون شعرا، دنیائے شاعری کی اس نئی اور روح پرور آواز پر سب سے پہلے متوجہ ہوئے کیونکہ یہ آواز ان کے دل کی آواز اور یہ پیغام ان کے اسلام کا پیغام تھا۔ علامہ نے پشتونوں اور پشتو زبان سے عقیدت کا جو اظہار کیا تھا تو وہ الجزاءُ الاحسان الا الاحسان کے مصداق اس کا صلہ دینا چاہتے تھے۔ جس میں اقبال اکیڈمی اور پشتو اکیڈمی پشاور نے اہم کردار ادا کیا۔

پشتو وہ واحد زبان ہے جس میں کلام اقبال کا تمام سرمایہ منظوم صورت میں موجود ہے۔ اگرچہ علامہ کی شعر وشاعری اور فکر وفلسفہ کی مسافت بہت طویل اور دشوار گزار ہے لیکن پشتون اہل قلم کے لیے، ان کے عزم وہمت اور جہد پیہم کے سامنے، یہی پُرخار راہیں حائل نہ ہو سکیں۔ انھوں نے علامہ کی آواز پر لبیک کہا اور ان کے پیغام کو اپنی عملی زندگی کا جزو لاینفک بنانے کے لیے کمربستہ ہوئے۔

علامہ اقبال کی شاعری قرآن اور آپ شاعروں کا قرآن ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، عظیم مفکر اور شارح اسلام ہونے کے علاوہ ایک زبردست مردم شناس بھی تھے۔ اُن کی نگاہیں شاہ ولی اللہ کی طرح ملت کے اس عظیم فرزند یعنی پشتون پر لگی ہوئی تھیں۔

پښتون (پشتون) کالفظ پت، ښېګړه، توره، وفا اور ننگ سے عبارت ہے۔ یہ ایسی صفات ہیں جو اسلام ایک مردِ مومن کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ علامہ پشتونوں میں اسلامی رواداری، جذبۂ آزادی، خودی اور جانثاری کے عزائم دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ اپنے کلام میں افغانی ملت کو بڑے خلوص سے خراج تحسین پیش کیا اور انھیں مقاصدِ فطرت کا نگہبان ٹھہرایا:۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ کہستانی(۱)

میجر راورٹی نے خوشحال خان خٹک کی تقریباً اٹھانوے منظومات کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ جسے پڑھ کر علامہ پشتون عظیم شاعر سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے تاثرات ۱۹۲۸ء میں ایک انگریزی مضمون (۲)، حیدرآباد، دکن کے مشہور انگیریزی سہ ماہی رسالہ "اسلامک کلچر" کے شمارۂ اکتوبر میں شائع کئے۔ انھوں نے اس مضمون میں اس افغان مجاہد شاعر کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس کے علاوہ "خوشحال خان کی وصیت" (۳)، لکھ کر پشتونوں کو ان کے اپنے شاعر کی زبان میں اسرار و رموز ملی کا درس بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر خدیجہ بیگم فیروزالدین کو بھی علامہ صاحب نے خوشحال پر ڈی۔ لٹ معیار کا مقالہ لکھنے پر آمادہ کیا تھا اور اُسے خصوصی طور پر یہ فرمائش کی تھی کہ مقالے میں ایک باب خوشحال کی سیاسی سرگرمیاں بھی ہونا چاہئے اور یہ باب اُس مقالے میں موجود ہے۔ اس بات کا ذکر محترمہ نے اپنے مقالے کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ کلام اقبال میں پشتون مشاہیر کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اور ان مشاہیر کے توسط سے افغان ملت کو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ علامہ کو پشتو شاعری سے گہرا لگاؤ تھا اور پشتو نہ جاننے کا افسوس۔ اپنے ایک خط محررہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۹ء میں فرمایا، "(۴)

"افسوس ہے کہ مجھے پشتو نہیں آتی ورنہ میں سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہناتا"

علامہ اقبال کی آرزو اگرچہ پوری نہیں ہوئی اور انھوں نے پشتو شاعری کو اردو کے سانچے میں نہیں ڈھالا۔ تاہم پشتونوں نے علامہ کے خلوص محبت کا حق ادا کرنے کے لیے ان کے کلام کو سب سے پہلے پشتو کا منظوم جامہ پہنایا۔ سید راحت اللہ زاخیلی شیر محمد مینوش اور سمندر خان ایسے اقبال شناس پشتون شعرا تھے جنھوں نے علامہ کی زندگی ہی میں ان کے کلام کے تراجم شروع کئے تھے۔ جب شاعر مشرق کی کوئی نظم شائع ہوتی، وہ اسے پشتو شاعری میں ڈھال دیتے راحت نے شکوہ و جواب شکوہ کے شائع ہونے پر منظوم ترجمہ کیا اور علیٰ ھذٰ القیاس دوسری نظموں کا۔ اگرچہ ان کی کتابیں بعد میں شائع ہوئیں۔

مولانا عبدالقادر یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ۱۳ اگست ۱۹۶۸ء تک پشتو اکیڈمی پشاور کے ڈائریکٹر رہے۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں زبور عجم، ارمغانِ حجاز، پیام مشرق، ضرب کلیم، بانگِ درا اور بال جبریل کے تراجم ان کے دور میں شائع ہوئے جبکہ اسرار خودی اور رموزِ بے خودی پہلے اور مثنوی پس چہ باید کرد اور مسافر کے ترجمے بعد میں شائع ہوئے۔ مترجمین ایسے شعراء و ادباء تھے جو اصناف سخن کے علاوہ حیات انسانی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے اور مشرق و مغرب کے تمام نظریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس لیے اقبال کی طرح ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔

---

(۱) کلیات اقبال، اردو، ص ۶۴۰ (۲) مضمون بعنوان "Khushal Khan Khattak the Afghan warrier poet"

(۳) بال جبریل (۴) پروفیسر محمد منور، مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خان، اقبال اکادمی پاکستان، 1986ء، ص ۳۸

ماہرین لسانیات جانتے ہیں کہ روز مرہ بول چال کی خالص زبان اور تحریری زبان میں کیا فرق ہے ؟ وہ احوال و مقامات جس میں کسی زبان نے پرورش پائی اور پروان چڑھی، کے مدارج کیا ہیں ؟ کلامِ اقبال کا جہاں تک تعلق ہے، زبان و بیان، اصطلاحات، تشبیہات واستعارات ،روز مرہ اور محاورہ کی حقیقت کیا ہے۔ علامہ نے بعض اصطلاحات خود وضع کیں اور ان کے لیے معانی مقرر کیے جیسے گلِ لالہ، سوزِ جگر کی علامت ہے، جبریل، عقلِ کل کی نشانی ہے۔ شعلہ، ذوق و شوق کی اور چنگاری، وقتی تجلی کی۔ ایسے ہی الفاظ کو پشتو کا جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ان الفاظ کو جوں کے توں ترجمے میں استعمال کیا جاتا تو ترجمہ معیار سے گرا ہوا دکھائی دیتا اور اگر ان کے مترادف تلاش کیے جائیں تو علامہ کا تخیل اپنی اصلی صورت میں قائم نہیں رہ سکتا۔ بس یہ مشکلات ترجمے میں بہر کیف موجود ہیں جن سے مترجمین بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔

علامہ اقبال کے تمام نظریات خودی کی تفسیر و تشریح کے لیے وقف ہیں۔ خودی سے ان کی مراد زندگی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں جاری و ساری ہے اور انسان کے کل احوال و مقامات بھی اسی کے ظہور میں ہیں۔

فرد و ملت کا وجود خودی پر قائم ہے اور عشق سے تقویت پاتا ہے۔ دین اسلام ہر شے پر مقدم ہے جو نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو استحکام عطا کرتا ہے اور یہی اسرار و رموز کا بنیادی مقصد ہے۔

مولانا عبدالقادر نے اقبال اکیڈیمی کے تعاون سے کلام اقبال کے پشتو تراجم کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کا نتیجہ زبورِ عجم کے ترجمے ۱۹۶۱ء کی کامیاب کوشش میں نظر آیا۔ ظاہر ہے کہ ڈائریکٹر و مترجم دونوں کی نظر سے سمندر کے تراجم پوشیدہ نہیں ہوں گے اور انھوں نے ان پر اطمینان کا اظہار بھی کیا ہوگا۔ کیونکہ مولانا صاحب نے اسرار و رموز کے تراجم کی دوبارہ ضرورت محسوس نہیں کی جس طرح بالِ جبریل (پلوشے) کے ترجمے میں نظر آتا ہے۔

سمندر نے علامہ کے پیچیدہ افکار اور ان کے بنیادی نظریہ فرد و ملت کو منظوم صورت میں پیش کرنے کی تسلی بخش کوشش کی ہے۔ ترجمہ زیادہ تر لفظی ہے۔ گاہے گاہے اضافی کلمات کا استعمال مستحسن اقدام ہے۔ کچھ اشعار کے دہرے (i) تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کس قدر خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ روز مرہ اور محاورہ کی چاشنی کے علاوہ تشبیہات واستعارات کا استعمال بھی موزوں اور برمحل کیا گیا ہے۔ ہر لفظ کی ترکیب اور ترتیب اپنی جگہ درست اور صحیح ہے۔ شاعر علامہ کے فکر و فن اور انداز بیان پر حاوی نظر آتے ہیں۔ بحور چست اور مصرعے مختصر اور موزوں ہونے کی وجہ سے کلام طبع زاد اور تخلیقی سا معلوم ہوتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے سمندر سب سے پہلے اقبال شناس پشتون شاعر تھے جنہوں نے علامہ کی ابتدائی دو اہم تصانیف کا ترجمہ کر کے پہلی فرصت میں پشتونوں کو شاعر مشرق کی اسلامی تعلیمات سے واقف کرایا۔ خیر القرونی قرنی کے مصداق وہ زیادہ حق شناس و حق پرست ہونے کا درجہ رکھتے ہیں۔ حکیم الامت سے عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کی وفات پر اپنے شعر و سخن کو بروئے کار لاتے ہوئے، سب سے پہلے افغانی ملت میں مرثیے کی صورت میں خون کے آنسو روئے (۱) ترجمے کے دیباچہ سے بھی آپ کی اقبال شناسی عیاں ہے۔ خودی اقبال کے کلام و پیغام کا خلاصہ اور مرکز و منبع ہے۔ جس کی وہ تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔

(i) جو ترجمہ پسند نہیں آیا۔ شعر کا دوسرا ترجمہ حاشیہ میں دیا گیا۔

(۱) "احسان" لاہور، ۲۷ جون ۱۹۳۸ء

سمندر کی اقبال کی خودی سے شناسائی ان کے دیباچے اور ترجمے سے بخوبی ظاہر ہے، جب ان کے ترجمے کو ایک حق شناس کی نظر سے دیکھا جائے تو مترجمین اقبال میں اُن کا مقام متعین ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کا مقام مترجمین اقبال میں سر فہرست نظر آتا ہے۔ تاریخی، ادبی، مذہبی اور معیاری تراجم کے لحاظ سے آپ کا درجہ اول ہے۔ ایسا دلکش ترجمہ کسی اور شاعر کے نصیب میں نہیں آیا اور اس جیسا اقبال شناس شاعر کا ملنا محال ہے۔

عبداللہ جان اسیر نے لفظی ترجمے کے ساتھ ساتھ آزاد ترجمہ بھی کثرت سے کیا ہے۔ انھوں نے بحروں کو چست اور مصرعوں کو حد سے زیادہ مختصر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اختصار کی اس فکر میں اکثر الفاظ و تراکیب اور مصرعوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اصلی مفہوم زائل ہو کر رہ گیا ہے۔ اصلی الفاظ اور اصل قوافی کا استعمال کم کیا گیا ہے۔ ترجمے پر ذاتی رنگ اور خیال غالب ہے۔

اسیر کی شاعری میں شک نہیں، وہ شعری نزاکتوں سے واقف ہیں۔ زبان وبیان اور اصناف سخن پر عبور اور تجربہ رکھتے ہیں۔ لیکن ترجمے کے فن کا بالعموم اور منظوم ترجمے کا تجربہ بالخصوص خام ہے۔ علامہ کے اندازبیان کی گرفت کے تصور میں ان کے تخیل کو قربان کر دیتے ہیں۔ شاعر نے فارسی اشعار کا ترجمہ کرنے سے بھی گریز کیا ہے جس سے ان کے فارسی زبان وادب سے ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مترجم کے لیے لسانیات کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ کلام اقبال کے زمرے میں خاص طور پر اردو فارسی زبان وادب پر قدرت حاصل ہو۔ کیونکہ علامہ کا اردو کلام بھی فارسی الفاظ و کلمات سے نہ صرف مملو ہے بلکہ گاہے گاہے فارسی اشعار سے بھی مزین ہے۔ فارسی اشعار کے ترجمے کو درخور اعتنا خیال نہ کرنے پر اس کا یہ عیب سامنے آتا ہے۔

بعض مقامات پر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہوتے، اور بحریں ڈانواں ڈول ہوتی ہیں۔ ایسے ہی مقام پر ترجمہ جان چھڑانے کی ناکام کوشش ہے، مشکوک، غلط، اور مبہم ترجمہ سے شاعر کی شاعرانہ روح زخمی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اگرچہ کئی مقامات پر اقبال کا مفہوم غلط لیا ہے لیکن ایسے اشعار کی تعداد بھی خاصی ہے۔ جن میں فلسفہ اقبال اور ان کے فکر و فن کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسا ترجمہ مثالی ہے، جس میں روز مرہ اور محاورہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

اسیر نے بعض الفاظ کا مفہوم غلط سمجھا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں

الفاظ	غلط ترجمہ	صحیح
صیاد	مرغ گیر	ہنکاری (شکاری)
یزداں	قیامت	اللہ تعالیٰ کی بارگاہ
کیسہ	میان	جیب
فردا	گزشتہ کل	آنے والا کل
شاہین	پرندوں	شاہین
کساد	قیمتی	جس شے سے تجارت میں خسارہ ہو (بیکارہ)

در و بام	ہر کونے	نچلی اونچی منزل
وادیٔ ایمن	اپنے نور کی مشعل	ایمن کی وادی
طناب	رباب کے تار	خیمے کی رسی
پچھم	جنوب	مغرب

بعض الفاظ یکسر نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو مندجہ ذیل ہیں۔

نیستاں، سوزِ یقین، خُمرہ، سیماب، چکوروں، سکون و ثبات، دو مصرے جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ع متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی

ع تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

تین مصرعوں کا ترجمہ جن میں الفاظ و تراکیب کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ع درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

ترجمہ:۔

خدائے باند توکل زما وطن توله دنیا ده

(مجھے اللہ پر بھروسہ ہے کہ ساری دنیا میرا وطن ہے۔)

ع میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند

ترجمہ:۔

زۀ یمه مومن په ایمان کلکه زما ملا دے

میں بندۂ مومن ہوں ایمان پر میری کمر مضبوط ہے۔

ع خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

ترجمہ:۔

شپے نه به څنګ اووائی چه دغه ورځ رنړا ده

رات کو کس طرح روشن دن سے تعبیر کرے گا۔

اسیر نے فارسی اشعار کے ترجمے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور اپنی جگہ اُسی صورت میں نقل کر دیے ہیں۔

قاضی عبدالحلیم اثرؔ کو اردو، فارسی اور پشتو تینوں زبانوں پر عبور اور قدرت حاصل ہے۔ ان کا اندازِ عالمانہ اور پیچیدہ ہے۔ چونکہ اکثر اصل الفاظ و قوافی مستعمل ہیں اور ان کے پشتو مترادفات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اس لیے اندازِ بیان مشکل ہو کر رہ گیا ہے۔ انھوں نے عبداللہ جان اسیرؔ کے ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے کیونکہ بعض شواہد سے ان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ اسیر کے ترجمے کا جب اصل کلام سے موازنہ کرتے ہیں اور بے شمار خامیوں سے واقف ہوتے ہیں تو قافیہ پیائی کی الجھنوں کا خود شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ کلام اقبال اور اپنی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے اپنے الفاظ پر علامہ

کے الفاظ و قوافی کی ترجیح دے دیتے ہیں یا انھیں عالمانہ تخیل میں نری لفاظی کی جستجو میں پشتو الفاظ کا احساس نہیں رہتا اور جس سے کئی شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں۔

۱۔ کیا پشتو زبان و ادب کا دائرہ تنگ ہے ؟

۲۔ کیا مترجم کی شعریت کا دامن وسیع نہیں ؟

۳۔ کیا شاعر کا علم اور تجربہ خام ہے ؟ اور شاعری اس کے تساہل کی نذر ہو کر رہ گئی ہے ؟

پشتو زبان دو ہزار سال پرانی قدیم زبان ہے، اس کے شعر و ادب کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور اس کا لا محدود ذخیرۂ ادب اس زبان کے استحکام اور نام و دوام کی علامت ہے۔ آثر کی شعر و شاعری اور علم و تجربہ میں احتمال کا ہونا محال ہے۔ کیونکہ بال جبریل (پشتو) کے لیے مولانا عبد القادر نے اُن کا انتخاب بے جا نہیں کیا۔ ان کی شاعری، علمیت اور اسلام دوستی اور وسیع تجربے کی اساس پر انھیں یہ بڑی اور اہم ذمہ داری سونپی گئی۔

بال جبریل میں شاعری زیادہ اور فلسفہ کم ہے اس لیے علامہ کی اس اہم تصنیف کو پشتو کا جامہ پہنانے کے لیے ایک ایسے شاعر کی ضرورت تھی جس میں پشتون کی صفات پائی جائیں۔ جو خود آگاہ اور خدا آگاہ ہونے کے علاوہ اس صحیفۂ پیغبری کو اخلاقی اور حکیمانہ انداز سے دلکش پشتو شاعری کے روپ میں دکھا سکیں۔ چنانچہ شاعر مترجم نے بھرپور کوشش کی اور اس اہم کام کو بڑی محنت کیساتھ انجام دیا۔ لیکن بحر کو چست، اوزان کو متوازن اور مصرعوں کو مختصر اور برابر رکھنے میں وہ غفلت کے مرتکب ضرور ہوئے ہیں۔ آزاد ترجمے کی دھن میں وہ محور پر کنٹرول رکھنے کی بجائے لاپروائی سے طوالت میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر، شعری غلطیوں کے ساتھ ساتھ مفہوم کی خامیوں سے بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔

علامہ اقبال کی جو پُر شوکت تصویر بال جبریل میں نظر آتی ہے۔ ترجمے میں اس کا رنگ پھیکا، پیلا، گرد آلود اور متزلزل نظر آتا ہے، لیکن ان تمام فروگزاشتوں کے باوجود بھی مترجم شاعر کی کاوشیں بڑی وقعت رکھتی ہیں اور کئی سال مسلسل محنت و عمل کے طفیل بال جبریل کی منظوم پشتو صورت، پرکشش دلآویز انداز میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ تصویر اسیر کے مقابلے میں دلکش، پررونق اور جاذبِ توجہ ہے۔ اگر ترجمے کو ان خامیوں سے پاک کیا جائے تو علامہ کی اصل تصویر سامنے آنے کے روشن امکانات ہیں۔ پشتو قارئین جو اردو پر بھی قدرت رکھتے ہیں، اصل اور ترجمہ کے موازنہ کی صورت میں مترجم کے لیے آزمائش کا مقام پیدا کرتے ہیں۔

صیاد اور غمزہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خورشید، شورِ حریم ذات، تخیل، تجلیات، حرم، دیر، ساقی، مے، شورِ چنگ۔ الوندی، خداوندی، رِشی جیسے الفاظ اصلی صورت میں نقل ہیں اور ان کے ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اصل قوافی کثرت سے مستعمل ہیں۔ بعض مصرعوں کے ترجمے میں زمانے کا فرق ہے۔ بعض مصرعے اتنے طویل اور پیچیدہ ہیں کہ بحروں کی طوالت پر نثر کا گمان ہوتا ہے۔

"آب گہر" بمعنی جوہر استعمال کیا، شہنشاہی بمعنی شاہین، روباہی بمعنی گیدڑ، زر و ستم کے بجائے زر و سیم چاہیے۔ ژوند کی جگہ ژوندون چاہیے، حکیم کی جگہ کلیم املا کی غلطی ہے۔

آتش آشامی بمعنی آگ تاپنا استعمال کیا جو کہ شراب نوشی یعنی عشق کے معنی میں ہے۔

قاضی عبدالحلیم اثر افغانی سے شعری تراکیب کا مزہ ست پڑ گیا ہے کیونکہ کلام اقبال کی چست بحروں کے تندو تیز لہروں کی معمولی جھلک بھی ترجمے میں نظر نہیں آتی۔ اس لیے ترجمے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ تاکہ فنی خوبیوں سے مالامال ترجمہ سے پشتون بال جبریل کے سبب بلند تخیل اور بلند پروازی کا سبق ازبر کر سکیں۔

علامہ جیسے مفکر شاعر کے فلسفیانہ خیالات کو دوسری زبان کی منظوم صورت میں پیش کرنا ایک کٹھن اور بھاری کام تھا اور پھر شعری محاسن کی ضروریات کا خیال رکھنا اور بھی مشکل تھا لیکن راحت صاحب ایسے تجربات میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ترجمے میں ضرب الامثال، محاورات اور روزمرہ کے استعمال کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن بعض اوقات ترجمہ ضرورت سے زائد دکھائی دیتا ہے جہاں مترجم منظوم تراجم کی ازلی مجبوریوں کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب شاعر کا خیال اور انداز بیان اتنا پرجوش ہو جائے کہ دوسری زبان کا مترجم شاعر خیال اور انداز بیان میں سے ایک کو قابو کر لیتا ہے تو دوسرا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

راحت ترجمے کے طویل سفر کے پیشرو تھے۔ اس نے اقبال کو پشتون بنایا ہے، ایک اچھے ترجمے کے مادے سے خاصا بڑا حصہ پایا ہے پھر پچاس ساٹھ سال کی متواتر مشق نے تو اُس کو اس میدان میں سب سے اونچا مقام دیا تھا۔ مختصر یہ کہ بانگ درا کے پشتو ترجمے کا یہ کام راحت نے اس زمانے سے شروع کیا تھا جب اقبال پہلی بار شعرو شاعری کے میدان میں آئے تھے۔ ایسا مترجم آدمی کہاں سے پیدا کرے۔

دوسرے مترجمین کی طرح راحت نے بھی اصل الفاظ و قوافی استعمال کئے ہیں، جن کی وجہ سے ترجمہ پیچیدہ اور مشکل ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسی ہی کیفیت پشتو قارئین کے لیے ذوق و شوق کی بجائے بدمذاقی اور بیزاری کا سبب بنتی ہے۔

بعض بحریں طویل اور سُست ہیں جو شعروں کو پھیکی نثر بنادیتی ہیں۔ شاعر مفہوم کی گرفت میں شعریت کا دامن چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اُس کی کاوشیں خوبیوں کی بجائے خامیوں میں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے مفہوم کو مقدم سمجھا اور اس کے لیے وہ بعض اوقات وزن بحر کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔

نقادانِ سخن جانتے ہیں، کہ شاعر کی پچاس فیصد صلاحتیں جستجوئے قوافی کی نذر ہو جاتی ہیں اور وقت کا مصرف بھی اِسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن شعرو سخن کے قلبی واردات اور باطنی و ظاہری تاثرات مسلمہ ہیں۔ بہ سے بہتر کی تلاش میں ہر شاعر کی تگ ودو جاری و ساری نظر آتی ہے، اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو قوافئی اصل کے استعمال کی دھن اور متزلزل حور کی سنک بھی انھیں افغانی اقبال بنانے سے نہ روک سکی۔ شعرو سخن کے میدان میں ان کا تجربہ کافی پرانا ہے اور وہ شعر کے میدان میں اقبال کے شانہ بشانہ دکھائی دیتے ہیں۔

اگرچہ راحت نے بعض الفاظ نظر انداز کر دیے ہیں جیسے در، بے آواز، مصلحت آمیز، محمل، گداز، آرائش، زنداں، پُرنم، قمر سم، گاز، تہ داماں، ازاں، اطلسِ قبایان، زیر گردوں۔ لیکن مطلب پر کوئی حرف نہیں آتا بعض الفاظ و محاورت مثلاً اسویلی، چغے سوران، لوغړن، یخه پخه، د سولو په شان کوتره، ریزمریز، بیلتون، آره آرا، د غنچک ستورو په شان، مزلونه په بیدیا کے خوبصورت استعمال نے راحت کو حقیقت میں افغانی اقبال کے درجے پر فائز کیا ہے۔

شیر محمد مینوش نے بھی دوسرے مترجمین کی طرح اصل الفاظ وتراکیب کا بھر پور استعمال کیا ہے اور اصل قوافی کے استعمال کے مسائل کی الجھنوں کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ معانی اور پشتو مترادف کی تلاش میں کشمکش سے دوچار ہیں بایں سبب قافیہ پیمائی کی دھن میں بعض الفاظ وتراکیب کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور ترجمہ ادھورا اور نامکمل ہو کر رہ جاتا ہے۔ قافیے مشکل، مطالب الٹ، الفاظ نامناسب اور ناموزوں، جن کی وجہ سے ترجمہ پیچیدہ اور مہمل سا ہو کر رہ گیا ہے۔ مینوش کلام اقبال کے پرانے مترجم ہیں۔ مرحوم راحت زاخیلی اور مینوش پشتون شعرا کے اس پرانے گروہ سے ہیں جنھوں نے کلام اقبال کا پشتو ترجمہ بڑے خلوص و عقیدت کے ساتھ مدت سے کیا تھا۔ قارئین پیام مشرق (پشتو) پڑھنے کے بعد ترجے کی لذت خود بخود سمجھ جائیں گے۔

حافظ محمد ادریس (پروفیسر عربی ڈیپارٹمنٹ) نے باریک بینی سے ترجے میں تصحیح کا فریضہ انجام دیا اور ترجمہ اور بھی خوبصورت ہوا۔ ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور پھر شعر کا شعر میں اس سے بھی زیادہ مشکل۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میرا یہ ترجمہ ہر ممکن ترجے سے بہتر ہے اور اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تو یہ یقیناً نامناسب ہوگا۔ ہر مترجم کی حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ اس کا ترجمہ درست ہو، اور حظ بخش بھی۔ مترجم مقید بھی ہوتا ہے اور آزاد بھی۔ اس مجبوری اور مختاری کے درمیان ایک ہی راہ متعین کرنا ایک انجان سا معلوم ہوتا ہے۔ مترجم اصل پر بھی اچھی دسترس رکھتا ہے اور اپنی زبان کے الفاظ واصطلاحات اور مدو جذر پر بھی خوب حاوی ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر مترجم کے الفاظ کی ساخت آپ کو ایک رنگ میں دکھائی دے اور مجھے دوسرے رنگ میں، تو ایسا فرق ترجے میں لازماً تسلیم کرنا چاہیے۔ مینوش نے ایک طرز پر ترجمہ کیا، حافظ صاحب نے چھان پھٹک کی اور اس میں فرق آیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہی ترجمہ آخری ہے اور اس میں کوئی تصحیح کی گنجائش نہیں۔

مینوش کے ترجے کا عمومی رنگ شعر کی بے ساختگی اور روانی کے لطیف اثر سے خالی ہے۔ وہ اصل مفہوم کو منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، جس سے ترجے کا کام ایک لحاظ سے مکمل ہوا لیکن شعریت کا دامن تنگ ہونے کی بنا پر، اس نے فارسی الفاظ کے پشتو مترادفات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بعض اوقات ترجمہ میں شاعر کا تجربہ حاوی ہو جاتا ہے اور وہ اصل کی شیریں زبان اور رنگین پیرایہ بیان کی نشاندہی کر جاتے ہیں۔

نکتہ چینی اور عیوب کی نشاندہی بہ نسبت تصحیح کے سہل اور آسان ہے۔ جب کسی کے کلام کو نکتہ چینی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو بے شمار اور ان گنت خامیاں سامنے آتی ہیں لیکن تصحیح کے مرحلے پر بڑے سے بڑا نکتہ شناس بھی بے بس دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک پیام مشرق اور اس کے ترجے کا تعلق ہے، پیام مشرق جیسی تصنیف جو مختلف اوزان وبحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحر ذخار ہے، کا ترجمہ اتنا آسان نہیں تھا، جسے بس ایک ہی نظر میں پلٹ دیا۔ یہ بڑے غور و فکر، سوچ بچار اور تحقیق و جستجو کا کام ہے۔ جس کے لیے ہزاروں رات کی نیندیں حرام اور ہزاروں صبحیں بیقرار کی ہوں گی۔ یہ ایک ایسا پیغام تھا جو مشرق سے مغرب کے نام ہے۔ یہ علامہ کی زندگی کا نچوڑ اور آرزوؤں کا ماحصل ہے۔ ترجمہ، سرسوں ہتھیلی پر نہیں جمتی کے مصداق ہے۔ جس میں شاعر کی فنکارانہ اور دانشمندانہ کاوشیں روزروشن کی طرح عیاں ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ترجمہ، ترجمہ ہی ہے اور اصل نہیں ہو سکتا۔ سمندر کے بقول کہ ترجمہ گلدار چادر کا دوسرا رخ ہے جس سے صرف اصل کا اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

مینوش نے بعض الفاظ کے معانی غلط کئے ہیں۔

الفاظ	غلط معانی	صحیح
حزم	دانائی	استقلال
سوز طلب کر	سوز پیدا کر	سوز چاہنا
طوطی و دراج و سار	پرندے قطار در قطار	طوطی، تنذرے، سار
باد بہار اوزید	عجیب خوبصورت باغ ہیں	بادِ بہاری چلی
سفال	جام	مٹی
چیتا	شیر	پڑانگ

بعض مصرعوں کے ترجمے بھی غلط ہیں۔ بعض الفاظ جیسے انفس، آفاق، ابر، انجم، آشیاں، پنہاں، ظاہر، صد صبح بلاخیزے نظر انداز کیے گئے ہیں اور جو ئبار، ایاغ، فروردین، پروین، رہ بین، درون، خاک و خون، بے چگون جیسے اصل الفاظ مستعمل ہیں۔ رنگ، پلنگ، نہنگ کے ترجمہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ پچون اور گون مشکل قافیے اور بعض مصرعے خانہ پری کے مترادف ہیں۔

بعض الفاظ وتراکیب مثالی ہیں جن سے ترجمے کی ساکھ قائم ہوئی ہے مثلاً د برخے پونه ، دا اکٹی د دز نه زرگے بو ز نیدل ،تروته وغیرہ

اسلیے ترجمہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ کلامِ اقبال کی وقعت کو ٹھیس پہنچانے سے بچایا جاسکے اور پیامِ مشرق کی اصل روح پشتو پیام کی صورت میں پشتونوں کے لیے جلوہ گر ہو سکے۔

ضربِ کلیم کے ترجمے میں دو مصرعوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ بعض تراجم غلط ہیں ایک شعر کا ترجمہ دہرایا گیا ہے۔ بعض نظموں کے عنوانات بھی غلط درج ہیں زیادہ تر اصلی الفاظ اور قوافی مستعمل ہیں۔ لیکن بعض نظموں میں شاعر مترجم نے اپنی شاعری کا جادو جگایا ہے۔ بحریں چست اور مصرعے مختصر ہیں۔ انداز بیان شوخ اور نرالا ہے اور شاعری موسیقیت اور ترنم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگر اغلاط کی تصحیح کی جائے تو ترجمہ معیاری ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ پھر بھی ہم کہنے پر مجبور ہیں کہ اقبال کے فلسفیانہ کلام کو پشتو میں پیش کرنا اور منظوم لباس پہنانا تاکہ پشتون بھی اس خاص پیام سے کماحقہ واقف ہو جائیں، مینوش کا قابلِ قدر اور قابلِ فخر کارنامہ ہے اور یہ کام مرحوم کے لئے صدقہ جاریہ کا درجہ رکھتا ہے۔

ترجمے کا انحصار زبان وبیان پر قدرت حاصل ہونے میں مضمر ہے۔ ایک ایسا ترجمہ جو شاعر کے فکر وفن کی صحیح عکاسی کرنے کے ساتھ لفظی ومعنوی خوبیوں کا ایک اعلیٰ مرقع بھی ہو اور قارئین کے لیے دلچسپی کے سامان بھی رکھتا ہو معیاری ترجمہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک حمزہ بابا کے ترجمے کا تعلق ہے، ان سے بھی کئی مقامات پر غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اگرچہ تقویم الحق کاکاخیل نے بھی نظر ثانی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ کہیں قافیوں میں فرق ہے، کہیں ترجمہ غلط ہے، کہیں اصلی قوافی مستعمل ہیں، کہیں مطالب پیچیدہ اور مبہم ہیں، کہیں املا کی غلطیاں ہیں اور کہیں کئی اشعار کا ترجمہ مفقود ہے۔ ترجمہ کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہو جب اس قسم کی خامیاں سامنے آتی ہیں۔ ترجمے کے معیار کا قائم رکھا جانا محال ہے۔ اگرچہ یہ بات مسلمہ ہے کہ حمزہ عالم فاضل شخصیت تھے

اور پشتو زبان وادب میں بابائے غزل کا درجہ رکھتے تھے۔ شعریت کا دامن بھی وسیع تھا، ایک اعلیٰ پائے کے اقبال شناس بھی تھے لیکن جب ان کے کلام کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو بے شمار کوتاہیوں کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور بابا کا فکر و فن مشکوک دکھائی دینے لگتا ہے۔

انہی کوتاہیوں سے قطع نظر روزمرہ اور محاورہ کا استعمال برمحل اور دلکش ہے۔ محاورے کی چاشنی سے ترجمہ مزین ہے۔ جہاں محاورات مستعمل ہیں وہاں ترجمہ مثالی اور قابل ستائش ہے۔ ترجمے کی بحریں چست اور مصرعے مختصر ہیں۔ بعض الفاظ و تراکیب اضافی استعمال ہوئے جن سے ترجمے کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ حمزہ نے ارمغان حجاز، جاوید نامہ کے ترجمہ میں چھ اشعار چھوڑ دیے ہیں۔ بعض قافیے غلط ہیں۔ بعض الفاظ جیسے خوان، نوجوان، محبت، کڑک، زائد استعمال کیے ہیں۔

مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی غلط لیے ہیں۔

الفاظ	غلط ترجمہ	صحیح
کو	پہاڑ	کوچہ، گلی
جُرعہ	مٹی	گھونٹ
آرمیدم	بے قرار ہونا	آرام میں ہونا
آہ صبحگاہی	آدھی رات کی آہیں	صبح کی آہیں
اعجمی	عجم	عجمی
غریبم	مفلس	اجنبی
اشک	خون	آنسو
خوش سرودم	خوشحال اور بہت اچھا	خوب نغمہ سرائی
صدوسی	سواسی	ایک سو تیس
کِشت	ملک	کھیتی
قمری	قمر (چاند)	قُمری پرندہ
بیخ	تنا	جڑ
جواں	جوان	نہر، دریا
خاکش	خاک	قبر
دوش	آج	گزشتہ کل
عجم	عرب	عجم

حکیم مریخی کے اشعار زندہ رود کے عنوان سے دیے گئے ہیں۔ بعض اصل الفاظ جیسے نیرنگ و سیما، مشکل الفاظ و قوانی استعمال کیے ہیں۔ جبریل، ہیہات اضافی الفاظ ہیں

بعض مصرعے برابر نہیں ہیں، بعض الفاظ وتراکیب نہایت خوبصورت استعمال کیے ہیں۔ جن سے ترجمے کا معیار بلند ہوا ہے مثلاً

یخ تیتر، مینخ ڈکل زیرئ ویښتل، سپینے تبنتی وغیرہ۔

ارمغان حجاز علامہ اقبال کی اس آرزو کا برملا اظہار ہے جس کی کلام اقبال جگہ بہ جگہ جھلک دکھاتا ہے۔ خانہ کعبہ اور روضہ اقدس کا دیدار اُن کی دیرینہ تمنا تھی لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہوئی اس کے باوجود وہ یہ درس ضرور دیتے ہیں۔ حمزہ کی زندگی بھی ایک صوفی کی زندگی تھی، انھیں شعائر اللہ عزیز تر ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علامہ کی اس تصنیف کو ترجمہ کرنے کی ٹھان لی جس میں عشقِ رسولؐ کا بھرپور اظہار ہے۔

جاوید نامہ علامہ اقبال کی بزبانِ فارسی وہ کلام ہے جو حقائق و معارف اور اسلامی تصوف کا نمونہ ہے۔ یہ شاعری اور فلسفے کا امتزاج ہے۔ ایک ایسا شاعر جو شعر و سخن میں اچھی دسترس رکھنے کے علاوہ تصوف اور فلسفہ پر بھی عبور رکھتا ہو جاوید نامہ کا ترجمہ کرانے کا اہل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی خوبیاں حمزہ میں نظر آتی ہیں اور وہ اپنی تخلیقی فطرت اور خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ترجمے کی بھاری ذمہ داری سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوئے۔ ترجمے کا فن سعی بلیغ اور علم و بصیرت کا متقاضی ہے۔ حمزہ شنواری نے بھی حتی الوسع کوشش کی کہ ان کا ترجمہ مثالی اور معیاری ہو لیکن ترجمہ آخر ترجمہ ہے۔

متبادل زبان الفاظ وتراکیب، ضرب الامثال، روزمرہ اور محاورات کے استعمال سے وہ جادو نہیں جگایا جا سکتا جو اصل کا حصہ ہے۔ شاعر شاعرانہ تلازمات اور تشبیہ و استعارے سے کام لیتے ہوئے بھی اصل کا مترادف پیش نہین کر سکتا بلکہ عکس ہی پیش کر سکتا ہے۔ مصور اپنی مورتوں میں جو مہارت دکھاتا ہے اور انھیں جس خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی سے تراشتا ہے۔ مترجم اس کا صرف خیالی پیکر تیار کرتا ہے اور اسے اپنے تخیل اور اندازِ بیان میں پیش کرتا ہے۔

شاعر مترجم کی محنت و خلوص پر شک کرنا ناانصافی کے مترادف ہے کیوں کہ انھوں نے ترجمے پر ذاتی رنگ کو غالب کر کے دکھایا ہے جس سے ترجمہ اصل کے اتنا قریب ہے کہ اس پر طبع زاد کا گمان ہونے لگتا ہے اور ترجمہ ہی دکھائی نہیں دیتا۔ ہم ان کے ترجمے کو ایک کامیاب ترجمہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔ ہم ان کی بصیرت، فکر و تخیل اور فنکاری کی خصوصیات نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر ترجمے پر نظرِ ثانی کر کے اغلاط اور کوتاہیوں کو دور کیا جائے تو ایک مثالی ترجمہ سامنے آنے کے زیادہ امکانات ہیں۔

سید صاحب نے مولانا عبدالقادر کے ایما پر سب سے پہلے زبورِ عجم کا ترجمہ کیا یہ ترجمہ پشتو اکیڈیمی اور اقبال اکیڈیمی کی مشترکہ کاوشوں کی پہلی سیڑھی ہے۔ زبورِ عجم کے ترجمہ میں زیادہ تر مشکلات اصطلاحات نے پیدا کیں۔ چونکہ علامہ اقبال نے ہر لفظ، تشبیہ اور استعارے کے لیے اپنے معنی مقرر کیے۔ اس لیے انھوں (مترجم) نے اس قسم کے الفاظ (ترجمے میں) اپنی جگہ چھوڑ دیے ہیں۔

زبورِ عجم علامہ اقبال کے تصورِ خودی کا شعری پیکر میں ایک مکمل تصویر فراہم کرتا ہے۔ لیکن فلسفیانہ فکر کے بیان کی خشک زبانی اور فلسفے کی مخصوص زبان اور اصطلاحات کے استعمال کی بجائے علامہ نے تشبیہات و استعارات کا رنگین پیرایہ اپنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اعلیٰ کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ایک بڑا کارنامہ ہے اور ایک ایسے کارنامے کی دوسری زبان میں بیان بھی ایک بہت مشکل اور محنت طلب کام ہے لیکن تقویم الحق کاکا خیل بڑی ہنر مندی اور محنت سے اس آزمائش سے نبرد آزما ہوئے اور بڑی حد تک اس کٹھن مہم میں

کامیاب ہوئے۔

مترجم نے کوشش کی کہ اقبال کے فکر و تخیل کو صحیح صورت میں پیش کریں چنانچہ اس عمل میں کامیابی کے ساتھ شعریت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کی وجہ سے اکثر مقامات پر ترجمہ تخلیقی اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر لفظی ترجمے کی بجائے آزاد ترجمہ ایسے انداز سے کیا جو شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔

بعض اصطلاحات و تراکیب "ول ول زلفے تار په تار، لوته د لول ، بادئے وری لکه بنره،، ارتے خلقے ، تیرله سره، پت پتونړی" وغیرہ مثالی ہیں۔ بعض الفاظ اضافی استعمال کیے۔ بعض جمع کی صورت میں لائے گئے۔ اصل الفاظ اور قوانی کثرت سے مستعمل ہیں۔ بعض الفاظ جیسے راہِ نشیاں، شاہین، غافل، انجم، ایام کا مرکب، ساق، جم، کردار، عیش، بوسیدہ، بدوی، رندان، دشت و جبل، چارسو، رسم کدو، نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

بعض الفاظ کے مفاہیم غلط ہیں۔

الفاظ	ترجمہ	صحیح
کُنِشت	دیر	یہودیوں کا معبد، آتش کدہ
مہ و پرویں	دن رات	چاند ستارے
ریشۂ تاریک	افکار	تاریک ریشہ
گلرنگ	سرخ خون	سرخ شراب
بے معرکہ	بے زورہ (بے طاقت)	بغیر جنگ و جدل کے
فاختہ	بلبل	فاختہ (کونترہ)
خوش لہجہ	خوش رنگ	خوش زبان، اچھی گفتگو
آئندہ	گزشتہ کل	آئندہ کل
شرر	شعلہ	چنگاری
برق تجلی	سرخ شعلہ	برق کی چمک دمک
ہالہ	حالہ	چاند کے گرد حلقہ
نارہا	آگ	انار کے دانے

ضرب کلیم کے ترجمے میں دوسری زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں، جو مخمل میں بوری کی پیوندکاری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن منظوم تراجم کرنے والے کی یہ ازلی مجبوری ہوتی ہے پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ترجمے کے زیادہ ترحصے میں شعر کے معانی کے ساتھ جامے کی خوبصورتی کا خاص خیال رکھا گیا ہے، جس میں یہ معمولی خامیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

ضرب کلیم کا ترجمہ اصل الفاظ و قوافی کے استعمال کے علاوہ خامیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کا مرقع ہے۔ مصرعوں کی بحریں اور اوزان بے توازن، شعریت بے ہنگم اور زبان وبیان ڈانواں ڈول ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ الفاظ و تراکیب بے ترتیب اور غلط ہیں۔ ایک ایسا ترجمہ سید صاحب کی علمیت اور شعر و سخن کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے لیکن انھوں نے اقرار کیا اور اس قسم کے ترجمے پر پشیمان ہو کر اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر ہی دیا۔ اور ساتھ ہی اکثر اشعار اور مصرعوں کی اصلاح بھی کر دی۔ اصلاح کا یہ تنقیدی مضمون ماہنامہ "پشتو" ۱۹۷۰ میں شائع ہوا۔

سید صاحب کلام اقبال کے مترجمین میں عملی کام کے لحاظ سے سب سے آگے ہیں۔ وہ بڑے اقبال شناس تھے اور علامہ اور ان کی تعلیمات سے بڑے متاثر تھے۔ پشتونوں کے لیے کلام اقبال کے زیادہ ترجمے کو پشتو زبان میں پیش کرنا پشتون ملت سے عقیدت و محبت کا برملا اظہار ہے۔ اگرچہ شعر و سخن کا ملکہ خداداد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی صرف ایک زبان کو دوسری زبان میں نہیں، بلکہ منظوم کلام کو دوسری زبان کے شعری سانچے میں ڈھالنا اور جبکہ زبان بھی فلسفیانہ اور متصوفانہ ہو نہایت مشکل کام ہے۔

شاعر مترجم سے فکر و فن اور انداز بیان کی غلطیاں ہوئی ہیں۔ جنہیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بعض مطالب پیچیدہ اور مبہم ہیں اور بعض مصرعے طویل اور بعض مختصر ہیں۔ نثر و نظم کا یہ الجھا ہوا انداز قارئین کے لیے نہایت بیزاری کا سبب ہے۔ ترجمہ کا مطلب آسان مادری زبان میں، دوسری زبان کے مطالب، سہل انداز میں پیش کرنا ہے۔ شاعر مفہوم کو مقدم سمجھتے ہوئے انداز بیان کی بے شمار کوتاہیوں کا شکار ہوئے جب انداز بیان پر قدرت رکھتے ہوئے چست بحور اور مختصر مصرعوں کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں تو فکر و تخیل ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اس لیے زیادہ تر کلام اصل پڑھے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔ انھوں نے کلام اقبال کا وہ حصہ منتخب کیا جو فلسفہ سے عبارت ہے۔ جس کا بیان پیچیدہ اور سخت ہے۔ پھر ایسے کلام کا ترجمہ صحیح و درست انداز میں سلیس و سادہ طریق پر پیش کرنا کیسے آسان ہو سکتا ہے۔ انہی فروگزاشتوں کے باوجود بھی ترجمہ معیاری ہے لیکن ان کے ترجمے کو زیادہ نقصان ضرب کلیم کے ترجمے نے پہنچایا ہے۔ زبور عجم اور پس چہ باید کرد کے تراجم میں اگرچہ اصل الفاظ کی بھرمار ہے لیکن اگر انہی کوتاہیوں کا ازالہ کیا جائے اور اس پر نظر ثانی کر کے تصحیح کی جائے تو صف اول کے تراجم ہاتھ آسکتے ہیں۔

عبدالمنان اور مولوی صاحب گل نے علامہ کی شاعری سے گہرے اثرات قبول کیے، جن کے نتیجے میں شکوہ اور جواب شکوہ کا منظوم ترجمہ کر کے اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب کے رسم الخط کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں، ترجمہ بھی معیاری نہیں ہے۔ اس مصرعے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز

د جنگ په مینځ کښې که به راغے چرے وقت د نماز

یا یہ مصرع :۔

بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

کالی دریا کښې خپل اسونه ز غلوی دی مونږ

بعض مصرعوں کے وزن بھی صحیح نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود بھی اس ترجمے کی تاریخی حیثیت مسلم ہے کہ ایک دور افتادہ علاقہ کوہی بر مول کے ایک عالم پشتون علامہ کے کلام سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کی شہرۂ آفاق نظم پشتو میں ڈھالنے کی ضرورت محسوس کی۔ جواب شکوہ کے ترجمہ میں بعض بند کلیات کی ترتیب پر نہیں ہیں مترجم نے اپنی تخلیق کردہ نظم بھی آخر میں رقم کی ہے جس کا عنوان "اقرار دعنایت" (عنایت کا اقرار) ہے۔

عبدالمنان کا ترجمہ سلیس اور عام فہم انداز سے کیا گیا ہے لیکن شکوہ کے آٹھ بند، جواب شکوہ کے تین بند کلیات اقبال سے زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا رسول کریمؐ سے اس شکوے کی شکایت اور آپؐ کا جواب سات سات بندوں پر مشتمل بھی اضافی ہیں۔

شاعر نے علامہ کے تخیل کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ رسم الخط بھی صحیح ہے لیکن بعض اغلاط عام ہیں۔ بعض جگہ مصرعوں کے اوزان اور قوانی میں بھی فرق ہے، لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود بھی ترجمہ معیاری دکھائی دیتا ہے اور مترجم اقبال کا تخیل سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے ان تراجم کی حیثیت مسلم ہے۔ عبدالمنان کا ترجمہ علامہ کی وفات کے سات سال بعد ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا اور مولوی صاحب گل کا ۱۹۴۶ء میں۔ اس سے پہلے پشتو شائع شدہ تراجم کا سراغ نہیں ملتا۔ گویا عبدالمنان کا ترجمہ علامہ اقبال پر سب سے پہلا ترجمہ ہے۔

کلام اقبال کے تراجم کا سلسلہ پشتو زبان میں اس وقت سے جاری ہے جب سے اُن کی نظمیں شائع ہوتی رہیں لیکن چھپے ہوئے تراجم کی ابتداء ۱۹۴۵ء سے ہوتی ہے اور ۱۹۶۹ء تک زور و شور سے جاری رہتی ہے۔ مترجمین کا تعلق زیادہ تر ان شعراء سے ہے جو پشتو کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ اپنے زمانے کے جامع العلوم اور معروف ادبا و ناقدین بھی تھے۔ انہی پشتون شعرا جو اقبال کی خودی سے متصف تھے، نے اقبال کے پیغام کو اولیت دی کہ یہ ان کی حیاتِ ملی سے قریب تر تھا اور اس پیغام کو سمجھنے اور اس کی ترویج واشاعت کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا، یہ عملی اقدام مسابقت کا وہ کردار تھا جو پشتو زبان وادب کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پشتونوں کے لیے علامہ کے فکر و فن کے کٹھن راستے ہموار کئے اور اس کی نشر میں جو لائحۂ عمل اختیار کیا، ان کی شہرتِ دوام کا سبب بنا۔ انھیں اقبال سے اتنی عقیدت ہے جتنی انھیں پشتو کے ہمہ صفت موصوف شاعر خوشحال خان خٹک اور صوفی شاعر رحمان بابا سے ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کا ترجمہ کیا ہے گویا اقبال کی شاعری، خوشحال رحمان کی دلاویز زبان میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ شاعر مشرق سے بے پناہ محبت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی منظومات تخلیقات اور نثری تحریریں بھی علامہ سے عقیدت کا بیّن ثبوت ہیں۔

علامہ نے اسلام سے اکتساب فیض حاصل کیا اور مترجمین بھی دین و عقائد کو اپنا شعار بنا کر عربی، فارسی، اردو اور پشتو کے ماہر العلوم بن گئے، اس کے ساتھ اصنافِ شاعری میں بھی کمال دکھایا۔ انھوں نے اپنے کمال فن سے اقبال کے فکر و فن کو اپنی زبان کا وہ دلکش دیدہ زیب لباس پہنایا جس سے وہ اور اُن کی شاعری افغان ملت کے لیے نئے سرے سے زندہ و تابندہ ہو گئی۔

کلام اقبال کے منظوم تراجم کا سہرا پشتو زبان وادب اور مذکورہ مترجمین کے سر ہے۔ جنھوں نے بڑی محنت سے یہ محنت طلب کام انجام دیا۔ پشتو ہی وہ علاقائی زبان ہے جس میں تصانیف اقبال کے تمام تراجم مکمل صورت میں موجود ہیں، اگر ان میں تھوڑی بہت اغلاط آئی ہیں، ہم انھیں ان کے گناہوں سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا بے پناہ خلوص، لگن اور ملک وملت اور شاعر مشرق سے عقیدت کا جذبہ قابل تعریف ہے اور ان نیکیوں کے ہوتے ہوئے ہم ان کی کاوشوں کو اقبال کے اِرم میں گل نورستہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن کے گلہائے عقیدت نیا رنگ اور نئی نکہت کے ساتھ نیا بہار لائے ہیں۔ اقبالیات کے ضمن میں پشتو شعرا کا کردار لائق صد تحسین وآفرین ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا، ان کی علمی کاوشوں کو دریا میں بہادینے کے مترادف ہے۔

ہمیں امید ہے کہ پشتو اکیڈمی پشاور اور اقبال اکادمی کی سرگرمیاں اسی طرح اقبالیات کی تجدید کرتی رہیں گی اور اپنے عظیم مفکر اور دانائے راز کو پشتونوں کے لیے ان ہی کی زبان میں ہر زمانے میں ہر نئے رنگ میں پیش کرتی رہے گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ معیاری تراجم کی تشنہ لبی کی سیرابی ابھی باقی ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ پشتون اہل قلم اور سخنور اقبال اکادمی کے توسط سے اور پشتو اکیڈمی کی زیر نگرانی اس یاسیت کو رجائیت میں بدلنے کے عملی اقدام کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔

کلام اقبال بنی نوع انسان کے لیے بالعموم اور امت مسلمہ کے لیے بالخصوص وہی راہیں متعین کرتا ہے جو دین اسلام درجہ انسانیت پر فائز ہونے کے لیے بتاتا ہے۔ اس کی ضرورت واہمیت کسی زمانے میں کم نہ ہوگی اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کی نت نئی شرحیں اور جدید تراجم نئے زمانے میں نیا رنگ دیتے رہیں گے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ تمام تراجم مختلف لائبریریوں میں گرد آلود صورت میں جوں کے توں موجود ہیں۔ پشتونوں نے نہ تو انہیں پڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ان کے پڑھنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ پشتون ملت کا تعلیم یافتہ طبقہ، ضرورت پڑنے پر اردو شرحین دیکھ کر اپنا مطلب نکالتے ہیں کیوں کہ وہ اصل اور تراجم کا تقابل کر کے شاعرانہ زبان وبیان کی الجھنوں میں، جہاں مبالغہ، شعریت، قافیہ پیمائی، اصطلاحات، تشبیہ، استعارے اور کنائے کی زبان ہو، اپنے مقصد سے پرے جانا نہیں چاہتے۔ وہ اصل کلام کا اپنی اصلی صورت میں مطالعہ کر کے حظ اٹھاتے ہیں اور علامہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ علامہ کی تخیلی پیکر کو پشتو زبان کے پشتو شاعر کی پسند کے لباس میں دیکھنے سے انہیں وہ طمانیت نصیب نہیں ہوتی جو انہیں شاعر مشرق کے زریں لباس میں ہوتی ہے۔

شاعر حسنِ بیان وزبان سے قارئین کے دلوں کی دھڑکن بنتا ہے۔ پشتونوں کو علامہ سے جو عقیدت ہے وہ انہیں پشتو کے مایہ ناز شعرا، خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا سے بھی ہے۔ اگر اقبال کی شاعری انہی شاعروں کی خالص فطری زبان وبیان کی صورت میں سامنے آتی تو قارئین کو کچھ نہ کچھ پڑھنے کی ترغیب مل جاتی۔

قارئین نت نئے موضوعات اور شاعری سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ قدیم روایتی شاعری سے جو جدت وندرت کا کوئی سامان نہ رکھتی ہو اور زبان بھی فرسودہ ہو جو شوق ولگن میں اضافہ کے بجائے بیزاری اور اکتاہٹ کا سبب بنے قطعاً پسند نہیں کرتے۔

مترجمین نے علامہ کو اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی یا ذاتی لگن اور شوق کو بروئے کار لایا۔ یا مالی منفعت کو ترجیح دے کر ایک بوجھ کے طور انجام دیا۔ جتنے ایڈیشن ابتداء، میں شائع ہوئے مختلف سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں پہنچ گئے۔ یہی سلسلہ وہیں رک گیا۔ کسی نے ان کو پڑھنے کی ضرروت محسوس نہیں کی۔ پڑھنے ہی سے کسی کتاب کی مانگ بڑھتی ہے۔ اکثر حضرات کو تراجم کا پتہ

ہی نہیں ہے۔ اکثر شعر و شاعری کا مذاق ہی نہیں رکھتے۔ سٹالوں پر یہی کتابیں نایاب ہیں اس لیے عام قارئین کے لیے سہل الوصول بھی نہیں ہیں۔ اگر کسی سٹال پر دستیاب ہیں تب بھی ان کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ زیادہ ضرورت مند کے علاوہ کوئی توجہ بھی نہیں دیتا۔

علامہ اقبال کی شاعری الفاظ و معانی کا بحرِ بے کراں ہے جن کے مطالب و مفاہیم کی تہہ تک رسائی حاصل کیے بغیر ترجمے کی کوشش بے سود ہے۔ اس ضمن میں اقبال اکیڈیمی کی کاوشیں قابلِ تعریف ہیں اور آئندہ بھی اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان تراجم کا نئے سرے سے جائزہ لے کر ان کے مفاہیم اور مطالب جہاں کوتاہیاں ہیں، درست کرنے کی کوشش کریں۔ اور سلیس و خالص پشتو کی، با محاورہ زبان میں از سرِ نو مرتب کر کے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی صورت میں شائع کرا کر قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرے۔

اگر پمفلٹس کی قیمتیں کم اور مناسب ہوں گی اور حجم بھی کم رہے اور مختلف سٹالوں پر سہل الوصول بھی ہوں تو پشتون قارئین کے لیے توجہ کا مرکز ضرور بنیں گے۔ اس طریقے سے وہ علامہ کے افکار و خیالات سے یقینی طور پر مستفید ہو سکیں گے۔ اکثر لوگوں کو علامہ کے اشعار یاد تو ہیں اور انہیں ان سے عقیدت بھی ہے لیکن سرسری طور پر۔ انھوں نے شاید کبھی گہرا مطالعہ نہیں کیا ہو۔ لیکن ان تراجم کے طفیل جب ان کو پڑھنے کی ترغیب ملے۔ علم میں اضافے اور عقیدت میں برکت کے مترادف ہو گا۔

ان پشتو تراجم کو تصحیح کے بعد اسی طرح شائع کیا جائے کہ ایک صفحے پر کلام اقبال کے اردو، فارسی اشعار اور دوسرے صفحے پر پشتو اشعار ہوں۔ اس طرح سے پشتو قارئین کی دلچسپی اور بھی بڑھے گی اور وہ کلام اقبال کا مفہوم سمجھنے پر بھی قدرت حاصل کر سکیں گے۔

اقبال اکیڈیمی اور پشتو اکیڈیمی کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں جو تراجم کیے گئے ہیں وہ ناکافی اور نایاب ہیں اور ہر خاص و عام کو دستیاب نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے عام اجراء کے لیے اب پھر سے نئی کوششوں کا آغاز ہونا چاہیے۔ کیونکہ جس مقصد کے لیے مولانا عبدالقادر نے جتن کیے اُس کی بارآوری نہیں ہوئی، جس کے لیے دونوں مذکورہ اداروں کو نئے سرے سے مستعدی کا ثبوت دینا ہو گا تاکہ پشتون طبقہ کی خدمت کا صحیح ہدف حاصل کیا جا سکے۔ لہٰذا دونوں ادارے پھر سے اس اہم ذمہ داری کو متفقہ طور پر قبول کر کے انسانی خدمت کے لیے عملی قدم اٹھانے میں پہل کریں۔

شعر و شاعری میں قافیہ پیمائی مقدم ہے اور مفہوم موخر، لیکن ہمیں مفہوم کو مقدم رکھنا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک نظم کے تمام اشعار ایک ہی قافیے میں ہوں بلکہ اگر ہر شعر کو الگ الگ قافیے میں رکھا جائے تو ترجمے کا حسن دوبالا ہو جائے اور مفہوم پر قابو رکھنے میں بھی آسانی پیدا ہو۔ ایسے پشتو شعرا، کا انتخاب کیا جائے جو پشتو شاعری کا تجربہ رکھنے کے ساتھ ساتھ کلام اقبال پر بھی گہری نظر رکھتے ہوں تاکہ وہ اقبال کی شاعری کو پشتو کے جدید سانچے میں ڈھال کر نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔

تعلیمی اداروں پر لازمی کیا جائے کہ وہ ان تراجم سے اپنی لائبریریوں کو زینت دیں۔ طلبہ میں مادری زبان کی وقعت کا احساس بھی دلایا جائے۔ پشتو اشعار اور کلام اقبال کے موازنہ پر تبصرے، تقریریں اور مباحثے منعقد کرائے جائیں تاکہ طلبہ میں علامہ اقبال کے فکر و فن کا شعور اجاگر ہو سکے۔ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں بھی ان تراجم کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کو بھی اس ذمہ داری میں شامل کرنا چاہیے کیونکہ ان کا رابطہ عوام کے ساتھ قریب ہوتا ہے۔

تراجم کے چھپ جانے کے بعد ضرورت مند ہاتھوں میں اور مناسب جگہوں پر ان کی ترسیل اور بجری بھی ایک اہم مرحلہ ہے۔ ان کی قیمتیں بے حد ارزاں اور خرچہ سے بھی کم مقرر کی جائیں اور ان کی خرید ان کے متعلقہ علاقوں کے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر تمام اداروں کی لائبریریوں کے لیے لازمی قرار دی جائے تاکہ یہ تراجم ہر شخص کے ہاتھوں میں زود تر اور باسہولت پہنچ سکیں۔

اخراجات تو ہوتے رہتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے رہتے ہیں لیکن اگر ان میں سے کچھ حصہ مذکورہ اہم ادارے اس کام کے لیے بھی وقف کر دیں تو ہم خرما و ہم ثواب کی مثل پشتون ملت کی خدمت و تعلیم اور تربیت بھی ہے اور اقبال کے کلام و پیغام کا اعتراف بھی۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت بھی ہے اور فلاح دارین بھی۔ اور سب سے بڑھ کر اپنے قومی شاعر کی تمنا پوری کر کے ملک و ملت سے وفاداری کا ثبوت بھی پیش کرنا ہے۔

اس کارِ خیر میں پشتون شعرا کی اہمیت مقدم ہے۔ انھیں اپنی مادری زبان کے ساتھ شہادتِ الفت کا ثبوت دینا ہے۔ وہ اپنے فکر و فن کی خداداد صلاحیتوں کو کام میں لا کر کلام اقبال کے تراجم کی تشنہ لبی کی سیرابی سے اس چمنستانِ ادب میں بسنت کی بہار پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسے شاعر تلمیذ الرحمٰن کا درجہ رکھتے ہیں اور قومی خدمت کا فریضہ انجام دینے سے محسن الملک والملت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو سکتے ہیں۔ تراجم کا یہ ویران اور اجڑا ہوا دبستان آج کے جدید دور کے پشتون شعرا کے لیے کھلا چیلنج ہے، جس میں انھیں اپنی ولولہ انگیز شاعری کا جادو جگانا اور اپنی قابلیت کا لوہا منوانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

اللہ کرے کہ وہ وقت آئے کہ کلام اقبال کے یہی تراجم ہمارے دیرینہ خوابوں کی زندہ تعبیر بن کر افقِ افغان ملت پر ماہتاب کی طرح چمکنے لگے اور خواب و خیال کے ظلمات چھٹ جانے سے کلام اقبال، روشن اقبال بن کر پشتون قوم کے دل و دماغ اجالا کر سکیں۔

آمین ______

کتابیات

(ا) بنیادی آماخذ

پشتو کتب　　اردو کتب

اخبارات و رسائل

(ب) ثانوی آماخذ

پشتو کتب　　اردو کتب

رسائل و میگزین　　دیگر کتب

۱

بنیادی مآخذ

پشتو کتب　　اردو کتب

اخبارات ورسائل

﴿۔۔۔کتابیات۔۔۔﴾

ا بنیادی مآخذ

1. بنیادی مآخذ:۔

ا۔ پشتو کتب:۔

ا۔ امیر حمزہ خان شنواری، مترجم، ارمغان حجاز، اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، نومبر ۱۹۶۴ء

۲۔ امیر حمزہ خان شنواری، مترجم، جاوید نامہ، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، جولائی ۱۹۶۷ء

۳۔ راحت اللہ زاخیلی، مترجم، بانگِ درا، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، جنوری ۱۹۶۳ء

۴۔ سمندر خان سمندر، مترجم، رموزِ بے خودی، طبع اول، کراچی، پاکستان پبلیکیشنز، ۱۹۵۲ء

۵۔ سمندر خان سمندر، مترجم، اسرار خودی، طبع اول، کراچی، پاکستان پبلیکیشنز، ۱۹۵۴ء

۶۔ شیر محمد مینوش، مترجم، پیام مشرق، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، نومبر ۱۹۶۳ء

۷۔ صاحب گل، مولوی حکیم، مترجم، گلہ جواب د گلے (شکوہ جواب شکوہ)، کھوئی بر مول مردان، ۱۳۶۵ھ

۹۔ عبدالحلیم اثر، قاضی، افغانی، مترجم، بال جبریل، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، نومبر ۱۹۶۷ء

۱۰۔ عبداللہ جان اسیر، مترجم، بال جبریل، (پلوشے)، کراچی 5 جہانگیر روڈ، یکم نومبر ۱۹۵۹ء

۱۱۔ عبدالمنان اپیل نویس، مترجم، شکوہ و جواب شکوہ، چارسدہ ضلع پشاور، حمیدیہ پریس، ۱۹۴۵ء

۱۵۔ محمد تقویم الحق کاکاخیل، سید میاں، مترجم، زبور عجم، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، جولائی ۱۹۶۱ء

۱۶۔ محمد تقویم الحق کاکاخیل، سید میاں، مترجم، ضرب کلیم، طبع اول، کراچی، اقبال اکیڈیمی، دسمبر ۱۹۶۷ء

۱۷۔ محمد تقویم الحق کاکاخیل، سید میاں، مترجم، مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد، اقبال اکیڈیمی، جون ۱۹۶۹ء

ب اردو کتب

۱۹- جاوید اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) طبع ہفتم، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، نومبر ۱۹۸۶ء

۲۰ - جاوید اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی)، طبع سوم، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، مارچ ۱۹۷۸ء

ب

ثانوی مآخذ

پشتو کتب
اردو کتب
رسائل و میگزین
دیگر کتب

2. ثانوی مآخذ :۔

ا۔ پشتو کتب :۔

۱۔ سید رسول رسا، میاں، شاعر اسلام علامہ اقبال، طبع اول، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، ۱۹۷۷ء

۲۔ عبدالرحمن بیتاب، علامہ اقبال (حالات اور خیالات)، طبع اول، نوشہرہ سٹی، تجارت پبلیکیشنز ۱۹۶۶ء

۳۔ عبدالقادر، مولانا، پہ جاوید نامہ یو نظر، طبع اول، پشاور، پشتو اکیڈیمی، ۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء

۴۔ عبداللہ ختانی، پښتانه داقبال په نظر کښې، کابل، پشتوٹولنہ، نمبر ۱۲۲، ۱۳۳۵ھ ش ۱۹۵۷ء

۵۔ عبداللہ ختانی، راز، کابل/افغانستان، پشتوٹولنہ، ۱۳۴۲ھ ش ۱۹۶۴ء

۶۔ محمد رفیق شاہ رفیق، کاکا خیل، میاں، اقبال اور رفیق خیال، نوشہرہ، اکبر پریس، ۱۹۹۱ء

۷۔ محمد سلیم، زمونږ مشران، پشاور، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، مارچ ۱۹۸۰ء

ب۔ اردو کتب :۔

۱۔ احمد سعید، پروفیسر، اقبال اور قائد اعظم، طبع ثانی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۹ء

۲۔ اختر راہی، مرتب، اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، لاہور، بزم اقبال، طبع اول، مارچ ۱۹۷۸ء

۳۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مترجم، شذرات اقبال، مصنف جاوید اقبال، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، دسمبر ۱۹۷۳ء

۴۔ ایوب صابر، جدید پشتو ادب، خیبر بازار پشاور، مکتبۂ شاہین جون ۱۹۷۴ء

۵۔ پردل خان خٹک، قدیم اور جدید شعرا کا کلام، طبع اول، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، مارچ ۱۹۸۷ء

۶۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، نقد اقبال حیات اقبال میں، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء

۷۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، طبع سوم، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، جلد اول، ۱۹۸۵ء

۸۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، طبع دوم لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، جلد سوم، ۱۹۸۷ء

۹۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، طبع ششم، لاہور، بزم اقبال، جون ۱۹۸۸ء

۱۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مقاصد اقبال، لاہور، علمی کتب خانہ، ۱۹۸۱ء

۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ، بزم اقبال، لاہور، طبع اول، جون ۱۹۸۴ء

۱۲۔ سید واجد رضوی، دانائے راز، طبع پنجم، لاہور، مقبول اکیڈیمی، ۱۹۸۸ء

۱۳۔ عابد علی عابد، سید،، تلمیحات اقبال، لاہور، بزم اقبال، طبع دوم، ۱۹۸۵ء

۱۴۔ عبدالروف نوشہروی، پشتو ادب ایک تعارف، یونیورسٹی ٹاؤن پشاور، اکادمی سائنس اردو پشتو، ۱۹۸۶ء

۱۵۔ عبدالواحد معینی، سید، مقالات اقبال، لاہور، شیخ محمد اشرف، تاجر کتب، کشمیری بازار، مئی ۱۹۶۳ء

۱۶۔ عطاءاللہ شیخ، اقبالنامہ، لاہور، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار، حصہ اول، س ن

۱۷۔ عطاءاللہ شیخ، اقبالنامہ، لاہور، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار، حصہ دوم، ۱۹۵۱ء

۱۸۔ فقیر وحیدالدین، سید، روزگارِ فقیر، طبع دوم، کراچی، فقیر سپننگ ملز لمیٹڈ، جلد اول، نومبر ۱۹۶۴ء

۱۹۔ فقیر وحیدالدین، سید، روزگارِ فقیر، لاہور، لائن آرٹ پریش لمیٹڈ دی مال، جلد دوم، نومبر ۱۹۸۴ء

۲۰۔ محمد عبداللہ، حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں، لاہور، بزم اقبال، طبع اول، مئی ۱۹۸۲ء

۲۱۔ محمد منور، پروفیسر، مرتب، مکاتیب اقبال بنام خان نیازالدین خان، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء

۲۲۔ ملا علی قاری، موضوعات کبیر، لاہور، مطبع کتب خانہ مظہری، س ن

۲۳۔ میر عبدالصمد خان، اقبال وافغان، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، اگست ۱۹۹۰ء

۲۴۔ نذیر نیازی سید، مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، طبع سوم، لاہور، بزم اقبال، مئی ۱۹۸۶ء

۲۵۔ ولی الدین، مرتب، مشکوٰۃ المصابیح، ابو محمد بن مسعود، دہلی، نور محمد تجارت کتب خانہ، ۱۹۳۲ء

۲۶۔ یوسف حسین خان، روحِ اقبال، لاہور، القمر انٹرپرائزز، جنوری ۱۹۹۶ء

۲۷۔ یونس جاوید، مرتب، صحیفۂ اقبال، لاہور، بزم اقبال، طبع اول، نومبر ۱۹۸۶ء

۲۸۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح ضرب کلیم، طبع دوم، لاہور، شرکت پبلشنگ ہاوس ۱۹۵۲ء

۲۹۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح اسرار خودی، عشرت پبلیشنگ ہاوس، لاہور، س ن

۳۰۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح بال جبریل، عشرت پبلیشنگ ہاوس، لاہور، س ن

۳۱۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلیشنگ ہاوس، لاہور، س ن

۳۲۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح پیامِ مشرق، عشرت پبلیشنگ ہاوس، لاہور، ۱۹۶۱ء

۳۳۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر عشرت پبلیشنگ ہاوس، لاہور، ۱۹۸۲ء

۳۴۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح ارمغان حجاز (اردو) عشرت پبلیشنگ ہاوس، لاہور، ۱۹۸۲ء

دیگر کتب

۳۵۔ عبدالرشید، میاں، مترجم، کلیات اقبال (فارسی)، جلد اول، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، س ن

۳۶۔ عبدالرشید، میاں، مترجم، کلیات اقبال (فارسی)، جلد دوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، س ن

۳۷۔ غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، س ن

۳۸۔ غلام رسول مہر، مطالب اسرار و رموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، س ن

ج۔اخبارات ورسائل:۔

۱۔ "اباسین" کراچی، اپریل ۱۹۶۲ء

"اباسین" کراچی، اپریل ۱۹۶۴ء

"اباسین" کراچی، اپریل ۱۹۷۱ء

"اباسین" کراچی، اپریل ۱۹۷۲ء

۲۔ "اباسین" پشاور، اپریل ۱۹۷۲ء

"اباسین" پشاور، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۴ء۔ اپریل ۱۹۸۵ء۔ نومبر ۱۹۸۴ء

"اباسین" پشاور، اپریل ۱۹۸۷ء۔ نومبر ۱۹۹۰ء۔ نومبر ۱۹۹۱ء

"اباسین" پشاور، اگست ۱۹۹۱ء۔ اپریل ۱۹۹۲ء۔ اپریل ۱۹۹۲ء

۳۔ "احسان" لاہور، ۳۰ مئی ۱۹۳۸ء اقبال نمبر

"احسان" لاہور، ۲۷ جون ۱۹۳۸ء اقبال نمبر

۴۔ "العلی" پشاور پبلک سکول اینڈ کالج پشاور، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۹ء

۵۔ "اولس" کوئٹہ، اپریل ۱۹۶۷ء۔ اپریل ۱۹۷۰ء۔ اپریل ۱۹۷۴ء

"اولس" کوئٹہ، اپریل ۱۹۷۵ء۔ اپریل ۱۹۷۶ء۔ اپریل ۱۹۷۷ء

"اولس" کوئٹہ، اکتوبر ۱۹۷۷ء۔ مئی ۱۹۷۸ء۔ اپریل ۱۹۸۶ء

۶۔ "ابلم" گورنمنٹ جہانزیب کالج سوات، س ن

۷۔ "پشتو" ماہنامہ، پشتو اکیڈیمی پشاور، ستمبر ۱۹۶۹ء۔ مئی ۱۹۷۰ء۔ اپریل ۱۹۷۵ء

"پشتو" ماہنامہ، پشتو اکیڈیمی پشاور، (اعتراف) نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء۔ جون ۱۹۷۷ء

"پشتو" ماہنامہ، پشتو اکیڈیمی پشاور، نومبر ۱۹۷۷ء، اقبال نمبر۔ مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء

"پشتو" ماہنامہ، پشتو اکیڈیمی پشاور، اپریل ۱۹۸۴ء۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۸ء

۸۔ "جرنل" جامعہ پشاور، دسمبر ۱۹۷۳ء۔ دسمبر ۱۹۸۵ء

۹۔ "جمہور اسلام" پشاور، اپریل ۱۹۶۰ء۔ اپریل ۱۹۷۰ء۔ اپریل ۱۹۷۴ء

"جمہورِ اسلام" پشاور، مارچ، اپریل ۱۹۷۶ء۔ اگست ۱۹۷۷ء۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء

۱۰۔ "خیبر" اسلامیہ کالج پشاور، ۸۴-۱۹۸۵ء

۱۱۔ "رنرا" مرکزی اردو بورڈ پشاور، دسمبر ۱۹۷۵ء

۱۲۔ "سمیز ین" یونیورسٹی آف انجلیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور، دسمبر ۱۹۸۰ء

۱۳۔ "غنچہ" یونیورسٹی ماڈل سکول پشاور، ۱۹۸۳ء

۱۴۔ "کارواں" بٹ خیلہ ملاکنڈ ایجنسی، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۵۔ "کارواں" بٹ خیلہ ملاکنڈ ایجنسی، مارچ ۱۹۸۹ء

۱۶۔ "مشعل" ادارہ تعلیم و تحقیق، ڈی۔آئی۔خان، جنوری، جون ۱۹۶۱ء

۱۷۔ "وحدت" روزنامہ پشاور، ۹ نومبر ۱۹۸۶ء، ۹ نومبر ۱۹۸۷ء، ۹ نومبر ۱۹۸۸ء

"وحدت" روزنامہ پشاور، ۹ نومبر ۱۹۸۹ء، ۹ نومبر ۱۹۹۰ء

۱۸۔ "یونی میگ" جامعہ پشاور، ۱۹۸۱ء

دیگر رسائل و میگزین :۔

"اقبال" اقبال نمبر، بزم اقبال لاہور، جنوری، اپریل، ۲۰۰۲ء
"الفیصل" ڈویژن پبلک سکول فیصل آباد، ۱۹۸۸ء
"دامن سرحد" اقبال نمبر (حصہ اول)، مجلس ترقی ادب لاہور کا علمی مجلہ، ۱۹۷۳ء
"شفق" گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مردان، ۱۹۹۴-۱۹۹۳
"کاغان" گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد، ۱۹۹۳ء
"مہد" پولیس پبلک سکول پشاور، ۱۹۹۲ء
"میرمن" جناح کالج برائے خواتین پشاور یونیورسٹی، ۸۰-۱۹۷۹ء

3. دیگر کتب :۔

۱۔ احمد ندیم قاسمی، مرتب، فلسفہ اقبال، طبع دوم، لاہور، بزم اقبال، مارچ ۱۹۸۴ء
۲۔ ثاقب رزمی، اقبال کی انقلابیت، لاہور، مقبول اکیڈیمی، ۱۹۹۰ء
۳۔ رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر، مرتب، اوراق گم گشتہ، طبع دوم، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۴۔ رفیع الدین ہاشمی، مرتب، خطوط اقبال، طبع اول، لاہور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۷۶ء
۵۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبالیاتی جائزے، طبع اول، لاہور، گلوب پبلیکیشنز، ۱۹۹۰
۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مقامات اقبال، طبع ثانی، لاہور، لاہور اکیڈیمی، اکتوبر ۱۹۶۴ء
۷۔ عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخر دو سال، طبع اول، لاہور، سنگِ میل پبلیکشنز، ۱۹۸۹ء
۸۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال ایک مطالعہ طبع اول، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۷ء
۹۔ غلام مصطفی خان، اقبال اور قرآن، طبع اول، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، دسمبر ۱۹۷۷ء
۱۰۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، تقدیر امم اور اقبال، طبع اول، لاہور، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۸۳ء
۱۱۔ محمد علی شیخ، نظریات و افکار اقبال، طبع اول، اسلام آباد، نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۴ء
۱۲۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، مرتب، اقبال ۸۵، طبع اول، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۹ء
۱۳۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، مرتب، اقبال ۸۴، طبع اول، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء

دیگر پشتو کتب

صدیق اللہ رشتین، د پښتو نثر هنداره، طبع اوّل، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، ۱۳۴۲ هش ۱۹۶۲ء

فرمان مسافر، اخون زاده، د پښتو ادب ځلنده ستوری، چارسده، پشاور، مکتبهٔ اباسین، اگست ۱۹۸۲ء

قلم بجادر، اسد قریشی، سوبلی ستوری، پشاور، حمیدیہ پرنٹنگ پریس، ستمبر ۱۹۸۳ء

کلیم اللہ صدام پشین، ڈاکٹر، سمیلی پښتانه، نثر لیکونکی، کوئٹہ، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۵ء

ہمیش خلیل، پښتانه لیکوال، جہانگیر پورہ پشاور، دارالتصنیف، ۱۹۶۱ء

۔۔۔غیر مطبوعہ کتب۔۔۔

۱۔ محمد اعظم اعظم، مترجم، زندہ رود، مصنف ڈاکٹر جاوید اقبال

۲۔ محمد پرویش شاہین، اقبال اور پختون

۳۔ محمد پرویش شاہین اقبال اور پختونخوا

۴۔ محمد پرویش شاہین اقبال اور افغانستان

۵۔ منصف خان سحاب، صوبہ سرحد میں اقبال شناسی، مقالہ ایم فل اقبالیات، آئی او یو اسلام آباد ۱۹۹۳ء